ANALYTICAL INTERPRETATIONS OF IQBAL'S POETRY

WITH SPECIAL REFERENCE TO CRITICAL APPROACHES

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN
URDU

By

RUBEENA RAFEEQUE

Under the supervision of

PROF. SYED MOHAMMAD HASHIM

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202002 (INDIA)
2014

کلامِ اقبال کے تجزیے

(تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کے حوالے سے)

تلخیص

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

روبینہ رفیق

نگراں

پروفیسر سید محمد ہاشم

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انڈیا)

۲۰۱۴ء

تلخیص

علامہ اقبال بیسویں صدی کے ایک بلند پایہ مفکر، مصلح اور عظیم شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے بلند خیالات اور انقلابی نظریات کے اظہار کے لیے پہلے اردو اور فارسی اور بعد میں انگریزی کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم انگلینڈ اور جرمنی میں حاصل کی۔ قیامِ یوروپ نے ان کے فکری ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے وسیلے سے جو اہم تصورات و نظریات پیش کیے ان کا اثر بہت وسیع پیمانے پر ہوا۔

اقبال کا کلام ان کے عہد جوانی میں ہی شرح و تفہیم اور ترجمہ کا موضوع بن گیا تھا جس کا آغاز ۱۹۲۰ء میں پروفیسر نکلسن کے 'اسرارِ خودی' کے ترجمہ کے ساتھ ہو گیا تھا جس کا سبب یہ ہے کہ کلامِ اقبال میں سادگی و پرکاری سے معمور نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ دقیق و فلسفیانہ موضوعات پر بھی بہ کثرت نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ان کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے کلامِ اقبال کی شروح کا عمل شروع ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ان کے کلام کی شرح ان کی زندگی ہی میں کی جانے لگی تھی جس کا سلسلہ ان کے انتقال کے طویل عرصہ بعد تک بھی جاری رہا اور اس طرح متعدد شرحیں وجود میں آئیں، جن سے اقبال کے کلام کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ کلامِ اقبال کے بنیادی شارحین پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور مولانا غلام رسول مہر نے شرحیاتِ اقبال کا عظیم سرمایہ چھوڑا ہے۔ شرح نگاری سے آگے بڑھ کر کسی فن پارے کی تفہیم اور اس کی قدر و قیمت کے تعین کے لیے عہد حاضر میں جو طریقۂ کار اپنائے جا رہے ہیں، ان میں تجزیہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے چنانچہ اقبال کی مختلف نظموں اور غزلوں کا تجزیہ کر کے مختلف علماء، نقادوں اور دانش وروں نے اقبال کے فکر و فن کو مربوط اور بھرپور طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ گزشتہ تیس چالیس سال میں اس رجحان کو کافی فروغ حاصل ہوا اور اس عرصے میں اقبال کے کلام کے معیاری اور غیر معیاری تجزیوں کا

خاصا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام کلامِ اقبال کے تجزیوں کے تنقیدی مطالعے پر مبنی زیرِ نظر تحقیقی مقالہ تیار کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ تجزیے کی تعریف، حدود، اصول اور امتیازات کے بارے میں قاری کے پاس جامع معلومات موجود ہوں۔ چنانچہ اس مقالے کا باب اوّل انہی مباحث کے تحقیقی مطالعے پر مبنی ہے۔

دوسرے باب میں کلامِ اقبال کے تجزیہ نگاروں کو ان کی تصانیف و تنقیدی رویوں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرا باب مقالہ ہذا کا کلیدی اور مفصل ترین باب ہے جس میں اقبال کی اہم نظموں کے تجزیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھا باب اقبال کی اردو اور فارسی غزلیات کے تجزیوں کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ پانچویں باب میں تمام مباحث کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ اس طرح مقالہ ہذا کو درج ذیل پانچ بنیادی ابواب و مباحث میں تقسیم کیا گیا ہے:

باب اوّل: تجزیہ نگاری کا فن، تعارف، اصول اور امتیازات

باب دوم: اقبال کے اہم تجزیہ نگار اور ان کے تنقیدی رویے

باب سوم: اقبال کی اہم نظموں کے تجزیوں کا تنقیدی مطالعہ

باب چہارم: اقبال کی اہم اردو اور فارسی غزلوں کے تجزیوں کا تنقیدی مطالعہ

باب پنجم: حاصلِ کلام (محاکمہ)

مقالہ کے باب اوّل میں تجزیہ نگاری کا فن: تعارف، اصول اور امتیازات پر تحقیقی و تنقیدی گفتگو کی گئی ہے۔

تجزیے کو انگریزی میں Analysis کہا جاتا ہے، یعنی کسی فن پارے کے ایک ایک حصے، ایک ایک پہلو کو کھول کھول کر بتانا۔ تجزیے کے لغوی معنی کسی مرکب کے عناصر ترکیبی کو جدا جدا کرنا یا ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے اور تنقید کی اصطلاح میں تجزیہ کا مفہوم یہ ہے کہ فن پارے کا مطالعہ اس طور سے کیا جائے کہ فن پارے کا ہر لفظ واضح ہو جائے، الفاظ اور تراکیب کو اور ان کے معنی کو اس طرح سلجھایا جائے کہ فن پارے کی تمام مشکلات حل ہو جائیں۔ اس میں فن کار کے افکار و خیالات اور اس کے ذریعہ استعمال کردہ فنی تدابیر کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فن کار نے اپنی تخلیق میں جن خیالات کا

اظہار کیا ہے ان کے کیا محرکات تھے؟ تجزیاتی تنقید میں فن پارے کے متن اور اس کے تاریخی پس منظر کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

تجزیے کے ذریعے فن پارے کے موضوع اور فن دونوں کی اہمیت اُجاگر کی جاتی ہے، یعنی تجزیہ، یہ بتاتا ہے کہ کسی فن پارے کا موضوع کیا ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے محرکات وعوامل کیا ہیں؟ اس کے موضوع کا دائرہ کتنا وسیع ہے، اس میں کتنی گہرائی و گیرائی ہے اور اس موضوع کو جس سانچے میں پیش کیا گیا ہے وہ کس حد تک موزوں اور مناسب ہے؟ اس کی تکنیک کیسی ہے؟ اسلوب کیا ہے؟ گویا تجزیہ ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں فن پارہ اپنے ظاہری اور باطنی رنگ وروغن اور خط وخال کے ساتھ صاف صاف نظر آجاتا ہے۔ فن پارے کو سمجھنے، اس کے حسن وقبح کو پرکھنے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے تجزیہ نہایت مناسب طریقۂ کار ہے۔

تجزیہ نگاری کا یہ رجحان ۱۹۷۰ء کی دہائی سے وجود میں آیا اور اس طرح اب اردو ادب میں تجزیہ نگاری ایک اہم اور مستقل فن بن چکی ہے۔ تجزیے کا یہ فن، تفہیم کلام کا ایک واضح، تنقیدی اور استدلال سے بھرپور طریقِ کار ہے۔ مختلف علما و ناقدین کے ذریعہ بہت سی نظموں، غزلوں، افسانوں اور دیگر فن پاروں کے تجزیے کیے گئے ہیں لیکن اس کی کوئی حتمی تعریف اب تک متعین نہیں کی جاسکی ہے اور نہ ہی اس کے کچھ واضح اور متفق علیہ اصول بتائے جاسکے ہیں، بلکہ مختلف زبانوں کے ادبیات کے مطالعات کی روشنی میں متعدد تجزیہ نگاروں نے اپنے وضع کردہ یا اختیار کردہ اصولوں کی روشنی میں ادب پاروں کے تجزیے کیے ہیں۔ مقالہ نگار نے اس ضمن میں تجزیہ نگاری کی تعریف، فن اور روایت نیز دیگر تعبیراتی وتفہیماتی اصناف پر اردو میں پہلی بار واضح ومدلل طور پر کلام کیا ہے، نیز ان سبھی اصطلاحات کا فرق بھی واضح کیا ہے۔

کسی متن یا فن پارے کی تفہیم کے متعدد ذرائع ہوتے ہیں، مثلاً شرح، تبصرہ، تعبیر، تفسیر، تفہیم اور تنقید وغیرہ۔ شاعر، شعر میں فکر وتخیل کے کچھ گوشے ارادتاً پوشیدہ رکھتا ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فن پارے میں پیش کردہ افکار وخیالات اور احساسات وجذبات کے ساتھ ساتھ تجزیہ نگار کی کوشش کے ذریعے اس کے حسن کو پوری طرح بے نقاب کیا جاسکے اور اس کے تمام رموز وعلائم سے واقفیت بہم پہنچائی جاسکے۔ تجزیہ، تشریح کے سلسلے کی توسیعی لیکن فنی وتکنیکی شکل ہے، تشریح وتجزیہ میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ

تشریح میں شرح نگار، فن کار کی تخلیق کی تشریح اور وضاحت کرتا ہے، لیکن اس کو اس کے نتائج سے کوئی غرض نہیں ہوتی جب کہ تجزیے میں تجزیہ نگار اپنی بحث سے ایک نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی تشریح سے معنی و مطالب کی وضاحت تو ہوسکتی ہے لیکن اس کے درجے اور مرتبے کا تعین نہیں ہوسکتا۔ یہی فرق تجزیہ اور دوسرے تفہیمی ذرائع میں ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ فن تجزیہ کے متعلق ان تمام مباحث کو اس باب میں پوری طرح سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرا باب کلامِ اقبال کے اہم تجزیہ نگاروں سے متعلق ہے، اس میں ان حضرات کی شخصیت، علمی بصیرت اور اقبال کے تجزیہ نگار کی حیثیت سے ان کے مجموعی کارناموں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

اقبال کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی حیات و شاعری اور افکار و نظریات پر دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں تحقیقات و توضیحات اور تراجم و تشریحات کا سلسلہ ان ہی کے زمانے میں شروع ہوگیا تھا جو بعد میں وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اتنے کم عرصے میں اقبال کے علاوہ اردو کی کسی دوسری شخصیت پر تصانیف و مقالات کی شکل میں اتنا زبردست ادبی سرمایہ وجود میں نہیں آسکا، جس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے تصورات و نظریات اور اپنے غیر معمولی شعری کارناموں کے سبب اہلِ فکر و نظر اور ناقدینِ فن کو اپنے مطالعے کی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ محض اردو ہی میں نہیں بلکہ فارسی میں بھی اقبال شناسی کا پورا دبستان قائم ہوگیا۔ برصغیر ہندو پاک میں تو اقبال شناسوں کی بڑی تعداد ہے ہی، لیکن دیگر ممالک کے مشرقی و مغربی اسکالرز نے بھی اقبال شناسی میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں، اور ان کی تفہیم و تعبیر میں بڑی دقتِ نظر کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے سوانحی حالات، فلسفیانہ خیالات اور فکری سرچشموں پر توجہ صَرف کی ہے۔ غیر ملکی زبانوں میں بھی اقبال کے فکر و فن پر مغربی مفکرین اور دیگر متعدد اسکالرز نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان میں 'نکلسن' سے لے کر 'انا مری شمل' تک مغربی قدر شناسوں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے کلامِ اقبال اور فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کر کے اقبال شناسی کا حلقہ وسیع تر کر دیا۔

کلامِ اقبال کے شارحین میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، غلام رسول مہر، حمید یزدانی، اکبر حسین قریشی، عابد علی عابد، نسیم امروہوی وغیرہ شامل ہیں، جن کے کارناموں کی تفصیل متعلقہ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔

اقبال کے تجزیہ نگاروں کی تعداد بھی کافی ہے لیکن ان میں سے بیشتر نے باقاعدہ طور پر اور سنجیدگی کے ساتھ اس طرف توجہ نہیں کی ہے، بلکہ اقبال کی ادبی شخصیت سے متعلق اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہوئے اور تنقیدی گفتگو کرتے ہوئے ضمناً ایک دو نظموں کا تجزیہ کر دیا ہے۔ جن نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے باقاعدہ طور پر تجزیے کے فن کا لحاظ رکھتے ہوئے اقبال کی نظموں اور غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے ان میں اسلوب احمد انصاری، عبدالمغنی، رفیع الدین ہاشمی، نورالحسن نقوی، سید محمد ہاشم وغیرہ مؤخر الذکر حضرات کی فہرست میں شامل ہیں، جب کہ آل احمد سرور، وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، حامدی کاشمیری، صدیق جاوید، سید وقار عظیم، عابد علی عابد، مسعود حسین خاں، جابر علی سید، مغنی تبسم، سید ابوالحسن علی ندوی اور بدیع الزماں وغیرہ اوّل الذکر فہرست میں شامل ہیں جنھوں نے اقبال کے فکر و فن پر باقاعدہ تصانیف پیش کی ہیں اور اسی کے ساتھ اقبال کی نظموں میں سے صرف دو چار نظموں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ محمد بدیع الزماں اور سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) نے اپنی تصانیف میں کلامِ اقبال کو قرآنی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کی بنیادی شناخت ان کے فکر و فلسفہ کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری اور بالخصوص نظم نگاری سے قائم ہوتی ہے۔ انھوں نے جس وقت میدانِ شاعری میں قدم رکھا، اردو نظم اس وقت اپنے عہد شباب کو پہنچ رہی تھی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں ان کی فکری و فنی کاوشوں اور بین الاقوامی موضوعات کی شمولیت نے ان کی شاعری میں آفاقیت کے عناصر شامل کر دیے۔ اقبال کے فن کا انتہائی حسین اور خصوصی پہلو، ان کے کلام کا صوتی آہنگ یا اس میں غنائیت کے ہمہ جہت عناصر کی موجودگی ہے جس سے ان کے کلام میں محض فلسفہ ہی نہیں بلکہ فلسفے کی پیش کش میں بھی فی دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔

مقالے کا کلیدی حصہ اس کا تیسرا اور چوتھا باب ہے، جو کلامِ اقبال کے تجزیوں پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقبال کی اہم اور نمائندہ نظموں کے تجزیوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان نظموں میں مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق، خضرِ راہ، ساقی نامہ، شعاعِ امید اور جبریل و ابلیس وغیرہ شامل ہیں: اسلوب احمد انصاری، رفیع الدین ہاشمی، عبدالمغنی، سید محمد ہاشم اور بعض دیگر حضرات نے، جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، تجزیے بہت دقتِ نظر سے کیے ہیں۔ ان تمام تجزیوں کے

مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہم اور ممتاز تجزیے وہی ہیں جن میں تجزیے کے ساتھ ساتھ مصنف کی زبان و بیان، صنعت، استعارے، علامات اور فنی تدابیر کی نشان دہی بھی کی گئی ہو۔

مقالے کا چوتھا باب ''اقبال کی اردو اور فارسی غزلیات کے تجزیوں'' سے متعلق ہے۔ اقبال نے اپنی غزل کے توسط سے اردو شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا۔ جو اسالیب اور موضوعات اپنی شاعری اور غزل میں اقبال نے استعمال و اختیار کیے وہ ان سے پہلے کی اردو شاعری میں بہت کم نظر آتے ہیں اور بعد کے شعرا نے ان میں سے بہت سی چیزیں اقبال ہی سے لی ہیں۔ اقبال کی غزل کا لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ بالکل منفرد ہے جس کی اردو غزل میں نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنے فلسفیانہ افکار و تصورات کو غزل کی عظیم روایات کے سہارے اس خوبی سے نمایاں کیا ہے کہ خود غزل کو ایک نیا اسلوب، ایک نیا رنگ ڈھنگ اور ایک نیا لب و لہجہ میسر آ گیا۔ انھوں نے روایتی ہیئت میں رہتے ہوئے اردو غزل کو انقلابی رجحان عطا کیا۔ بانگِ درا کی متعدد غزلیں اور بالِ جبریل کی تقریباً نصف حصے پر مبنی غزلیں ایسی ہیں کہ ان میں پیش کردہ افکار و نظریات کے ساتھ ساتھ زبان، طرزِ اظہار اور فنی ہنرمندیوں کے سبب متعدد نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے ان کے تجزیے کیے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے جس طرح نظموں کے تجزیے کیے ہیں اسی طرح غزلوں کو بھی تجزیاتی عمل سے گزارا ہے۔ ابتدا میں یہ تجزیے ان کے رسالے ''نقد و نظر'' میں شائع ہوتے تھے، بعد میں انھوں نے ان تمام تجزیوں کو اپنی کتاب ''غزل تنقید'' میں شامل کر دیا۔ یہ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی، پہلے حصے میں اقبال کے علاوہ دوسرے شعرا کی غزلیں ہیں اور حصہ دوم کی ابتدا میں اقبال کی غزلوں سے متعلق مختصراً اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اقبال کی غزلوں کے تجزیے شامل کیے ہیں، جن میں ابتدائی دس تجزیے خود اسلوب صاحب کے ہیں۔ اس کے بعد تین تجزیے زیڈ۔ اے۔ عثمانی صاحب کے، تین تجزیے سید وقار حسین صاحب کے، ایک تجزیہ قاضی افضال حسین صاحب کا، ایک انور صدیقی اور آخری تجزیہ اقبال احمد انصاری نے پیش کیا ہے۔

چوتھے باب میں اقبال کی فارسی غزلوں کا بھی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یوروپ میں اقبال کے کلام میں جو اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انھوں نے فارسی زبان کو اپنے شعری اظہار کے لیے استعمال کیا۔ فارسی شعرا میں انھوں نے مولانا روم کو اپنا پیر و مرشد اور روحانی رہنما تسلیم کیا۔

مولانا روم کے بعد اقبال نے فارسی کے جن شعرا کو کم وبیش یکساں حد تک سراہا ہے، وہ مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا غالب اور حکیم سنائی غزنوی ہیں۔

اقبال کی فارسی غزل، ان کی شخصیت اور فلسفہ وفن کی مکمل آئینہ دار ہے۔ ان کی فارسی غزلیں بہت زوردار اور فنی خوبیوں سے مزین ہیں۔ علامہ کی فارسی شاعری کو اس لحاظ سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے نظامِ فکر کو اس شیریں زبان میں زیادہ مرتب، مبسوط اور جامع انداز میں پیش کیا ہے اور فن کے اعتبار سے بھی جو تنوع ان کے فارسی کلام میں نظر آتا ہے، اردو اس سے ایک حد تک محروم ہے۔ علامہ کا فارسی کلام نہ صرف ان کے فلسفۂ حیات کی مکمل تفسیر ہے، بلکہ ان کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کی بھی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ بین الاقوامی سطح پر اقبال کا تعارف ان کی فارسی شاعری ہی کے ذریعے ہوا ہے۔

آخری باب کے طور پر حاصلِ کلام اور محاکمہ کے تحت گزشتہ ابواب کے تمام مباحث کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے اوّلاً اردو میں تجزیہ نگاری کی تعریف، تعارف، اصول، فنی خصوصیات، افادیت دوسری تفہیماتی اقسام کا جائزہ لیا ہے جو اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی مربوط کوشش ہے۔ اس کے بعد کے ابواب میں تجزیہ نگاروں کا تنقیدی تعارف اور اقبال کی نظموں اور غزلوں کے تجزیوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ ابواب کے مباحث کی تلخیص یا تکرار پیش کر کے اس باب کو ضخیم وطویل بنانے کے بجائے چند کلیدی باتیں کہہ دی جائیں اور ان امکانات کو روشن کیا جائے جن کے تحت اقبال کی دیگر اہم (فنی خصوصیات ومحاسن سے معمور) نظموں اور غزلوں کے تجزیے کرنے اور ان کے نتائج پیش کرنے کی طرف دیگر اہلِ علم وقلم کو رغبت ہو۔ جس کے نتیجے میں اقبال کی مکمل اور ہمہ جہت تفہیم کے امکانات روشن ہوسکیں اور عہدِ حاضر اور مستقبل میں اقبال کی فکری وفنی معنویت اور قدر وقیمت متعین ہونے میں مدد مل سکے۔ اس مقصد میں کچھ بھی کامیابی ہوجاتی ہے تو زیرِ نظر تحقیقی مقالے کی افادیت مزید واضح ہوسکے گی۔

○○○

Maulana Azad Library
Acc. No. T-8884
Aligarh Muslim University

ANALYTICAL INTERPRETATIONS OF IQBAL'S POETRY

WITH SPECIAL REFERENCE TO CRITICAL APPROACHES

ABSTRACT

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN
URDU

By

RUBEENA RAFEEQUE

Under the supervision of

PROF. SYED MOHAMMAD HASHIM

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202002 (INDIA)
2014

کلامِ اقبال کے تجزیے

(تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کے حوالے سے)

مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

روبینہ رفیق

نگراں

پروفیسر سید محمد ہاشم

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انڈیا)

۲۰۱۴ء

Maulana Azad Library
Acc. No. T-8884
Aligarh Muslim University Aligarh

074114

T8884

Centre of Advanced Study
Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002

سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی
شعبۂ اردو،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Date 10-01-2014

CERTIFICATE

This is to certify that the Ph.D thesis entitled " ***Kalam-e-Iqbal Ke Tajzyee (Tajzya Nigaron Ke Tanqeedi Rawaiyon Ke Hawale Se)*** *" is being submitted by* ***Ms. Rubeena Rafeeque.*** *This is an original research work and it has not been submitted to any other University for any degree.*

This thesis is forwarded for the first time for the award of Ph.D. degree in Urdu.

Counter Signature

(Prof. Aqeel Ahmad)
Chairman

(Prof. Syed Mohd. Hashim)
Supervisor

بسم الله الرحمن الرحيم

مندرجات

○ **مقدمہ** VI

○ **باب اوّل:**

تجزیہ نگاری کا فن: تعارف، اصول اور امتیازات ۱

○ **باب دوم:**

کلامِ اقبال کے اہم تجزیہ نگار اور ان کے تنقیدی رویے ۳۲

○ **باب سوم:**

اقبال کی اہم نظموں کے تجزیوں کا تنقیدی مطالعہ ۱۰۵

(تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کے حوالے سے)

○ **باب چہارم:**

اقبال کی اہم اردو اور فارسی غزلوں کے تجزیوں کا تنقیدی مطالعہ ۱۸۴

○ **باب پنجم:**

حاصلِ کلام (محاکمہ) ۲۴۸

○ **کتابیات:** ۲۶۰

●●●

انتساب

والدِ محترم جناب **رفیق احمد** صاحب (مرحوم)

جو اگرچہ اب اس دنیا میں نہیں،
مگر میرے دل کی دنیا میں موجود ہیں

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
(اقبالؔ)

اور

محترمہ **والدہ** صاحبہ کے نام

مقدمه

مقدمہ

علامہ اقبال کا شمار اردو کے چند نمائندہ ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے دانش ورانہ اندازِ فکر اور فن کارانہ لب و لہجے نے بیسویں صدی کے اردو شعرا میں انھیں مثالی عظمت عطا کی ہے۔ تخیل کی نیرنگی و ندرت، فکر و فن کی عظمت اور زبان و اسلوب پر غیر معمولی قدرت و مہارت ان کے مسلّمہ امتیازات میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افکار و نظریات کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پورے فنی کمال کے ساتھ پیش کیا۔ حیات و کائنات کے اکثر مظاہر و مسائل کو اقبال کی فکر نے حیطۂ اظہار میں لیا اور اس کو کچھ اس طور پر پیش کیا کہ ان کا نام نہ صرف اردو میں بلکہ شاعری کے عالمی جریدہ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔ اقبال کی شاعری کے طلوع کے وقت اردو نظمِ جدید کی عمر بیس پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی اس پر براہِ راست اور بالواسطہ دونوں سطح پر مغربی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اس دور تک اردو نظم کے جو موضوعات مروّج ہو چکے تھے ان میں مناظر قدرت، مظاہر فطرت، حب الوطنی، انسانی ہمدردی اور بچوں سے متعلق موضوعات کو اقبال نے اختیار کیا اور نظم کی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ بعض جگہ اپنی ذہانت اور غیر معمولی مطالعے کے سبب اس میں فکر و فن کے اعتبار سے نئے اضافے بھی کیے۔ وقت گزرنے اور مطالعے کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس میں انفرادیت بھی پیدا ہوتی گئی۔ اقبال کے یہاں بیسویں صدی کے بالکل آغاز ہی میں فکری اور فلسفیانہ عناصر بھی نظر آنے لگے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ جانے کے بعد اور وہاں تحقیقی مطالعے کے دوران اقبال پر علوم و معارف کے کچھ نئے اسرار منکشف ہوئے جس میں مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کے اسباب میں حرکت و عمل اور جد و جہد سے کنارہ کشی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور دوسرا بڑا سبب اسلامی تصوف میں غیر اسلامی عناصر کی شمولیت تھی اور تصوف اس دور کا عام رجحان تھا۔ ظاہر ہے جب عمارت کی بنیاد ہی کمزور ہو گی تو عمارت کے مستقبل کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اقبال پر اس مطالعے کا شدید اثر ہوا اور وہ مسلمانوں کو اس پستی سے نکالنے کی فکر میں منہمک ہو گئے، اس کے لیے انھوں نے یورپ

سے واپسی کے بعد ہی سے نظمیں لکھنا شروع کردی تھیں۔ چنانچہ جب ان کی شعری کاوشوں کی عمر صرف پچیس سال تھی تب ایک انگریز دانش ور پروفیسر نکلسن نے ان کے افکار عالیہ اور مشہور و منفرد نظریات اور ان کی شاعرانہ پیش کش پر قلم اُٹھایا اور 'اسرارِ خودی' کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ اس کے بعد پیامِ مشرق، بانگِ درا، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز جیسی بلند پایہ فکری و فنی کاوشیں وجود میں آتی رہیں اور ان پر نقد و نظر کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔

اقبال اردو کے ان ممتاز ترین شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی زندگی میں ہی ان سے متعلق کافی تنقیدی سرمایہ وجود میں آچکا تھا جس میں ان کے شعری وسائل کے استعمال سے معمور، بصیرت انگیز فکری و فنی کارناموں کو زیر بحث لایا گیا تھا۔ ان کے انتقال یعنی ۱۹۳۸ء کے بعد دو تین سال کی جذباتی و تعزیتی تحریروں کے بادل چھٹنے کے بعد ان کی سیرت و سوانح سے آگے بڑھ کر مختلف انداز سے ان کی شرح اور تفہیمِ شعر کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا غلام رسول مہر اور خواجہ حمید یزدانی کا شمار اقبال کے اہم ترین شارحین میں ہوتا ہے اس کے بعد اقبال کی مختلف نظموں اور غزلوں کے تجزیے لکھنے کا رجحان شروع ہوا۔ مختلف علما، نقادوں اور دانش وروں نے اقبال کے فکر و فن کو مربوط اور بھرپور طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ گزشتہ تیس چالیس سال میں اس رجحان کو کافی فروغ حاصل ہوا اور اس عرصے میں اقبال کے کلام کے معیاری اور غیر معیاری تجزیوں کا خاصا بڑا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ البتہ کلامِ اقبال کے سنجیدہ اور صاحبِ نظر تجزیہ نگاروں نے ان کے تجزیے بڑی تنقیدی مہارت سے کیے ہیں جن سے ان تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں پر بھی واضح روشنی پڑتی ہے، اسی کے پیش نظر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے کلامِ اقبال کے تجزیوں کے اس سرمایے کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے تحقیقی مقالہ لکھوانے کا پروگرام بنایا اور اس موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے کی ذمہ داری ماہرِ اقبالیات اور مشہور محقق پروفیسر سید محمد ہاشم کی نگرانی میں مجھ ناچیز کے سپرد کی گئی۔ میرے اس مقالے کا موضوع ہے ''کلامِ اقبال کے تجزیے (تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کے حوالے سے)'' مناسب ہوگا کہ ہم یہاں زیرِ نظر تحقیقی مقالے کی حدود کا ایک سرسری تعارف پیش کردیں۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا باب تجزیہ نگاری کی تعریف اور فن سے متعلق ہے اسے چند حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تجزیہ نگاری کا فن: تعارف، اصول اور امتیازات۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تجزیہ نگاری کی اب تک نہ کوئی جامع اور مستند تعریف ہے اور نہ اس کے کوئی باضابطہ اصول متعین کیے گئے ہیں، اس لیے مقالہ ہذا کے باب اوّل میں تجزیے کی لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کرنے اور تجزیہ نگاروں کے تجزیوں کی روشنی میں اس کے اصول متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخر میں تجزیہ اور شرح کے مابین فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں تبصرہ، تفہیم، تفسیر اور تنقید پر بھی سرسری سی گفتگو کی گئی ہے۔

اس مقالے کا دوسرا باب کلامِ اقبال کے اہم تجزیہ نگار اور ان کے تنقیدی رویوں سے متعلق ہے۔ اس میں ان کے مختصر سوانحی حالات، تنقیدی کارناموں، تنقیدی رویوں اور اقبالیات سے متعلق ان کی کاوشوں سے بحث کی گئی ہے۔ اگرچہ مختلف نقادوں اور ادیبوں نے کلامِ اقبال پر اپنے مضامین و مقالات اور کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے ان کی فکر کے علاوہ فن پر بھی بہت کچھ لکھا ہے، لیکن جن ماہرینِ اقبالیات نے اقبال کی فکر و فن پر گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کی متعدد نظموں اور غزلوں کے تجزیے بھی کیے ہیں، اس باب میں انہی تجزیہ نگاروں کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ہے ''اقبال کی اہم نظموں کے تجزیوں کا تنقیدی مطالعہ'' (تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کے حوالے سے)۔ اس میں اقبال کی چند طویل و مختصر نظموں مثلاً ذوق و شوق، مسجدِ قرطبہ، خضرِ راہ، ساقی نامہ، شعاعِ امید اور جبریل و ابلیس وغیرہ کے تجزیوں کا مطالعہ ان کے تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیرِ نظر مقالہ کا چوتھا باب ''اقبال کی اردو اور فارسی غزلوں کے تجزیاتی مطالعے'' سے متعلق ہے۔ اس میں بھی تجزیہ نگاروں کی تنقیدی آرا اور بیانات کے حوالے سے اقبال کی غزلوں کے تجزیوں پر کلام کیا گیا ہے۔

پانچواں اور آخری باب ''حاصلِ کلام اور محاکمہ'' ہے۔ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ ابواب کے سارے مباحث کا ایک اجمالی خاکہ سامنے لے آیا جائے۔ حاصلِ کلام کے طور پر اس تحقیقی مقالے کے مندرجات کا جواز پیش کر کے اس کے ابواب کے مباحث کی اہمیت اور قدر و قیمت بیان کی گئی ہے۔

کتابیات کے تحت صرف ان ہی کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے جن سے براہِ راست اور بے حد ضروری استفادہ کیا گیا ہے۔ مطالعہ کے دوران مولانا آزاد لائبریری، شعبۂ اردو کی سیمینار لائبریری کی کتابوں، مستعار کتابوں اور ذاتی کتب سے بھی، جن کی فہرست خاصی طویل ہے، پورا فائدہ اُٹھایا گیا ہے، لیکن موضوع سے براہِ راست متعلق نہ ہونے کے سبب ان کے تذکرہ سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔

یہاں اس بات کے اظہار میں مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ زیرِ نظر مقالہ اس موضوع پر غالباً پہلی مربوط کوشش ہے اور امید ہے کہ اقبالیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ کوشش مفید بھی ثابت ہوگی اور آئندہ اسکالرز کو اس موضوع پر کام کرنے کا حوصلہ بھی عطا کرے گی۔

مقالے کے مواد کی فراہمی کے لیے مجھے علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری سے استفادے کے علاوہ رام پور کی رضا لائبریری اور کشمیر یونیورسٹی کے ''اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی'' کا بھی سفر کرنا پڑا اور ضروری مواد سے استفادے کا موقع ملا۔

اپنی تحقیقی کاوش سے متعلق مسائل کے بیان اور اس کے مختلف ابواب میں اٹھنے والے مباحث کا ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے اپنے مالکِ حقیقی اور رب کریم کی شکر گزار ہوں کہ اس کی مہربانی اور کرم سے یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے، اس کی ترتیب و تدوین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے علم پرور ماحول اور ادبی فضا میں ہوئی اس لیے یہ گفتگو نامکمل رہے گی اگر ان بزرگوں اور کرم فرماؤں کا ذکر نہ کروں جن کی ہمدردی، خلوص و محبت اور عنایت نے مجھے قدم قدم پر حوصلہ بخشا۔ سب سے پہلے میں استاد محترم، ماہر اقبالیات پروفیسر سید محمد ہاشم صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں، جن کی رہنمائی میں، مقالے کے آغاز سے انجام تک میں نے تمام مشکل مراحل طے کیے۔ موصوف، مواد کی فراہمی کے بالکل ابتدائی وقت سے لے کر مقالے کی ساخت، اس کے متن، زبان و بیان اور مقالہ لکھنے کے تمام رموز و نکات بڑی شفقت و محبت کے ساتھ مجھے سمجھاتے رہے۔ دن رات لگ کر بہت محنت اور دیدہ ریزی سے ایک ایک جملے اور ایک ایک لفظ و ترکیب کے استعمال میں میری رہنمائی فرمائی اور اس سلسلے میں نہایت قیمتی معلومات فراہم کیں، اپنے محققانہ مزاج کے سبب موضوع و مقالے کی تمام جزئیات پر ہر لمحہ آں موصوف کی گہری نظر رہی اگر آپ کی یہ خصوصی توجہات میرے ساتھ شامل نہ ہوتیں تو یہ مقالہ اس شکل میں ہرگز وجود میں نہیں آسکتا تھا۔ میں ان کی

خدمت میں صمیم قلب سے ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہوں۔ شعبۂ اردو کے دیگر اساتذۂ کرام نے بھی وقتاً فوقتاً اپنے نیک اور عالمانہ مشوروں سے مستفید کیا اس سلسلے میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر عقیل احمد، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی اور ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب وغیرہ نے میری علمی اعانت اور کتابوں کی فراہمی میں مدد فرمائی۔ علمی و تحقیقی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اساتذہ کے بعد لائبریری کے ذمہ داروں کا تعاون سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ کتابوں کی فراہمی میں مولانا آزاد لائبریری کے کارکنانِ خصوصاً محسن بھائی، باقر بھائی اور جاوید بھائی کے نام سرفہرست ہیں۔ اسی طرح اپنے شعبہ کی سمینار لائبریری کے ندیم بھائی اور شعبہ کے دفتر کے سبھی اراکین کا مجھے ہمیشہ تعاون حاصل رہا۔ شاہد بھائی نے بہت توجہ اور لگن کے ساتھ اس مقالے کو کمپوزنگ کے مراحل سے گزارا۔

میرے سینئر، رفیع الدین بھائی، شہاب الدین بھائی، فرحت زہرا آپا، سمیہ آپا، قمر آپا اور شعبہ کے دیگر تحقیق کاروں مثلاً زینب رقیہ، زیبا آپا، نازمین آپا، ثنا، شمشاد، عقیل احمد، ابوالعاص بھائی کا بھی وقتاً فوقتاً تعاون حاصل رہا۔ اس کے علاوہ بھی جن جن حضرات نے تحقیقی کام کے دوران میری مدد کی، میں فرداً فرداً سبھی کی شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد ان ہستیوں کا تذکرہ کرنا ہے، جن کے لیے شکریہ کے الفاظ قطعاً بے معنی ہیں، جو، ہر لمحہ اپنے دھڑکتے دل اور سانسوں کی رفتار کے ساتھ میری صحت، ترقی اور کامیابی کے لیے فکر مند اور بارگاہِ ایزدی میں دست بہ دعا رہتے ہیں ان میں میری والدہ محترمہ سرفہرست ہیں جنھوں نے میرے والد مرحوم کی محبت سے محرومی کا، اپنی بے انتہا محبت اور ہمہ وقت شفقت کے نتیجے میں احساس نہیں ہونے دیا۔ ایسی پیاری والدہ کا تصور اور خیال ہی میری ہمت و حوصلہ کو مہمیز کرتا رہا ہے۔ ان کی یاد کی خوشبو سے میری آنکھیں نم رہتی ہیں اور دل ان کی صحت و سکون اور درازیٔ عمر کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتا ہے۔ اپنی بہن غزالہ جنھوں نے مجھے پی ایچ۔ ڈی کے داخلے کی طرف رغبت دلائی اسی کے ساتھ میرے سبھی بھائی، بھابھیاں جو میرے لیے نیک آرزو رکھتے ہیں اور میری خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ چھوٹی بہنیں راشدہ، ساجدہ اور چھوٹا بھائی اسجد جنھوں نے تحقیقی مراحل کے مشکل وقت میں میری نہ صرف معاونت کی بلکہ ہر طرح سے میری

حوصلہ افزائی کی، میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں، اپنے رفیقِ سفر اور زندگی کی انتہائی عزیز ہستی، میرے سرتاج محمد اکرم صاحب جنھوں نے میرے لیے حصولِ علم کو ممکن بنایا اور ہر طرح کی ذمہ داریوں سے آزاد رکھ کر تحقیق کے لیے مطلوبہ یکسوئی عطا کی، ان کی تہہِ دل سے ممنون و مشکور ہوں نیز یہ کہ انھوں نے زندگی کے اس نازک موڑ پر جس طرح اپنی بلند حوصلگی کا ثبوت دیا، ان کے شکریہ کے لیے شاید مجھے موزوں الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ میں اپنے پیارے ساس، سسر (خالہ، خالو) کی بھی بے حد ممنون کرم ہوں جنھوں نے خود تکلیف و پریشانی اُٹھا کر مجھے گھر کی ذمہ داریوں سے بے نیاز کر دیا۔ ساتھ ہی اپنے معصوم بچّے عبدالرحمٰن کے لیے بھی جذبات میں تشکر کی آمیزش پاتی ہوں کہ جس کی معصوم مسکراہٹ اور مفرح قلب شرارتوں نے مقالے کی تیاری میں درپیش مسائل میں بھی ذہنی تازگی اور فرحت و انبساط کا سامان مہیا کیا۔

روبینہ رفیق

○○○

ادب، انسانی زندگی اور اس کے معیار کو پہچاننے اور پرکھنے کا ایک وسیلہ اور اس کی عمدگی و تزئین کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمارا ذہنی افق وسیع ہوتا ہے اور یہ ہمارے احساس کو بیدار کر کے سوچنے اور سمجھنے کی نئی جہت عطا کرتا ہے۔ انسانی ذہن مختلف خیالات کا منبع و سرچشمہ ہوتا ہے جنھیں انسان اپنی زبان و بیان کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ظاہر کرتا رہتا ہے۔ اگر چہ اپنے مطلب و مقصد کا اظہار مخصوص اشاروں، نقاشی و مصوری اور دیگر انسانی حرکات و سکنات کے ذریعہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مافی الضمیر کی ادائیگی کا سب سے مؤثر ذریعہ نطق یا گویائی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قوتِ گویائی ہی انسان اور حیوان کے درمیان باعث امتیاز ہے۔

غیر معمولی حالات سے قطع نظر عموماً زبان اور شعور کا ایک ساتھ ارتقا ہوتا ہے اسی طرح زبان اور شعور دونوں کی رفتار بھی عموماً ایک ہوتی ہے البتہ کبھی کبھی شعور کی وجہ سے زبان میں ترقی اور بہتری بھی آ جاتی ہے۔ ایک سمجھ دار انسان کے بات کہنے کے طریقے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ایک طریقہ وہ ہوتا ہے، جس میں سیدھے اور سپاٹ لہجے میں بغیر کسی وسیلہ کے وہ اظہارِ خیال کرتا ہے، اس میں ترسیلی قوت تو ضرور ہوتی ہے، مگر ندرت اور حظ کا پہلو مفقود ہوتا ہے۔ یعنی اس میں کیف و سرور، طرب و نشاط اور حزن و ملال کے متاثر کن اظہار کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔ دوسرا طریقہ وہ ہے، جس میں بات تو ایک ہی ہوتی ہے لیکن کہنے والا اپنی قوتِ متخیلہ کا استعمال کر کے خوب صورت و دل کش پیرایۂ اظہار کے ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات اور تخیلات و تصورات کو پیش کرتا ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جو زبان کو نئی وسعتوں سے آشنا و ہم کنار کرتا ہے اور یہ ایک اچھے ادب کی پہلی منزل بن جاتا ہے۔ ہندوستان ہی نہیں، پوری دنیا کی زبانوں میں ادب اسی طرح وجود پذیر ہوا ہے۔ یہ ادب مختلف رنگوں، شکلوں، ہیئتوں اور اصناف و اسالیب میں پایا جاتا ہے۔ موٹے طور پر اسے دو قسموں یعنی نثر اور شاعری میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان دونوں اقسام کی ذیلی قسمیں بھی ہیں، چوں کہ ہمارا دائرۂ کار اردو ادب تک محدود ہے، اسی لیے فی الوقت اس کی نثری و شعری اصناف کے بارے میں محض چند باتیں عرض کی جائیں گی۔

اردو نثر میں داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ، سوانح، خاکہ، رپورتاژ اور تنقید و تحقیق کا پورا سرمایہ موجود ہے، جب کہ شاعری میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور دوسری شعری اصناف اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ نثر میں سب سے پہلے 'داستانی ادب' کو عروج حاصل ہوا۔ ابتدا میں داستانیں، زبانی سنائی جاتی تھیں جن کا سلسلہ مہینوں تک جاری رہتا تھا لیکن بعد میں انھیں بھی تحریری شکل میں پیش کیا جانے لگا۔ داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر کی آمیزش ہوتی تھی مثلاً دیو، جن، پَری وغیرہ۔ ان داستانوں میں ایک ارتقائی شان بھی نظر آتی ہے۔ داستان بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے، اس میں کہانی کے پیرایے میں مثالی ہیرو اور اس کے ساتھیوں کے کارنامے، رزم و بزم اور حسن و عشق کی باتیں اور عقل کو حیران کر دینے والے واقعات طول بیانی کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ داستانوں میں معاشرت کی عکاسی کے نمونے بھی بڑے پیمانے پر نظر آتے ہیں۔ اردو کی زیادہ تر داستانیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں اور بہت سی داستانیں صرف اردو ہی میں لکھی گئی ہیں۔ اردو کی مشہور داستانوں میں باعتبار زمانہ، وجہی کی 'سب رس' سرفہرست ہے۔ شمالی ہند میں ابتدا میں جو قصے لکھے گئے ان میں 'مہر افروز و دلبر'، 'نوطرزِ مرصع'، 'عجائب القصص' وغیرہ کو اوّلیت حاصل ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی داستانوں میں باغ و بہار، طوطا کہانی، آرائشِ محفل، گلِ مغفرت، بیتال پچیسی اور داستانِ امیر حمزہ جیسی دہائیوں اہم داستانیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا، چنانچہ انیسویں صدی میں رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب، موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے داستان گوئی اور لکھنوی طرزِ نگارش کا عمدہ اور کامیاب نمونہ بن کر سامنے آئی۔ صنعتی انقلاب اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات کے بعد اردو میں داستانوں کا دور ختم ہو گیا اور افسانوی ادب میں زمینی حقیقتوں پر مبنی ناول وجود میں آیا۔ ناول کی کہانی اور اس کے کردار داستان کے برعکس حقیقی زندگی سے قریب ہوتے ہیں۔

مختصر افسانہ بھی انسان کے پاس وقت کی تنگی، لیکن کہانی سننے اور پڑھنے کے شوق اور نئے دور کے حالات و تقاضوں کے تحت وجود میں آیا۔ اس کے پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری، وحدتِ تاثر جیسی اہم خصوصیات و عناصر نے ادبی ذوق کو جلا بخشنے اور ادب کا حلقہ مضاعف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ افسانہ ایسی صنف ہے جو دلچسپ بھی ہے اور مختصر ترین بھی۔ اسے ایک ہی نشست یعنی عموماً پندرہ سے بیس منٹ میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم،

علی عباس حسینی، کرشن چندر، منٹو، بیدی، اُپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام اہم ہیں۔اس کے علاوہ دیگر نثری اصناف میں ڈرامہ، انشائیہ، سفرنامے، طنز ومزاح کو بھی خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔تمام ادبیات کی روایات کے مطابق اردو میں بھی شعری اصناف نثر سے پہلے وجود میں آئیں۔ چنانچہ غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور نظم وغیرہ اصناف میں شعرا نے اپنے فکری لہجے کے مطابق ادبی وفنی ہنرمندیوں کا مظاہرہ کر کے اردو ادب میں بہت بڑا اور قابلِ فخر ذخیرہ جمع کر دیا۔ان تمام اصناف کی ہیئت، موضوع، اسلوب بیان اور طرزِ ادا میں شعرا نے اپنی اسی انفرادیت وامتیاز کا ثبوت دیا ہے۔ان کے علاوہ اردو میں تنقیدی ادب بھی اپنی اہمیت ووقعت کے اعتبار سے قابلِ فخر حیثیت رکھتا ہے۔اردو کا قدیم تنقیدی سرمایہ، بیشتر شعرائے اردو کے تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ تذکروں میں تنقید کا انداز بہت مختصر اور تاثراتی ہوتا ہے۔اس لیے جدید تنقید میں اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی جب کہ اردو میں اس کا باقاعدہ آغاز حالؔی سے ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں ان کی مشہور تصنیف ''مقدمہ شعر وشاعری'' بہت اہم ہے۔اپنے اسی مقدمے میں انھوں نے شعر وادب کے پرکھنے کے کچھ اصول بتائے ہیں، ان کی روشنی میں اردو کی چند اہم شعری اصناف کو پرکھا ہے۔ بہ طورِ خاص انھوں نے غزل پر سخت تنقید کی ہے اور اس کے سلسلے میں کچھ اصلاحات بھی پیش کی ہیں۔اردو کے دوسرے بہت اہم اور بنیادی نقاد علامہ شبلؔی ہیں۔ان کے تنقیدی نظریات کی وضاحت ''شعر العجم'' اور ''موازنۂ انیس ودبیر'' سے ہوتی ہے۔ شبلؔی اردو کے جمالیاتی نقاد ہیں اور تنقید کو رومانی رنگ وآہنگ سے آشنا کرنے کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔ اس لیے انھیں پہلا باقاعدہ تاثراتی نقاد بھی کہا جاتا ہے۔

'مولانا محمد حسین آزاد' نے تذکروں سے آگے بڑھ کر اردو میں تاریخ ادب لکھنے کا آغاز کیا اور اس موضوع پر بہت اہم کتاب ''آبِ حیات'' لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی اور یہ اردو تنقید میں تذکروں اور مقدمۂ شعر وشاعری کے درمیان کی ارتقائی کڑی قرار پائی۔اس میں شعرا کے حالاتِ زندگی اور بعض دیگر امور کے علاوہ آزاد نے شعرا کے کلام پر نسبتاً تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔اس کتاب کے تحقیقی پہلو پر محققین نے اشکال کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند باتوں اور چند شاعروں سے قطعِ نظر کر لیں تو اکثر شعرا کے بارے میں ان کی تنقیدی آرا بہت اہمیت ووقعت رکھتی ہیں۔

ان حضرات کے بعد ایک بہت اہم نام 'پروفیسر کلیم الدین احمد' کا ہے جنھوں نے پرانی تنقید میں انقلابِ عظیم برپا کردیا۔ انھوں نے تنقید اور شاعری کے اصولوں سے متعلق متعدد کتابیں لکھیں، جن میں اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر اور 'عملی تنقید' خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ کلیم الدین احمد کے بعد اردو تنقید نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے، ترقی پسند نقادوں میں خاص طور سے ترقی پسند تحریک کے تحت ایک نیا اور مستقل دبستان وجود میں آیا جسے مارکسی یا ترقی پسند دبستانِ نظریۂ تنقید کہا گیا۔ سجاد ظہیر، ممتاز حسین، مجنوں گورکھ پوری احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری، محمد حسن، عقیل رضوی اور وہاب اشرفی وغیرہ نے اس مکتبِ فکر کے تحت اردو کی مختلف اصناف کو پرکھا اور ترقی پسند تنقید میں اپنا نمایاں مقام بنایا۔ اس کے بعد کے نقادوں نے کسی ایک نقطۂ نظر سے وابستہ ہونے کے بجائے ادب کی پرکھ کے نئے معائیر بنائے اور اردو تنقید کو جدید دور میں داخل کیا۔ ان نقادوں نے اردو کی مختلف اصناف اور ان سے متعلق ادبا و شعرا کو اپنے زاویۂ نظر سے پرکھا، چنانچہ ان میں حامد حسن قادری، سید حسن عسکری، نیاز فتح پوری، سید مسعود حسن رضوی ادیب، آل احمد سرور، اسلوب احمد انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، خورشید الاسلام، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، سلیم احمد اور شمیم حنفی وغیرہ بہت اہم ہیں۔

ان نقادوں اور ان کے بعد آنے والی جدید نسل نے شاعری اور نثر کی تمام اصناف کا مطالعہ کر کے ان کی ادبی و فنی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے کبھی تو پوری کتاب اور فن پارہ یا ایک مصنف کے چند فن پاروں کے مطالعے پر مبنی ایک جامع مضمون یا کتاب لکھ دی گئی اور اس مخصوص صنف میں اس شاعر یا ادیب کا مقام متعین کیا گیا۔ کبھی کسی فن پارے کو پرکھنے میں تنقید کے ساتھ تشریح و توضیح کو بھی خاصی اہمیت دی گئی۔ ادب کے مطالعے کے اس عمومی رجحان یعنی کسی متن کی تشریح و توضیح کرنے اور شرح لکھنے کا ایک پورا سلسلہ قائم رہا ہے جو ماضی میں بہت قدیم ادوار تک جا پہنچتا ہے۔ مثلاً ارسطو کی کتابوں کی شرح خود ان کے زمانے میں لکھی گئیں، بعد کے زمانے میں عربی و اسلامی علوم میں شرح لکھنے کا باقاعدہ رواج ہوا۔ چنانچہ قرآن پاک کے ترجمے کے ساتھ اس کی تشریح و تفسیر سے متعلق درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔ اسی طرح مختلف احادیث کی شروح علما نے اپنے اپنے انداز سے لکھی ہیں۔ ہند و بیرون ہند کے سبھی مدارس اسلامیہ میں داخل نصابات میں تقریباً تمام اہم شرحیں موجود ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو ہی نہیں،

دنیا کی تمام زبانوں میں پھیلے ہوئے مختلف علوم وفنون اور ادبیات کی سیکڑوں کتابوں اور مجموعوں کی شرحیں لکھنے کا سلسلہ قائم رہا ہے جس میں متن کو بنیاد بنا کر اس کو سہل انداز میں واضح کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس طرح دنیا بھر میں شرح لکھنے کا باقاعدہ ایک علم اور دبستان قائم ہوگیا جسے ہم علمِ شرح کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس علم کو اور بھی مختلف نام دیے گئے ہیں جیسے تفہیم، تعبیر، تفسیر اور تبصرہ وغیرہ۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صرف پیشِ نظر فن پارے یا اس کے اقتباس کی تشریح یا وضاحت کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کبھی مختصر طور پر فنی محاسن کا تذکرہ بھی کر دیا جاتا ہے اور ان سب کا مقصد وضاحتِ کلام ہوتا ہے اور ظاہر ہے اس پوری شرح نگاری کا دارومدار متن اور اس کے مطالعے پر ہوتا ہے۔ اردو ادب میں بھی مختلف شعرا کے کلام کی شرحیں لکھی گئی ہیں، مثلاً پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر وغیرہ نے غالبؔ اور اقبالؔ کی، ضیاء احمد بدایونی اور ظہیر احمد صدیقی نے مومنؔ اور فانیؔ کی مکمل شرحیں لکھی ہیں۔ اقبالؔ کے بعض شعری مجموعوں کی شرحیں علیٰحدہ سے بھی مختلف لوگوں نے لکھی ہیں۔ عہدِ حاضر میں اردو کے عظیم نقاد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے میرؔ اور غالبؔ کی شرحیں لکھی ہیں، جو اپنی اہمیت و وقعت کے اعتبار سے بہت مفید اور اب تک بے مثال اور عالمانہ شروح ہیں۔

متن کو بنیاد بنا کر اور اس پر ارتکاز کر کے فن پارے کو تفصیل سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کا ایک نیا رجحان اردو میں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے شروع ہوا جس میں شرح نگاری سے آگے بڑھ کر 'متن اساس تنقید' کی گئی۔ یہی وہ رجحان ہے جو آگے چل کر باقاعدہ طور پر 'تجزیہ نگاری' کے عنوان سے سامنے آیا۔ اس طرح پچھلی تین چار دہائیوں سے اردو ادب میں تجزیہ نگاری نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رکھنی ضروری ہوتی ہے کہ جب تک متن کا اس کے معیار کے شایانِ شان سنجیدگی اور گہرائی سے مطالعہ نہ کیا جائے اس وقت تک نہ تو اس کی تہہ داریوں سے واقفیت ممکن ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی معنیاتی جہات اور وسعتوں کی تفصیل کھل کر سامنے آسکتی ہے۔ تجزیے کا فن، متن کی انہی معنیاتی اور اسلوبیاتی جہات کو قاری پر منکشف کرتا ہے اور یہ تفہیم کلام کا ایک واضح، تنقیدی اور استدلال سے بھرپور طریقِ کار ہے۔ اردو میں بہت سی نظموں، غزلوں، افسانوں اور دیگر فن پاروں کے تجزیے کیے گئے ہیں

اس کے باوجود اس کی کوئی حتمی تعریف متعین نہیں کی جا سکی ہے اور نہ ہی اس کے کچھ واضح اور متفق علیہ اصول بنائے جا سکے ہیں۔ بلکہ مختلف زبانوں کے ادبیات کے مطالعات کی روشنی میں اردو کے متعدد تجزیہ نگاروں نے اپنے وضع کردہ یا اختیار کردہ اصولوں کی روشنی میں ادب پاروں کے تجزیے کیے ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تجزیے کے لغوی و اصطلاحی معنی اور اس کے سلسلے میں مختلف علما و ناقدین کی پیش کردہ آرا و تعریفات کا تذکرہ کر دیا جائے تا کہ اس فن کی تعریف و دائرۂ کار متعین کرنے میں کچھ سہولت ہو سکے۔

تجزیہ کسی بھی ادب پارے کی تفہیم کا بہترین طریقہ ہے اس کے ذریعہ سے فن پارے کی تہہ تک پہنچ کر اس کے وجود میں آنے کے اسباب و عوامل کو بھی تلاش کیا جاتا ہے، اس کی ہمہ جہت ادبی و فنی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ کسی متن کو پڑھتے وقت ایک باذوق اور تربیت یافتہ قاری، جس تجربے اور احساس سے گزرتا ہے اور اس کے ذہن کے کینوس پر فکری، فنی اور اسلوبیاتی اعتبار سے جو نقوش بنتے ہیں ان کو ادبی و تنقیدی زبان میں اس کی تمام جزئیات کے ساتھ قاری تک پہنچا دینا ہی تجزیاتی عمل ہے۔

مختلف قدیم و جدید لغت نویسوں نے اپنی لغات میں تجزیے کے لغوی و اصطلاحی معنی بیان کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے مکاتب فکر کے علما نے بھی تجزیہ نگاری کی تعریفیں بیان کی ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

مولوی سید احمد دہلوی 'فرہنگِ آصفیہ' میں لکھتے ہیں۔

اجزا، اسمِ مذکر (جز کی جمع) حصے، ٹکڑے۔[1]

صاحب 'نوراللغات' نے لکھا ہے کہ تجزیہ، مذکر، ٹکڑے ٹکڑے کرنا، کسی چیز کو تقسیم کرنا۔[2]

''لغات کشوری'' میں تجزیہ، تقسیم کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔

''اردو لغت'' میں قدرے وضاحت و دلائل سے لکھا ہے۔

۱۔ فرہنگِ آصفیہ۔ مرتب، سید احمد دہلوی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۱۸

۲۔ نوراللغات (حصہ دوم)۔ تالیف مولوی نورالحسن نیر، (بی۔اے، ایل ایل بی)، ص: ۱۷۹

جزء (ضم ج) پارہ، ٹکڑا، حصہ

تھی یہی وہ قوم جس کے حق میں فرماتے تھے آپ
ہے عرب کی دوستی جز دین اور ایمان کا
(کلیات نظم حالی۔۲:۱۱۵)

سلاست نہیں جس کیری بات میں
پڑیا جائے کیوں جز لے کر ہات میں
(قطب مشتری۔۱۴)

(عروض): حرکات وسکنات تقطیعی کے باہم مرکب ہونے سے جو لفظ بنتا ہے اس کا نام جز ہے (قواعد العروض ۱۹)

تجزی: فرد فرد ہونے، ٹکڑے ٹکڑے کرنے یا بٹ جانے کا عمل، جزو جزو ہو جانے کی حالت۔

تجزیہ: کسی چیز کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور تقسیم کرنا، کسی مرکب کے اجزا کو الگ الگ کرنا جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے۔ نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں کسی شخص کے اعمال، مزاج، عادات واطوار کو پرکھنے کا عمل۔[۱]

''اردو دائرۂ معارف اسلامیہ'' میں تجزیہ کے درج ذیل معنی بیان کیے گئے ہیں:

جز: جمع اجزا، علم عروض میں تفعیل، سہولت کے پیش نظر قرآن مجید کی تلاوت کی خاطر

جز (جمع اجزا): حصہ، ذرّہ، ایک اصطلاح جو کلام اور فلسفے کی اصطلاحی زبان میں (فلسفیانہ) ذرّے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور جس سے مراد مادّے کا وہ ٹھوس حصہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں ہو سکتی۔[۲]

''جامع اللغات'' (جلد اوّل) کے مؤلف خواجہ عبدالمجید (بی۔اے) تجزیہ کے یہ معنی تحریر کرتے ہیں:

۱۔ اردو لغت۔ اردو لغت بورڈ، ترقی اردو بورڈ، کراچی، جون ۱۹۸۶ء

۲۔ شعبۂ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص: ۲۱۵۔۲۱۶

تجزّی: (ع۔مؤنث) علیحدہ علیحدہ کرنا، فرد فرد کرنا، تقسیم کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔

جزا: تقسیم کرنا (مذکر)

تجزیہ: (ع۔مذکر) تقسیم کرنا، علیحدہ علیحدہ کرنا، ترکیب۔

فارسی ادب میں اگرچہ تجزیوں کا زیادہ رواج نہیں ہے لیکن فارسی کی مختلف لغات میں لفظ تجزیے کے عموماً یہی معنی تحریر کیے گئے ہیں۔

شمس اللغات میں تجزیہ کے یہ معنی بتائے گئے ہیں:

تجزیہ: (ع) پارہ پارہ کردن[1]

مشہور فرہنگ ''آنندراج فارسی بہ فارسی'' میں تجزیہ کے معنی مندرجہ ذیل تحریر کیے گئے ہیں:

تجزیہ: بروزن تفعیل (ع) پارہ پارہ کردن، تقسیم کردن[2]

''فرہنگ جامع فارسی'' جو کہ فارسی بہ انگریزی ہے اس میں تجزیہ کے متعلق یہ بیان ملتا ہے:

تجزیہ: (tajzieh)۔ (1) Analysis (2) Decomposition (3) Examination

(4) Segregation (5) Sepration (6) Dividing into parts or ingredient

تقریباً یہی معنی اردو ہندی اور انگریزی ڈکشنری میں جان ٹی پلیٹس نے بیان کیے ہیں۔[3]

تجزیہ، تجزی، اجزا، Analysis, Dividing separting into small pieces

The Oxford English Dictionary (Second Edition) A. Bazouki

میں لفظ Analysis کو مختلف انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ شمس اللغات (فارسی)۔ص:۳۰۲

۲۔ فرہنگ آنندراج، مطبع منشی نول کشور، واقع لکھنؤ زیور طبع، پوشید، ۱۸۸۹، ص:۶۴۲

3. A Dictionary of Urdu Classical Hindi and English John T. Platts, M.A. Manohar-2006, Page:311

Analysis:

The resolution or breaking up of anything complex into its various simple elements, the opposite process to synthesis, the exact determination of the elements or components of anything complex.

Literature:

The investigation of any production of the intellect, as a poem, tale, arguments, Philosophical system, so as to exhibit its component elements in simple form.

Grammar:

The ascertainment of the elements composing a sentence or any part of it, logical, syntactic, or sentence analysis the resolution of the sentence into elements performing distinct functions in the expression of thought, and thus having definite relation to the whole sentence and to each other, as subject and predicate with their respective enlargements.

عربی زبان میں الفاظ کا زبردست سرمایہ موجود ہے، لیکن یہ علم نیا ہونے کی وجہ سے اس زبان میں باقاعدہ طور پر تجزیہ نگاری کا رجحان نظر نہیں آتا۔ البتہ عربی میں شرح نگاری کی ہزار سال سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی ایک مضبوط اور قابلِ قدر روایت رہی ہے جس نے بعد کے زمانے میں فارسی اور اردو زبانوں پر بھی غیر معمولی اثر ڈالا ہے اور ان دونوں زبانوں میں شرح نگاری کا وافر سرمایہ تیار ہو گیا۔ شرح کے ساتھ ساتھ عربی میں تحلیل نگاری کا سلسلہ بھی رائج ہے۔ جہاں تک لفظ تجزیہ کا تعلق ہے عربی لغات میں یہ لفظ اپنے معنی کے ساتھ موجود ہے۔ اس ذیل میں عربی لغات سے صرف چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

مصباح اللغات:

جزاء، تجزۂ، تجزئیاً۔ الشئی، تقسیم کرنا، قانع بنانا چیز کا ایک حصہ۔

مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی ''القاموس الوحید'' میں بیان کرتے ہیں:

جزّاءہٗ تفعیل تجزیۃ، تقسیم کرنا، اجزا بنانا، ٹکڑے کرنا۔

لغت المورد (قاموس عربی انگلیزی) میں تجزیہ کے معنی ہیں:

Splitting, Parting, Partition, Dividing, Division, Separation, Fractionation, Breakdown, Section

فرہنگ ولغات سے قطع نظر، مختلف نقادوں، ادیبوں اور دانش وروں نے تجزیے کے لغوی معنی کے ساتھ ساتھ اصطلاحی معنی پر بھی غور وخوض کیا ہے۔ ذیل میں اسی طرح کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

Hugh Halman & William Harman نے انگریزی میں تجزیے کی یہ تعریف کی ہے:

> Definition of Analysis:A method by which a thing is separated into parts, and those parts are given rigorous, logical, detailed scruting, resulting in a consistent and relatively complete account of the elements of the thing and the principles of their organization.[1]

دوسری جگہ Wikipedia, The Free encyclopedia میں Poetry analysis کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے:

---

1. From a handbook to literature, 5th edition by C. Hugh Holman & William Harman New York, Macmillan Publishing Corporation, p. 20

"Poetry Analysis is the process of investigating a poem's form, content and history is an informed way with the aim of weighting one's own and other's understanding and appreciation of the work."

اردو کے دانش وروں، نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے مختلف متون پر غور کرتے وقت تجزیہ نگاری کے فن پر بعض اہم اور دقیق نکتوں کی وضاحت کی ہے مثلاً:

شارب ردولوی نے تجزیے کے بارے میں لکھا ہے:

''تجزیے کے معنی یہ ہیں کہ کسی فنی تخلیق کے صرف معنوی حسن کو نہیں بلکہ فن کار کے خیال واحساسات اور فن کے تمام محاسن اور مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی جائے.....

تجزیاتی ناقد کسی فن پارے کی تخلیقِ نو نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے اچھے و برے تمام پہلوؤں کو نمایاں کر دیتا ہے کہ وہ خیالات کیا ہیں جن کے تحت کسی چیز کی تخلیق ہوئی ہے اور کن حالات نوعیت کے تحت وہ کسی خاص شکل میں سامنے آئے ہیں، ساتھ ہی وہ اس کے معائب ومحاسن اور مفید ومضر اثرات سے بھی بحث کرتا ہے۔''[1]

شمس الرحمٰن فاروقی نے تجزیہ نگاری کے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''لفظی تجزیہ ایک طرح کی شرح نویسی ہے، اور نہیں بھی ہے۔ شرح، صحیح ترین معنی کی تلاش کرتی ہے اور صحیح ترین معنی سے اس کی مراد وہ معنی ہوتے ہیں جو شعر کی سطح سے اُبھرتے ہوں..... دوسری طرف، لفظی تجزیہ بھی شرح کی طرح شعر کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔..... لفظی تجزیہ تناؤ، طنز اور انسلاکات کی زمین میں پھیلتا پھولتا ہے۔''[2]

۱۔ جدید اردو تنقید، اصول ونظریات۔ ڈاکٹر شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۲۰۰۲ء، ساتواں ایڈیشن، ص: ۴۶۵۔۴۶۶

۲۔ شعر، غیر شعر اور نثر۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد، ۱۹۹۸ء، دوسرا ایڈیشن، ص: ۳۱۲

عبادت بریلوی نے تجزیے سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''تجزیے سے مراد ہے کہ تنقید نگار فنی تخلیقات میں ڈوب کر اور کھو کر فن کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرے یعنی وہ خود اس جگہ پہنچ جائے جہاں مصنف یا فن کار پہنچتا ہے اور اس کی باتوں کو پوری طرح سمجھ کر عوام کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ اس کے اچھے اور برے تمام پہلو نمایاں ہو جائیں۔.... تفصیل سے یہ بتانا اس کا فرض ہے کہ وہ خیالات کیا ہیں؟ ان کی نوعیت کیا ہے؟ وہ کس قسم کے ہیں؟ وہ کیوں پیش کیے گئے ہیں؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ کن حالات نے ان کو پیدا کیا ہے؟ اور یہ کہ وہ مفید ہیں یا مضر۔''[1]

پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنی کتاب 'تحریر اساس تنقید' میں تجزیے کے حدود پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تجزیے/ مطالعہ کا مقصود، تنقیدی نظام اقدار کی روشنی میں متن کی معیار بندی نہیں اور نہ ہی مقصود کے حوالے سے اس کی افادیت کی جستجو ہے۔ اسے اپنی ساری توجہ وسیلۂ اظہار پر مرکوز رکھنی ہوتی ہے تا کہ متن کے اجزا میں ارتباط کے ظاہری اور مخفی علاقوں کی دریافت اور ان کے درمیان ربط کی نوعیت کا جائزہ لیا جا سکے۔ اس طریقے سے متن میں معنی خیزی کے وسائل کی نشان دہی ممکن ہے، جو ہر معیاری تجزیہ کا مقصود ہے۔''[2]

ان تمام امور کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ کوئی بھی تخلیق ادبی شہ پارے کا درجہ اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ اس میں رفعتِ تخیل، دقّتِ معانی اور ندرت بیان کے اوصاف نہ پائے جائیں اور یہ خصوصیات کسی فن پارے میں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب اس میں بہترین و منتخب الفاظ، عمدہ تشبیہات و استعارات، اشارات و کنایات اور تلازمات وغیرہ کا استعمال بہت ہنرمندی سے کیا جاتا ہے اور ان سب امور کا مطالعہ تجزیہ میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ اردو تنقید کا ارتقا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص: ۳۳

۲۔ تحریر اساس تنقید۔ قاضی افضال حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۲۸

مشرقی ادبیات کی طرح مغربی ادبیات میں بھی تجزیہ کی روایت موجود ہے اور اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ اردو میں تجزیہ کا فن کسی نہ کسی شکل میں مغرب سے مستعار بھی ہے اور مستفاد بھی۔ اسی لیے پروفیسر حامدی کاشمیری نے مغرب میں تجزیہ نگاری سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ارسطو نے بعض یونانی ڈراموں کے تجزیے کیے ہیں۔ انگریزی میں ڈرائیڈن اور جانسن کے بعد کولرج اور ایلیٹ نے بعض فن پاروں کے تجزیوں پر توجہ کی ہے۔ موجودہ صدی میں ایمپسن جو رچرڈس کا شاگرد تھا، نے باقاعدگی اور تدقیق کے ساتھ اپنی Seven types of ambiguity میں نظموں کی حرف بہ حرف تجزیہ کاری کی ہے، ڈے شیز اس کے طریقِ تجزیہ کو اوّلین کام (Pioneering work) قرار دیتا ہے۔ ویسے ایمپسن سے پہلے Lubbock Ferry نے ۱۹۲۱ء میں The Craft of Fiction میں ناول نگاروں مثلاً جین آسٹن اور جارج ایلیٹ کے بارے میں تجزیاتی مطالعے پیش کیے۔ ایمپسن کے بعد 'بلیک مور' اور 'بروکس' نے تجزیاتی تنقید کے عمدہ نمونے پیش کیے۔''[1]

شرح نگاری کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ عربی کے عہد جاہلیت سے ہزار سال قبل یعنی ارسطو سے بھی کافی پہلے یونان میں شرح نویسی کی روایت موجود تھی۔ بالفاظ دیگر شرح نویسی کی روایت کا آغاز یونانیوں کی دیومالائی شخصیت 'ہرمیز' (Hermes) سے وابستہ و ماخوذ بتایا جاتا ہے۔ اسے 'ہرمیز' کے نام سے ملا کر اس علم کا نام ہرمینوٹکس (Hermenutics) رکھ لیا گیا۔[2] اس بیان میں جس قدر بھی صداقت ہو، یہ امر بہر حال مسلّم ہے کہ ادب میں شرح نویسی کی روایت کافی قدیم، مضبوط اور جاندار ہے کہ اس کے بعد، ارسطو نے اس میدان میں زبردست کارنامے انجام دیے۔ غرض شرح نگاری کی طرح تجزیے کے ابتدائی نقوش اور ارتقائی مراحل بھی مغربی ادب میں بہ آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ اردو نظم کی دریافت۔ حامدی کاشمیری، کمپیوٹرسٹی، سری نگر، کشمیر، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۵۱

2. Palmer, Richard E. Hermeneutics: Interpretation theory in Schleimacher Evanston North Western University press, 1969.

مذکورہ بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو میں تجزیے کی کوئی حتمی تعریف اور باضابطہ اصول وحدود اب تک متعین نہیں کیے جاسکے ہیں بلکہ مختلف تجزیہ نگار اپنی صواب دید کے مطابق فن پارے کو پرکھتے ہیں۔ ہر تجزیہ نگار، تخلیق کے آئینے میں یہ دیکھتا ہے کہ تخلیق کار کا مشاہدہ کتنا گہرا اور علم کتنا وسیع ہے، نیز اس میں سماجی شعور کتنا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ مؤثر انداز میں بات کہنے پر اس کو کتنی قدرت حاصل ہے۔ ایک اچھے تجزیہ نگار کو ذہین، وسیع المطالعہ، تربیت یافتہ اور قادر الکلام ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر اسے ادب اور اس کے بدلتے رجحانات کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ فن پارے یا شہ پارے کی تفہیم و تجزیہ کے لیے تخلیق کار کے فکر وفن کا بغور مطالعہ ناگزیر ہے، کیوں کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ فکر و فن میں بھی تغیر ہوتا ہے۔ موجودہ اصطلاحات قدیم ہوتی جاتی ہیں اور ان کی جگہ جدید تلازمات واصطلاحات وجود میں آتی رہتی ہیں۔ مثلاً قلی قطب شاہ اور غالبؔ کی شعری تشبیہات واستعارات کے استعمال اور طریقۂ کار میں بہت فرق ہے۔ یہی معاملہ غالبؔ اور اقبالؔ کا ہے۔ اس کی ایک اور بڑی مثال فیضؔ اور اقبالؔ کے تصورِ عشق کی بھی ہے۔ ایک اگر وطنیت پر مٹتا ہے تو دوسرے کا عشق اوّل الذکر ہی نہیں بلکہ دیگر سبھی مفکرین سے مختلف ہے، لیکن اسی عشق کے بارے میں عام شعرا کی پیش کش کا نظریہ الگ ہے، چنانچہ ان میں سے بعض شعرا اسی 'عشق' کو مجازی اور حقیقی کا نام دیتے ہیں۔ اس کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر دور کے ادبا فرسودہ روایات ومسلّمات کو توڑنے کے لیے نئے سرے سے لفظ کے امکانات کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نئی نئی تشبیہات واستعارات، نئی لفظیات، نئے رموز وعلائم اور نئے ڈکشن کی جستجو کرتے رہتے ہیں۔

تجزیہ نگار کو ان سبھی چیزوں سے کماحقہٗ واقف ہونا ضروری ہے اور یہ بھی کہ تخلیق کار کلاسیکیت کا دل دادہ ہے یا جدیدیت کا، ترقی پسندی سے متعلق ہے، یا رومانیت کا نمائندہ ہے، اس کے بعد ہی فن پارے کے اصل معنی اور اس کے امکانات تک رسائی ممکن ہو پاتی ہے۔ تجزیہ نگار کو یہ بھی معلوم ہونا ضروری ہے کہ فن پارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس کا تعلق کس زمانے سے ہے۔ یعنی ماضی، حال یا مستقبل سے، اور اگر مستقبل سے ہے تو اس کے کیا قرائن پائے جاتے ہیں۔ جس کا سبب یہ ہے کہ فن پارے میں پیش کردہ افکار وخیالات کے پسِ پشت بصیرت، ادراک، شعور اور شاعر کا طرب ونشاط اور حزن وملال جیسی بہت سی

چیزیں کارفرما ہوتی ہیں۔اس لیے ایک اچھا تجزیہ نگار، کسی فن پارے کی تفہیم میں متنی جزئیات کے ساتھ ساتھ داخلیت وخارجیت اور شعور ولاشعور کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، تبھی متن کی معنیاتی جہات کھل کر سامنے آتی ہیں۔ کسی فن پارے میں فکر وفن دونوں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔فن، خیال کو مؤثر ترین پیرایے میں پیش کرنے کا آلہ ہے جس میں لفظوں کی تراش خراش، نئی تراکیب اور نئی بندشوں کی ترتیب وترکیب کے ساتھ ساتھ متن میں غنائیت، تشبیہوں، تمثیلوں، استعاروں، پیکر تراشی، فضا آفرینی وغیرہ کی تلاش کی جاتی ہے۔فن میں ان اجزا کے چابک دستی سے استعمال کی وجہ سے شعر اعلیٰ درجے کا ہوسکتا ہے، مگر محض ان کا اجتماع شاعری نہیں ہوسکتا۔اس میں فکر وخیال کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، یعنی شاعری میں فکر کے ساتھ ساتھ فن اور پیش کش کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔غزل جو شاعری کے سب سے زیادہ مشہور ومقبول صنف ہے اس کی بہترین مثال ہے۔

نثری فن پارے کے تجزیے میں اظہارِ خیال کے فنی وسائل کے علاوہ تخیل، عصری آگہی یعنی سماجی شعور، ہیئت، نفسِ مضمون اور بیانیہ وغیرہ پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔افسانے کے تجزیے میں فکر وفن کو یکساں اہمیت حاصل ہوتی ہے، اگر اس میں ایک کو بھی نظر انداز کیا گیا تو وہ تجزیہ، اچھا تجزیہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے علاوہ اس میں بیانیہ کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے اس لیے تجزیہ نگار کی اس طرف بھی گہری نظر ہونا چاہیے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ متن کے اصل معنی تک صرف ایک ذی شعور اور تربیت یافتہ تجزیہ نگار ہی پہنچ سکتا ہے جس کی گہری نظر فن پارے کے حسن وقبح پر بھی ہوتی ہے اور جو اسے اس کی جزئیت کے بجائے کلیت میں دیکھتا ہے۔تجزیہ نگار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس بات پر نظر رکھے کہ تخلیق کار نے بدیعیات کا استعمال کس مقدار میں کیا ہے اور لفظوں کو کس خوب صورتی سے برتا ہے۔'بدیعیات' سے مراد وہ اسالیب ہیں جن کے ذریعے ایک فن کار تخلیق کو قابلِ قبول اور پُرکشش بناتا ہے اسی لیے ایک کامیاب تجزیہ نگار کی نظر ہمیشہ انہی بدیعیات یعنی متن کی داخلی وخارجی صورت حال، صنائع وبدائع اور بیان وبدیع، کلیدی الفاظ کے برمحل استعمال، غنائیت، رعایت، ارتباط لفظی ومعنوی اور نغمگی وغنائیت وغیرہ پر مرکوز رہتی ہے۔

تجزیے کی ان حدود کے ساتھ اس کے اصولوں کا تعیّن بھی ضروری ہے جن کی روشنی میں فن پارے کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ذیل میں تجزیہ نگاروں کے تجزیوں کی روشنی میں کچھ اصول مرتب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

تجزیہ نگاری کے اصول:

۱۔ تجزیہ نگاری کے اصولوں میں متن کی صحیح قرأت کو اوّلیت حاصل ہے۔ اس پر توجہ کیے بغیر نہ تجزیہ مکمل ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس متن میں اظہارِ خیال کے فنی وسائل کا انکشاف ہوسکتا ہے۔ مختلف النوع قرأتوں کی بنا پر فن پارہ ایک ہوتے ہوئے بھی اس سے حاصل شدہ مفاہیم مختلف ہوتے ہیں۔ متن کی اس عالمانہ اور سنجیدہ قرأت سے جو کثیر جہتی مفہوم برآمد ہوتا ہے، تجزیہ کا وہی ماحصل ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ متن کی صحیح قرأت ہی تجزیہ کا پہلا اصول ہے۔

۲۔ کسی فن پارے کی تفہیم اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ تجزیہ نگار کے سامنے اس صنف کی شعریات کے اصول موجود نہ ہوں۔ شاعری کے مطالعے میں الفاظ کے استعمال کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے اسی لیے آتشؔ نے کہا تھا:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا

الفاظ جب تشبیہ، استعارہ یا دوسرے پیکروں میں رکھ کر پیش کیے جاتے ہیں تو ان کے معنوی حسن میں حد درجہ اضافہ ہوجاتا ہے اور اس میں معانی کی تہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تجزیہ نگار کے نزدیک کسی تخلیق کے صرف وہی معانی قابلِ غور نہیں ہوتے جو تخلیق کار کے عندیے میں ہوں بلکہ اس کے علاوہ بھی جتنے معانی ممکن ہوں ان کی دریافت اور اس فن پارے میں اختیار کردہ وسیلۂ اظہار کی تلاش و جستجو تجزیہ نگار کا اصل مقصود ہوتا ہے۔ بڑے فن پارے کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ کثیر المعانی اور کثیر الجہات ہو۔

۳۔ نظم کے تجزیے پر غور کرتے وقت ان امور کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے کہ نظم چوں کہ ابہام گوئی کا فن ہے اور ابہام، شاعری میں وصفِ ذاتی کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے نظم کے تجزیے میں

ابہام کی توضیح ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نظم چوں کہ وحدتِ تاثر پر ارتکاز کرتی ہے اس لیے تجزیہ نگار پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تجزیے میں اس کی نشان دہی کرے۔

۴۔ تجزیہ نگار کے لیے اس بات کا علم رکھنا بھی ضروری ہے کہ نظم میں خطاب کس کی جانب ہے؟ اور نظم کس لہجے میں کہی گئی ہے یعنی طنزیہ، مزاحیہ یا خود کلامی کے انداز میں لکھی گئی ہے یا کوئی دوسرا پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ نظم داخلی، انقلابی یا وارداتی احساسات پر مبنی ہے، یا کسی دوسری تحریک پر مبنی ہے۔ یعنی نظم کے وجود میں آنے کے خارجی عوامل کیا ہیں؟

۵۔ تجزیہ نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کیا شاعر کا تعلق اور ذہنی وابستگی کسی خاص حلقۂ فکر سے ہے؟ اگر ہے تو اس سے واقفیت ضروری ہے۔ یعنی وہ شاعر ترقی پسند اور مارکسی ہے یا جدیدیت کا علم بردار ہے، حلقۂ اربابِ ذوق میں شامل ہے یا کسی دوسرے مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہے؟ اس طرح اسے نظم کے پس منظر کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوگی اور شاعر کے ادبی رجحان کا بھی علم ہو جائے گا۔

۶۔ نظم یا غزل کے تجزیے میں الفاظ کی بنیادی شکل اور اس کے مادّے اور ان کا محل استعمال فن پارے کی معنویت کو واضح کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، اس لیے مطالعۂ ادب کے وقت لفظی تجزیے کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اگرچہ شعر کے ہر لفظ کا تجزیہ تو ناممکن ہے، لیکن بعض مرتبہ ایک دو لفظ ہی ایسے معنی خیز ہوتے ہیں جن کا تجزیہ ضروری ہو جاتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

> ''الفاظ، شعر کا بنیادی اور اصلی عنصر ہیں لہٰذا شعر کا صحیح اور مکمل مطالعہ اسی وقت ممکن ہے جب الفاظ کو الگ الگ کر کے، پھر ان کے باہم عمل و ردِ عمل، ان کے دروبست کے پس منظر میں ان کے تمام موجود و غیر موجود، مقدر و مذکور انسلاکات اور اشارات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کا مطالعہ کیا جائے۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ شعر میں استعمال ہونے کے بعد الفاظ اپنی صوری اور لغوی قدر و قیمت سے زیادہ وقعت کے حامل ہو جاتے ہیں۔''[۱]

۱۔ شعر، غیر شعر اور نثر۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد (دوسری اشاعت)، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص: ۳۱۱

۷۔ تجزیہ میں شاعر کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اس کے ذہنی ارتقا اور اس کے کلام میں اس نظم کا پس منظر بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بقول سید عبداللہ:

''کسی شاعر کی شاعری کے مطالعہ کے لیے اس کے کلام کا مطالعہ کافی ہونا چاہیے۔ مگر اس کے ذہن وفکر کے تدریجی ارتقا اور اس کے فن کی درجہ بدرجہ ترقی اور وسعت کو سمجھنے کے لیے اس کی زندگی اور ماحول سے باخبر ہونا بھی کسی حد تک ضروری ہے۔''[۱]

لیکن اس میں اتنی طوالت نہ ہو جائے کہ نظموں کے متون ہی یکسر نظر انداز ہو جائیں۔ تجزیہ نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر شاعر نے شعر میں کسی تلمیح کو بیان کیا ہے تو اس کے پورے پس منظر کی وضاحت کرے، اور یہ بھی بیان کرے کہ شاعر کے جذبات و احساسات کو دوسروں تک منتقل کرنے میں تجزیہ نگار کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔

۸۔ اگر نظم یا فن پارے پر کوئی عنوان قائم کیا گیا ہے تو تجزیے میں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ فن پارے کی اپنے موضوع اور عنوان سے کیا مطابقت ہے۔ نظم کا موضوع ایک خارجی نوعیت کے باوجود شاعر کی خلاقانہ صلاحیتوں اور داخلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً 'حالؔی کی برکھارت' میں 'برکھارت'، شبلی کی 'معرکہ کان پور' میں 'کان پور کا سانحہ'، اقبال کی 'مسجدِ قرطبہ' میں 'مسجد'، سیماب کی 'تاج' میں 'تاج' اپنی اپنی جگہ وقعت کے حامل ہیں۔

۹۔ تجزیے میں فن پارے کی تخلیق کے اسباب کا مطالعہ بھی ضروری ہے کیوں کہ تجزیہ نگار، تجزیے کے وقت ان حدوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں فن کار، تخلیق کے وقت تھا۔ تجزیہ نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس دور کی تاریخ، اہم واقعات اور شخصیتوں کے حالات، ادبی روایات اور اسالیب بیان سے واقفیت رکھتا ہو، تاکہ اس کے سیاق وسباق میں وہ تفہیم کا عمل انجام دے سکے۔ تجزیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ نظم کا سیاسی، سماجی اور معاشرتی یا اخلاقی ماحول کیا ہے؟ کہنے والے نے جو کچھ کہنا چاہا ہے اس سے پہلے اس کے ذہن نے کون کون سی راہیں طے کی ہیں۔

۱۔ نقدِ میر۔ سید عبداللہ، آئینۂ ادب، چوک مینار، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص: ۶۰

بقول نصیر احمد ناصرؔ:

> ''فن کوئی ایسی شے نہیں جو اپنے ماحول سے منقطع اور بے نیاز ہو، لہٰذا اسے سمجھنے کے لیے ہمیں اس عہد کے ذہنی اور معاشرتی حالات و محرکات کا لازمی طور پر مطالعہ کرنا ہوگا جو اس کی تخلیق کا باعث ہوئے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ فن کار ایک گروہ کا فرد ہوتا ہے جو بہر حال اس سے بڑا ہوتا ہے اور تمام فن کار جزوی طور پر اپنے زمانے کی پیداوار ہوتے ہیں۔''[1]

۱۰۔ تجزیہ نگاری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شعر کے مرکزی خیال سے بہت دور نہ جائے یعنی مثالوں کی کثرت اور اپنے ذاتی خیالات اور عالمانہ افکار سے کلام کو غیر ضروری طویل بنانے کے بجائے بنیادی خیال کے قریب رہ کر مختصر اور جامع انداز میں شعر کی وضاحت کرے۔

۱۱۔ نقاد یا تجزیہ نگار میں بہ یک وقت ذی شعور اور تربیت یافتہ قاری، شرح نگار، مصنف اور محتسب کی تمام خصوصیات کا ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ بہتر طور پر فن پارے کا بغور مطالعہ کرے۔ اس کے رموز و نکات کو سمجھے اور فنی تخلیقات میں سموئے ہوئے مفاہیم و مطالب کو بے نقاب کر سکے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ کسی اور شاعر کے یہاں بھی نظم ہوا ہو، لہٰذا اسی قبیل کے دوسرے اشعار کے ذریعے بھی متن کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً درج ذیل اشعار قابلِ توجہ ہیں جن میں ایک ہی مضمون بیان ہوا ہے:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے، جب نہیں آتا (میر تقی میرؔ)

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟ (غالبؔ)

۱۔ تاریخِ جمالیات (جلد دوم)۔ نصیر احمد ناصر، (ایم اے)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۲۹

۱۲۔ فن کار اپنی بات کو مستحکم کرنے کے لیے جن شعری وسائل اور فنی لوازمات کا استعمال کرتا ہے، تجزیے میں ان کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اگر نظم میں کثیر الجہت تجربات کا بیان ہو تو ان کی نشان دہی کے ساتھ نظم میں موجود شعری کرداروں کی بھی وضاحت ضروری ہے جیسا کہ حامدی کاشمیری نے لکھا ہے:

> ''نقاد کے لیے بھی نظم ایک شہر پُراسرار ہے، وہ اسے فتح کرنے کی خواہش اور منصوبہ بندی کرتا ہے اور اس کے پُرکشش اسرار و رموز کو منکشف کرنے کا بیڑا اُٹھاتا ہے.... اور وہ جمالیات اور جبلی مقتضیات کے زیر اثر متجسّسانہ ذہن، قوتِ مدرکہ اور علم و بصیرت کے علاوہ جدید تر تفہیمی اور تحسینی وسائل کو کام میں لا کر اس کی اسراریت کی کھوج لگاتا ہے اور اسی کی کلی شناخت کی سعی کرتا ہے۔''[۱]

۱۳۔ کسی فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت ان عوامل و عناصر کی تلاش کرنا بھی ضروری ہے جن کی وجہ سے فن پارہ وجود میں آیا۔ اگر صرف متن کا مطالعہ کیا جائے تو یہ یک رُخی مطالعہ ہوگا جس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ مثلاً میرؔ و غالب کے کلام کا تجزیہ کرتے وقت ان کے متون کے ساتھ اس دور کے حالات و واقعات اور ان کی زندگی کی کش مکش کا تجزیہ کرنا ناگزیر ہے۔ دونوں اپنے زمانے بلکہ اردو شاعری کے نمائندہ شاعر ہیں لیکن دونوں کا زمانہ جدا ہے۔ میرؔ کے یہاں جو حرماں نصیبی اور افسردگی کا رجحان ملتا ہے، وہ غالبؔ کے یہاں نظر نہیں آتا۔

۱۴۔ فکشن کے تجزیے میں اس بات کی وضاحت ضروری ہوتی ہے کہ فن پارے کا تعلق افسانوی ادب کی کسی صنف سے ہے؟ یعنی ناول ہے یا افسانہ؟ اس کی صنفی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کے علاوہ کردار، ہیئت، ساخت، مرکزی خیال اور نقطۂ نظر کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

۱۔ اردو نظم کی دریافت۔ حامدی کاشمیری، ص:۸

۱۵۔ تجزیہ نگار کا کام محض محاسن کی تلاش یا عیب جوئی کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ فن پارے کے دونوں رُخوں کا مطالعہ کرے اور کوئی فیصلہ خود اپنی پسند یا ناپسند کی بنا پر نہ کرے بلکہ یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ فن کار نے کیا کہا ہے اور کیوں کہا ہے؟

۱۶۔ تجزیے کا مقصد تفہیم کے عمل کو آسان بنانا ہے چنانچہ تجزیے کا اسلوب و انداز بیان سادہ ہو اور اس میں کوئی اسلوبیاتی الجھاؤ نہیں ہونا چاہیے۔

۱۷۔ تجزیے میں ان عوامل کی چھان بین کرنا ضروری ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے کوئی تحریر مخصوص فن پارے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً اس کا سماجی و سیاسی پس منظر کیا ہے؟ فن کار کا اپنا ذاتی رجحان کیا ہے؟ اور فن پارے میں کن کن فنی حربوں سے کام لیا گیا ہے؟ ایک فن کار جب تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو اس کے پیچھے بہت سے محرکات ہوتے ہیں۔ فن کار کی شخصیت کے ساتھ سماجی، سیاسی اور تہذیبی محرکات فن پارے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور جس صنف میں فن پارہ تخلیق کیا جا رہا ہے اس صنف کی اپنی فنی خصوصیات بھی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی فن کار غزل کی صنف اختیار کرتا ہے تو وہ ان تمام شرائط کو پورا کرتا ہے جو غزل کے لیے ضروری ہیں اور ان سارے فنی حربوں سے کام لیتا ہے جن کو ہم فنی تقاضوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ تجزیہ نگار یہ بھی دیکھتا ہے کہ محاسن شعری اور تشبیہات استعارات کا استعمال برمحل کیا گیا ہے یا نہیں، الفاظ کی نشست کس طرح کی ہے، تراکیب کس طرح سے استعمال کی گئی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ان اصولوں کی روشنی میں ہی کسی ادبی فن پارے کا تجزیہ پوری دیانت اور علمیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

تجزیہ اور شرح میں فرق:

کسی متن یا فن پارے کی تفہیم کے متعدد ذرائع ہوتے ہیں مثلاً: شرح، تبصرہ، تعبیر، تفسیر، تفہیم اور تنقید وغیرہ۔ شاعر، شعر میں فکر و تخیل کے کچھ گوشے ارادتاً پوشیدہ رکھتا ہے۔ ان تک پہنچنا اور سامعین یا قارئین کو ان کے رموز سے آشنا کرانا شارح کا منصب ہے۔ شعر کی تشریح و توضیح، اس کے تجزیہ اور تاویل سے

ہی اس کی تفہیم ممکن ہو پاتی ہے۔تنقید، تفہیم، تفسیر اور تجزیے کا مقصد یہ ہے کہ شاعری میں پیش کردہ افکار و خیالات اور احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ اس کے حسن کو بے نقاب کیا جاسکے اور اس کے تمام رموز و نکات سے واقفیت بہم پہنچائی جاسکے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی اور اردو کی مختلف لغات میں لفظ 'شرح' کے معنی و مفہوم کی جس طرح وضاحت کی گئی ہے، اس میں سے بعض کی نشان دہی کردی جائے۔

'شرح' عربی لفظ ہے، جس کا مصدر شَرَح اور مضارع یَشْرَحُ ہے۔اس کے معنی پھیلانا، واضح کرنا، وضاحت اور توضیح کرنا، کھولنا، تفسیر کرنا، کشادہ کرنا ہیں۔علوم وفنون کے نکات، مقالات اور کتابوں کی تشریح وتوضیح بطور خاص اس کے تحت آتی ہیں۔جب کہ مصباح اللغات میں مولانا ابوالفتح عزیزی نے شرح بہ معنی ظاہر اور نمایاں کرنا، کھولنا، ڈھیلا کرنا، مشکل اور دقیق کلام کا مطلب واضح کرنا، تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی نے بھی شرح کا مفہوم مسئلہ کی باریکی کو کھول دینا اور بیان کرنا، سمجھانا، کھولنا، کشادہ کرنا بیان کیا ہے۔

فارسی شعر وادب نے بیشتر ادبی روایات عربی سے ہی مستعار لی ہیں، لہٰذا شرح نگاری کے اصول بھی عربی سے فارسی میں منتقل ہوئے۔فارسی لغات میں 'شرح' کے لغوی معنی اس طرح درج ہیں۔

''فرہنگ فارسی'' میں ڈاکٹر معین نے 'شرح' کے مندرجہ ذیل معنی بیان کیے ہیں:

شرح: آشکار کردن، کشف کردن، بیان کردن، مسئلہ ای مشکل، توضیح دادن وغیرہ۔

فارسی لغات کشوری میں لفظ شرح کے مندرجہ ذیل معنی تحریر ہیں:

کھولنا، ظاہر کرنا، کھول کر بیان کرنا، تفسیر کسی کتاب کی۔

فارسی کے نثری وشعری سرمایہ کے ساتھ ساتھ شرح نگاری کی روایت اردو میں منتقل ہوئی، اور اس زبان میں منتخب شعری کاوشوں کی شرح نگاری کی یہ مضبوط روایت آج تک چلی آرہی ہے۔

''فرہنگ آصفیہ'' میں 'شرح' کو اسمِ مؤنث لکھا ہے بہ معنی بیان، اظہار، کھول کر کہنا، کشایش، تفسیر، تشریح، تفصیل، ٹیکا، حاشیہ وغیرہ۔

لب جاں بخش کے قریب وہ خط
شرح ہے متن زندگانی کی (آتش)

تیری صورت کو دیکھتے ہیں ہم
شرح وحدت کو دیکھتے ہیں ہم (مؤلف)

صاحبِ فیروز اللغات مولوی فیروز الدین نے شرح کے معنی:

کھول کر کہنا، تفسیر، حاشیہ، نرخ، دراور بھاؤ تحریر کیے ہیں۔

عہدِ حاضر کی مشہور انسائیکلو پیڈیا ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' لاہور، میں لفظ 'شرح' کے تقریباً وہی معنی تحریر کیے گئے جو اردو کی دیگر مشہور لغات میں درج ہیں۔ چنانچہ اس میں شرح کے معنی ہیں: کھولنا، تفسیر کرنا، اسی سے شَرَح یَشْرَحُ ہے، جس کے معنی ہیں بڑا کرنا، پھیلانا اور کھولنا، کسی چیز کی تشریح کرنا، واضح کرنا، اجسام چیر پھاڑ کرنا۔

عربی، فارسی اور اردو ادب میں شرح نگاری کی خاص اہمیت رہی ہے۔ ان تینوں زبانوں میں شرح نویسی کو باقاعدہ ایک فن کی حیثیت سے برتا گیا ہے۔ مختلف زبانوں، علاقوں اور زمانوں میں اس کے مختلف نام رہے ہیں، لیکن ان سب کا مقصد متن کی تفہیم و وضاحت، منشاے مصنف یا منشاے متن کی صراحت اور متن کی تعبیر و تشریح اور تفسیر کے لیے نئے امکانات کی تلاش و پیش کش وغیرہ رہا ہے۔ تجزیہ و شرح کے مابین فرق کو پروفیسر قاضی افضال حسین نے اس طرح واضح کیا ہے:

> ''تشریح کا بنیادی مقصد متن سے معنی کا استخراج ہے اور یہ اصلاً معنیات کے علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب کہ تجزیہ معنی کی دریافت اور تنظیم کا عمل نہیں بلکہ معنی تشکیل دینے والے مسائل کی نشان دہی سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے معنی بیان کرتے ہوئے شارح متن کے اجزا کے درمیان وہ منطقی ربط دریافت کرتا ہے، جس سے ایک حتمی معنی کی تشکیل ہو سکے۔''[1]

۱۔ تحریر اساس تنقید۔ قاضی افضال حسین، ص: ۱۳۴۔۱۳۵

جہاں تک مذہبی کتابوں کا معاملہ ہے، عربی میں اسلامیات سے متعلق بنیادی کتب یعنی قرآن کریم اور حدیث کی شروح کا وافر سرمایہ موجود ہے۔ مشرقی علوم میں قرآن پاک کی جتنی شرحیں اور تفسیریں لکھی گئیں ہیں، دوسرے کسی بھی علم، مسلک یا کتاب کے سلسلے میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح احادیث اور فقہ کی کتابوں کی شرحیں، نحو، معانی و بلاغت کی کتابوں کی شرحیں اور ان کی شرح در شرح سب سے زیادہ عربی، فارسی اور اردو کا مثالی سرمایہ ہیں۔ قرآن و حدیث اور فقہ وغیرہ کی تفاسیر و شروح کا سلسلہ تو عربوں میں اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول و تدوین کے بعد شروع ہوا، لیکن اس سے بھی قبل عہدِ جاہلیت کی شاعری میں سینہ بہ سینہ چلی آرہی وضاحت و شرح کی خاصی اہم روایت موجود تھی۔ مذہبی کتابوں میں قرآن کریم کے معانی و مفاہیم کی تفہیم کا علم بالعموم تفسیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی طرح شرح کا ذکر 'سینہ کھولنے' اور 'فراخی پیدا کرنے' کے معانی میں کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید دونوں کو الگ الگ مفہوم کے مواقع پر استعمال کرتا ہے۔

اس کے علاوہ احادیث کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئیں، وہ احادیث جنھیں ہم صحاحِ ستّہ کے نام سے جانتے ہیں، چھ ہیں:

(۱) ''صحیح بخاری'' جسے بخاری محمد ابوعبداللہ نے ترجمہ کیا۔

(۲) ''صحیح مسلم'' جس کا اردو ترجمہ حجاج نیشاپوری نے کیا۔

(۳) ''سنن الترمذی'' کو مترجم وحید الزماں نے کراچی، پاکستان قرآن محل سے شائع کیا۔

(۴) ''سنن ابوداؤد'' کو مترجم وحید الزماں نے کراچی، پاکستان قرآن محل سے شائع کیا۔

(۵) ''سنن نسائی'' اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع کی گئی۔

(۶) ''سنن ابنِ ماجہ'' کراچی مکتبہ سعودیہ سے شائع ہوئی۔

اسی طرح بہت سی فقہ کی بھی کتابیں ہیں، جن میں مسائلِ شرعیہ کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں المختصر القدوری، الاشراف علی مذاہب اہلِ علم، کتاب الصلوٰۃ خیر الکلام فی مسائل الصیام، الہدایۃ وغیرہ بہت اہم ہیں۔

اردو میں مذہبی صحیفوں کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئیں، لیکن جہاں تک ادب وشعر کا تعلق ہے تو ان میں فارسی کے اثر سے مشاہیر کے کلام کی شرحوں پر توجہ دی گئی۔ اسی طرح سعدی وحافظ کی شرحوں کی طرح میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

اردو کے دانش وروں، نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے مختلف شروح پر غور کرتے وقت شرح اور علم شرح کے بارے میں بعض اہم اور دقیق نکتوں کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اردو کے مشہور نقاد، جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا بیان ہے کہ:

> ''شرح، تفسیر، تشریح اظہار خیال یہ سب الگ الگ چیزیں ہیں یا ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں، اور ان کے مقاصد، کسی متن کے معنی بیان کرنا، اس کی وضاحت بیان کرنا، اس کے مطالب کو کھول کھول کر کہنا ہے اور تفہیم سے مراد کسی متن کے معنی اس طرح بیان کرنا کہ وہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کی بھی سمجھ میں آجائیں۔ یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اظہارِ خیال سے مراد کسی متن کی مجموعی صورت حال پر تبصرہ کرنا ہے اور اگر اس تبصرہ کے ذریعہ اس کے معنی بھی واضح ہو جائیں تو یہ اضافی فائدہ ہے..... شرح میں متن کی صرف وضاحت ہی نہیں ہوتی بلکہ اس پر اظہار رائے یعنی اس کے بارے میں اقداری فیصلہ بھی ہوتا ہے۔ یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تشریح سے مراد کسی متن کے مضمرات کو واضح کرنا ہے۔''[1]

علمِ شرح کے سلسلہ میں پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مقالہ ''علم شرح، تعبیر اور تدریس متن پر کچھ خیالات'' میں لکھا ہے کہ:

> ''علم شرح دراصل مذہبی صحیفوں کی تشریح وتوضیح سے شروع ہوا۔ انجیل اور قرآن کی تفسیروں کی ایک پوری تاریخ ہے، غور سے دیکھا جائے تو ان تفسیروں میں صرف شرح نہیں ہوتی تھی۔ تاریخ، فلسفہ بلکہ روایات سے بھی بہت کچھ مدد لی جاتی تھی۔

۱۔ مشمولہ علم شرح، تعبیر اور تدریس متن۔ از مضمون: تعبیر کی شرح۔ شمس الرحمٰن فاروقی، مرتبہ پروفیسر نعیم احمد، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص: ۳۲

شرح میں توضیح وتشریح پر زیادہ توجہ ہے۔تعبیر میں متن کی تفہیم پر یعنی اس کی معنویت اُجاگر کرنے پر.....شرح بہرحال ایک تشریح یا توضیح ہے اور ہر شارح اپنے نقطۂ نظر سے کسی پہلو کو زیادہ یا کم اہمیت دیتا ہے۔''[1]

'شرح' کا مقصد یہ ہے کہ کسی فنی تخلیق کے خیالات ومطالب کی تشریح وتوضیح کردی جائے یعنی جو کچھ فن کار نے پیش کیا ہے اسی کو وضاحت کے ساتھ بیان کردیا جائے۔تشریح وتجزیہ میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ تشریح میں شرح نگار، فن کار کی تخلیق کی تشریح و وضاحت کرتا ہے لیکن اس کو اس کے نتائج سے کوئی غرض نہیں ہوتی، جب کہ تجزیہ میں تجزیہ نگار اپنی بحث سے ایک نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یعنی تشریح سے معنی ومطالب کی وضاحت تو ہوسکتی ہے لیکن اس کے درجے اور مرتبے کا تعین نہیں ہوسکتا۔

شرح کی معنویت پر شمس الرحمٰن فاروقی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''لفظی تجزیہ ایک طرح کی شرح نویسی ہے، اور نہیں بھی ہے۔شرح صحیح ترین معنی کی تلاش کرتی ہے اور صحیح ترین معنی سے اس کی مراد وہ معنی ہوتے ہیں جو شعر کی سطح سے اُبھرتے ہوں.....شرح اگر ایک سے زیادہ معنی بتاتی بھی ہے تو ترجیح کے ساتھ یعنی اصل معنی تو یہ ہیں لیکن یہ بھی معنی نکل سکتے ہیں....شرح کو الفاظ کے دروبست سے پیدا ہونے والے معنوی اور غنائی تناؤ اور الفاظ سے پس پردہ جھانکتے ہوئے طنز کے پہلوؤں اور ان کے لہجہ کے مختلف آہنگوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔''[2]

بعض لوگ شرح اور تجزیے میں فرق کے قائل نہیں، جب کہ دونوں کے دائرۂ کار الگ ہیں۔ شرح، تجزیہ نہیں ہوسکتی البتہ تجزیہ میں شرح اپنی بہترین شکل میں موجود ہوتی ہے۔شارح کے لیے ناقد ہونا ضروری نہیں ہے۔ہر وہ قاری جس میں سخن فہمی کا ذوق ہوگا، شرح کرسکتا ہے، لیکن تجزیہ نگار کے لیے ناقد ہونا ضروری ہے۔وہ ادیب جس کے اندر ناقدانہ صلاحیت موجود نہ ہو، کسی تخلیق کا تجزیہ نہیں کرسکتا۔ وارث علوی لکھتے ہیں:

۱۔ مشمولہ، علم شرح، تعبیر اور تدریس متن پر کچھ خیالات۔آل احمد سرور، ص:۲۰

۲۔ شعر، غیر شعر اور نثر۔شمس الرحمٰن فاروقی، ص:۳۱۱۔۳۱۲

''تنقید شرح سے آگے بڑھتی ہے۔ جس شعر کو شرح نے سمجھایا ہے، تنقید اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ شرح وہی اچھی اور کامیاب ہوگی جو شعر کے صرف ان پہلوؤں کو اُجاگر کردے جو قاری کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں یا جن میں اسلوب بیان کی پیچیدگی سے اُلجھاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ ایلیٹ نے تو یہاں تک کہا ہے، بہترین شرح وہی ہے جو شرح نہ ہو بلکہ ان حقائق کو پیش کردے جو قاری کی نظر سے مخفی رہے ہوں۔''[1]

جب کہ تجزیہ اور شرح کے حدود کا تعین کرتے ہوئے شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''تجزیاتی نقاد، اصناف اور ان عناصر سے بھی بحث کرتا ہے، وہ بھی تشریحی نقاد کی طرح فن کار کی تخلیق کی تشریح و وضاحت کرتا ہے، لیکن تشریحی نقاد کو اس کے نتائج سے کوئی غرض نہیں ہوتی اور تجزیاتی نقاد اپنی بحث سے ایک نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''[2]

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تجزیہ اور تشریح دونوں کا تعلق تنقید سے ہے، لیکن دونوں میں فرق ہے۔ تجزیہ، تشریح سے آگے کی منزل ہے جس کا انداز تخصیصی و توضیحی ہوتا ہے اور یہ ادبی تنقید کا ایک اہم جزو ہے۔ تجزیہ نگار ایک طرح سے تنقیدی خیالات کے اظہار کا بھی فریضہ انجام دیتا ہے، اس لیے تجزیے کو تنقید ہی کا ایک طریقہ کار سمجھنا چاہیے، اور یوں تجزیہ اور تنقید دونوں ایک ہی عمل کے دو پہلو قرار پاتے ہیں۔ کوئی فن پارہ غزل ہے، نظم ہے یا کوئی دوسری صنف شعر، ادب میں اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اس کا فیصلہ تنقیدی نظریات کی روشنی میں کیا جاتا ہے مگر اس فن پارے میں کن وسائل کو استعمال میں لاکر اپنی بات کہی گئی ہے؟ یہ فیصلہ تجزیاتی اصولوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ معنوی اعتبار سے تنقید و تجزیہ میں نمایاں فرق ہے۔ تنقید کے لغوی معنی پرکھنے، یا برے بھلے کا فرق معلوم کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں محاسن اور معائب کا صحیح اندازہ کرنے اور اس پر کوئی رائے قائم کرنے کے ہیں۔

۱۔ شاعر، ماہ نامہ بمبئی، جنوری ۱۹۵۶ء، ص:۲۱

۲۔ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات۔ شارب ردولوی، ص:۴۶۶

انگریزی میں تنقید کے لیے لفظ 'Criticism' کا استعمال کیا جاتا ہے، اس کے معنی 'عدل یا انصاف' کے ہیں۔ عبادت بریلوی نے تشریح وتنقید کے مابین فرق کو اس طرح واضح کیا ہے:

''ادب یا فن کی تشریح بہت معمولی سا کام ہے۔ اس میں وہ ہمہ گیری نہیں اور اس کے حدود میں وسعت اور پھیلاؤ نہیں جو تنقید کے لیے ضروری ہے۔ تشریح، تنقید کا صرف ایک رُخ اور ایک پہلو ہے۔ تنقید اس منزل سے گزرتی ضرور ہے لیکن یہیں پر رک نہیں جاتی بلکہ آگے بڑھتی ہے۔''[1]

شرح کے ساتھ ساتھ تعبیر، تفسیر، تفہیم، تشریح فن پارے پر اظہار خیال کے آلے ہیں۔ معنوی اعتبار سے یہ سب الفاظ واصطلاحات جدا ہیں، لیکن ان کا مقصد کسی متن کے معنی بیان کرنا، اس کی وضاحت کرنا، اس کے مطالب کو کھول کھول کر کہنا ہے۔ جزوی اعتبار سے ان میں محض اتنا فرق ہے کہ 'شرح' میں متن کی صرف وضاحت ہی نہیں ہوتی بلکہ اس پر اظہار رائے یعنی اس کے بارے میں اقداری فیصلہ بھی ہوتا ہے۔

'تفہیم' سے مراد کسی متن کے معنی اس طرح بیان کرنا کہ وہ عام قارئین کی بھی سمجھ میں آجائیں۔ پروفیسر قاضی افضال حسین، علم ''شرح، تعبیر اور تدریس متن'' کے پیش لفظ میں کہتے ہیں کہ:

''تفہیم ایک داخلی تجربہ قرار پاتی ہے جو تعبیر و تجزیہ سے ماورا ہے، اس لیے یہ تنقید زبان کے طرز وجود سے واقفیت، معنی خیزی کے وسائل کی دریافت اور تشکیل معنی میں قاری کے کردار کی نوعیت پر گفتگو سے گریز کرتی ہے.... جب ہم کسی فن پارے کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اصلاً ہم اس کی تعبیر کر رہے ہوتے ہیں۔ سمجھنا اور تعبیر بیان کرنا ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں اس لیے تفہیم کے مدارج تعبیر کی نوعیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''[2]

۱۔ اردو تنقید کا ارتقا۔ عبادت بریلوی، ص:۱۶

۲۔ مشمولہ علم شرح، تعبیر اور تدریس متن۔ مرتبہ پروفیسر نعیم احمد، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص:۱۵

'تعبیر' کو خصوصاً خوابوں سے جوڑا جاتا ہے۔ تفہیم کی طرح تعبیر بھی متن کے تجزیاتی مطالعے کا ہی نام ہے۔ تعبیر کا فن اور اس کے اصول 'علم شرح' کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہ معنی کی تہیں کھولنے کا عمل ہے۔ تعبیر، قرأت اور تنقید کی درمیانی کڑی ہے۔ کسی متن کے معنی بیان کرنا یعنی اس کی تعبیر کرنا ایک ذاتی عمل ہے جس میں ذاتی فیصلے کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا کام شعری مشکلات کو دور کرنا، ابہام کے پردے اُٹھانا، معنیاتی گتھیوں کو سلجھانا ہے۔ تعبیر، تشریح اور تجزیہ معنی خیز اسی وقت بنتے ہیں جب فن پارے میں معنوی تہہ داری ہو، تعبیراتی تنقید کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نقاد کے علم، بصیرت اور ذہانت کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ تجزیہ میں تشریح، تعبیر، تفہیم اور تفسیر سب کے اجزا شامل ہوتے ہیں۔ وارث علوی نے تعبیر و تشریح کے فرق کو اپنے مخصوص ایمائی لہجہ اور خوب صورت تشبیہات و استعارات کی مدد سے واضح کیا ہے:

> ''تشریح ایک شرمیلی خاتون کی مانند کم سخن ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو کسی علامت، کسی اسطور، کسی تلمیح کی طرف دبے لفظوں سے اشارہ کر کے آنکھیں جھکا لیتی ہے.... تشریح کے برعکس تعبیر ایک خودسر خود پسند مغرور حسینہ ہے.... متن کے پہلو میں اپنے سوا کسی اور معنی کا وجود برداشت کر نہیں سکتی۔''[1]

''تفسیر'' کو مذہبیات سے منسلک کیا جاتا ہے۔ اس کا مادّہ ''فَسَر'' ہے، جس کے معنی ہیں واضح کرنا، ظاہر کرنا، ڈھکے ہوئے کو کھول دینا۔ تفسیر، عمومی طور پر اسلامیات کی اصطلاح ہے اور عام طور پر قرآن و حدیث کی شرح کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ چوں کہ اس کا تعلق مذہبیات سے ہے اس لیے اسے دوسرے مقدس متون کی شرح کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً انجیل کی تفسیر، گیتا کی تفسیر وغیرہ۔ قرآن کریم کی تفسیریں متعدد ناموں سے اور متعدد علما حضرات نے لکھیں۔ ان میں سے بیسویں صدی کی چند تفاسیر درج ذیل ہیں:

بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی
معارف القرآن	مولانا مفتی محمد شفیع
تفہیم القرآن	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
تدبر القرآن	مولانا سید امین احسن اصلاحی

۱۔ افسانہ کی تعبیر اور تشریح - چند مسائل۔ وارث علوی، مشمولہ علم شرح، تعبیر اور تدریس متن۔ مرتبہ پروفیسر نعیم احمد، ص: ۱۶۵۔۱۶۶

اسی طرح تبصرہ بھی شرحیات کی ہی ایک کڑی ہے۔ تبصرہ دراصل کسی کتاب، جریدہ یا ادب پارے کا تنقیدی تعارف ہوتا ہے۔ اس میں مختصراً تصنیف کے محاسن اور معائب پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس کی اہم خصوصیات بیان کی جاتی ہیں اور مصنف کے نقطۂ نظر کی وضاحت بھی کی جاتی ہے جس سے اس کے بارے میں ایک عام رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں غیر جانب داری بہت اہمیت رکھتی ہے اور یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ تبصرہ، دیباچہ یا تقریظ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح تبصرے اور تنقیدی مضمون میں بھی واضح فرق ہوتا ہے۔ یہ ایک لمحاتی اور فوری چیز ہوتی ہے۔ تبصرہ عموماً کسی کتاب کا لکھا جاتا ہے اور اس غرض سے لکھا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کتابوں اور ان کے موضوعات سے واقف ہو جائیں، گویا تبصرہ ایک طرح سے تعارف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تنقید میں محاسن و معائب کو تجزیے کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

○○○

باب دوم

''کلامِ اقبال کے اہم تجزیہ نگار اور ان کے تنقیدی رویے''

☆ اسلوب احمد انصاری

☆ رفیع الدین ہاشمی

☆ آل احمد سرور

☆ عبدالمغنی

☆ عابد علی عابد

☆ مسعود حسین خاں

☆ سید ابوالحسن علی ندوی

☆ محمد بدیع الزماں

☆ نورالحسن نقوی

☆ سید محمد ہاشم

علامہ اقبال اردو اور فارسی شعر و ادب کی ان چند نادر شخصیات میں سے ایک ہیں جن کی زندگی ہی میں ان کے شعری و فکری کارناموں کو قومی اور عالمی سطح پر بلند مقام حاصل ہو گیا تھا۔ وہ بیسویں صدی کے ایک بلند پایہ مفکر، مصلح اور عظیم شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے بلند خیالات اور انقلابی افکار کے اظہار کے لیے بہ یک وقت اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ اقبال نے اعلیٰ تعلیم مغرب میں حاصل کی۔ قیامِ یوروپ نے ان کے فکری ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے ماقبل کی تاریخ اور اپنے عہد کی تحریکات اور نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور مناسب حد تک ان کے اثرات بھی قبول کیے۔

وہ یوروپی مفکرین میں افلاطون، ارسطو، نطشے، ہیگل، برگساں، مارکس اور لینن وغیرہ سے اور مشرقی حکماء و فضلاء میں ابنِ عربی، ابنِ سینا، فارابی، شیخ احمد سرہندی، رومی، غزالی، سنائی اور عطار وغیرہ سے متاثر ہوئے اور ان سے نہ صرف استفادہ کیا تھا بلکہ ان میں سے بعض مغربی مفکرین سے وہ اتنے متاثر ہوئے تھے کہ ان کو انھوں نے دل کی گہرائی سے خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ مشرقی مفکرین و شعرا میں رومی کو اپنا مرشد بنایا۔ ان تمام بزرگوں کے افکار و خیالات پر اپنی گرفت بھی مضبوط رکھی اور ان سب کے اثر سے ہی ان کے یہاں قدیم فلسفے، اسلامی روایت، علم کلام اور مغرب کی فلسفیانہ تاریخ کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے وسیلے سے جو اہم تصورات و نظریات پیش کیے ان کا اثر بہت وسیع پیمانے پر ہوا۔ ان کے معاصرین اور شعرا نے ان کے گہرے اثرات قبول کیے اور مختلف انداز سے اس کی تقلید کی۔ اس کے علاوہ بعض دیگر مفکرین نے بھی ان کے خیالات کو قبول کر کے عمدگی کے ساتھ دوسروں تک منتقل کیا۔ اقبال کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی حیات و شاعری اور افکار و نظریات پر دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں تحقیقات و توضیحات اور تراجم و تشریحات کا سلسلہ ان ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا، جو بعد میں وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اب تو یہ بات کہنے میں تامل نہیں کہ اتنے کم عرصے میں اقبال کے علاوہ اردو کی کسی دوسری شخصیت پر تصانیف و مقالات کی شکل میں اتنا زبردست ادبی سرمایہ وجود میں نہیں آسکا، جس کا سبب یہ ہے کہ ان کے تصورات و نظریات، ان کے شعری کارناموں کے سبب اہلِ فکر و نظر اور ناقدینِ فن کو اپنے مطالعے کی طرف

متوجہ کرتے رہے ہیں اور اسی وجہ سے اردو اور فارسی میں اقبال شناسی کا پورا دبستان قائم ہو گیا۔ کلامِ اقبال کی طرح اقبال شناسی بھی برصغیر کی حدود عبور کر کے ایک ایسی عالمی روایت کا درجہ اختیار کر چکی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی رفعتوں اور نئی وسعتوں سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کے حوالے سے چند معروضات پیش کر دی جائیں۔

اقبالیات اور اقبال شناسی کی اصطلاحات پر غور کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبالیات اب ایک باقاعدہ شعبۂ علم بن چکا ہے جس میں اقبال کی شعری و فکری تصانیف، مقالات، مکاتیب اور خطبات و بیانات اور اقبال پر شائع ہونے والا پورا ادبی سرمایہ شامل ہے۔ جب کہ اقبال شناسی وہ علمی روایت ہے جس کی بنیاد اقبال کی حیات و افکار اور ان کے کلام کی تفہیم کے سلسلے میں کی جانے والی عالمانہ و ناقدانہ کاوشیں ہیں۔ اسی لیے اقبال شناسی کی روایت سے وابستہ اہلِ علم کو اقبال شناس، اقبال اسکالر یا ماہرِ اقبالیات کہا جاتا ہے۔ اقبالیات میں حیاتِ اقبال کے بعد بنیادی اہمیت ان کے تصورات و نظریات کو حاصل رہی ہے اور مجموعی طور پر اب تک اسی پہلو کو سب سے زیادہ موضوعِ تحقیق و تنقید بنایا گیا ہے۔ افکار و شعریاتِ اقبال کا دائرہ بہت وسیع ہے جو اُن کے سیاسی، مذہبی، ادبی اور فلسفیانہ خیالات پر محیط ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کی شخصیت، ان کے پیغام اور فکر و فن پر اب تک سینکڑوں کتابیں اور بے شمار مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک میں اقبال شناسوں کی بڑی تعداد تو ہے ہی، لیکن ان کے علاوہ دیگر ممالک کے مشرقی و مغربی اسکالرز نے بھی اقبال شناسی میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں اور ان کی تفہیم و تعبیر میں بڑی دقتِ نظر کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے سوانحی حالات، فلسفیانہ خیالات اور فکری سرچشموں پر توجہ صَرف کی ہے۔ چنانچہ اقبال کی ذاتی زندگی اور خانگی حالات کے سلسلے میں جو کتابیں خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں ان میں ذکرِ اقبال، روزگارِ فقیر اور زندہ رود شامل ہیں۔ اسی طرح ان کے فکر و فن سے متعلق پاکستان میں لکھی جانے والی اعلیٰ درجے کی تصانیف کے علاوہ عبدالمغنی کی کتاب ''اقبال کا نظامِ فن'' گوپی چند نارنگ کی 'اقبال کا فن'، مغنی تبسم کی 'اقبال اور فکرِ اقبال'، رشید احمد صدیقی کی 'اقبال شخصیت اور شاعر'، رفیع الدین ہاشمی کی 'اقبال بحیثیت شاعر' وغیرہ بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مذہبی اور صوفیانہ خیالات پر الگ سے بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ ان میں ابواللیث صدیقی کی 'اقبال اور مسلکِ تصوف'، عبدالمغنی

کی 'اقبال کا نظریۂ خودی'، ابومحمد مصلح کی 'قرآن اور اقبال'، سید ابوالحسن علی ندوی کی 'روائع اقبال' (ترجمہ: 'نقوشِ اقبال') اور اقبال اکادمی لاہور اور اقبال انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والی دیگر بہت سی قابلِ قدر تصانیف شامل ہیں۔

مغربی مفکرین اور غیر ملکی زبانوں میں اقبال کے فکر و فن پر متعدد اسکالرز نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان میں 'نکلسن' سے لے کر 'انا مری شمل' تک مغربی قدر شناسوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنھوں نے کلامِ اقبال اور فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کر کے اقبال شناسی کا حلقہ وسیع تر کر دیا۔ اہلِ مغرب نے اقبال کی زندگی ہی میں ان کے شعری و نثری افکار کا خیر مقدم کیا اور ان کے خیالات کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا تھا۔ اقبال کا خود کا معاملہ بھی یہی تھا۔ اوّلاً انھوں نے اپنے تعلیمی سفر ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء میں مغربی اساتذہ سے کسبِ فیض کیا، ان کے گہرے اثرات بھی قبول کیے اور اس کا اعتراف بھی کیا اور اس کے بعد اس مطالعے اور اثر پذیری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ لاہور کی اعلیٰ تعلیم اور انگلستان کے دورانِ قیام پروفیسر تھامس آرنالڈ جیسے استاد کی جوہر شناسی، رہنمائی اور سرپرستی اقبال کی ان کے ساتھ سچی وابستگی کا ثبوت تھی۔ پروفیسر نکلسن، ای.ایم.فاسٹر، سر ہربرٹ ریڈ اور ڈاکٹر انا مری شمل کا شمار ان مغربی مفکرین میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے اقبال کا بہت سنجیدگی اور کثیر جہتی سے مطالعہ کر کے اقبال شناسی کے جوہر دکھائے اور اس موضوع پر بعض نئے گوشے روشن کیے۔ ان حضرات کی تصانیف و مقالات اس کے شاہد ہیں۔

کلامِ اقبال، موضوع کے اعتبار سے تنوع، رنگارنگی اور ہمہ جہتی سے معمور ہے۔ اس میں دقیق و فلسفیانہ موضوعات پر سادگی و پرکاری سے بھرپور بہ کثرت نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ان کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے کلامِ اقبال کی شروح کا سلسلہ شروع ہوا۔ شارحینِ اقبال میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، غلام رسول مہر، حمید یزدانی، اکبر حسین قریشی، عابد علی عابد، نسیم امروہوی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد تجزیہ نگاری کا عمل وجود میں آیا۔

ان تجزیہ نگاروں کی تعداد یوں تو کافی ہے لیکن ان میں سے بیش تر نے باقاعدہ طور پر اور سنجیدگی کے ساتھ اس طرف توجہ نہیں کی ہے بلکہ اقبال کی ادبی شخصیت سے متعلق اپنے افکار و خیالات پیش

کرتے ہوئے اور تنقیدی گفتگو کرتے ہوئے ضمناً ایک دو نظموں کا تجزیہ کر دیا ہے۔ لہٰذا ایسے حضرات اور قلم کاروں پر تفصیلی گفتگو تو نہیں ہو پائے گی بلکہ ان کی مجموعی کاوشوں پر کلام کرتے ہوئے ان کی ایک یا دو نظم کے تجزیوں پر مختصراً اظہارِ خیال کیا جائے گا۔ البتہ جن نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے باقاعدہ طور پر تجزیے کے فن کا لحاظ رکھتے ہوئے اقبال کی نظموں اور غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔ ان حضرات میں اسلوب احمد انصاری، عبدالمغنی، رفیع الدین ہاشمی، نورالحسن نقوی وغیرہ ایسے اوّل الذکر حضرات کی فہرست میں شامل ہیں۔ آل احمد سرور، وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، حامدی کاشمیری، صدیق جاوید، سید وقار عظیم، عابد علی عابد، مسعود حسین خاں، جابر علی سید، مغنی تبسم، سید ابوالحسن علی ندوی اور بدیع الزماں وغیرہ ہیں جنھوں نے اقبال کے فکر و فن پر باقاعدہ تصانیف پیش کی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ اقبال کی نظموں میں سے صرف دو چار نظموں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ محمد بدیع الزماں اور سید ابوالحسن علی ندوی 'علی میاں' نے اپنی تصانیف میں کلامِ اقبال کو قرآنی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

○

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

پروفیسر اسلوب احمد انصاری انگریزی اور اردو کے ممتاز اور منفرد نثر نگار اور نقاد ہیں۔ ان کا تعلق بنیادی طور پر انگریزی زبان و ادب کے مطالعات سے ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے پروفیسر اور ایک عرصے تک صدر شعبہ بھی رہے تھے۔ انگریزی ادبیات و تنقید پر انھوں نے شروع سے ہی غور و خوض کیا تھا۔ غالباً اسی زمانے سے اسلوب صاحب نے انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب کا بھی مطالعہ کیا جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ اس کے علاوہ فارسی و عربی سے بھی انھوں نے باقاعدہ طور پر کافی واقفیت حاصل کی تھی۔

اسلوب صاحب کا تعلق سہارن پور کے ایک علمی گھرانے سے تھا جو پچھلے طویل عرصے سے علماء و فضلاء کا مسکن رہا ہے۔ اس لیے اس علمی وراثت کا اثر اسلوب صاحب پر نظر آتا ہے۔ اسلوب صاحب کی ولادت ۱۹۲۵ء میں دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں پر ہوئی۔ وہیں سے ۱۹۳۹ء میں ہائی اسکول کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ آ گئے۔ یہاں انھوں نے انٹرمیڈیٹ اور بی.اے کیا۔ بی.اے میں انھوں نے انگریزی کے ساتھ ساتھ اختیاری مضمون کے طور پر فلسفہ کا انتخاب کیا اور پروفیسر ظفر الحسن جو آکسفورڈ کے سند یافتہ تھے، ان سے استفادہ کیا۔ علی گڑھ سے ایم.اے انگریزی میں کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انھوں نے دوبارہ گریجویشن کیا اور یہاں کے شعبۂ انگریزی میں لکچرر ہو گئے۔ طویل عرصے تک یہاں امتیازی شان کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیں اور ترقی کرتے کرتے وہ پروفیسر اور صدر شعبہ کے منصب تک پہنچے اور اسی عہدے سے ۱۹۸۵ء میں سبک دوش ہوئے۔ اسلوب صاحب اردو و انگریزی کے علمی و ادبی حلقوں میں اپنی ہمہ گیر و پُر وقار شخصیت کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ ظاہر ہے پیشہ کی مناسبت سے ان کا خاص میدان انگریزی تھا، اسی

کے توسط سے انھوں نے عالمی ادب کے بہ کثرت شاہکاروں کا بھی مطالعہ کیا جس کا فائدہ یہ پہنچا کہ مشرقی و مغربی زبانوں کے ادبیات عالیہ کے مطالعے نے ان کے ذہن وفکر کو بہت روشن اور بلند کر دیا۔ موصوف نے انگریزی ادب میں 'شیکسپیئر' اور 'ولیم بلیک' پر مضامین اور کتابیں لکھیں۔ شیکسپیئر ان کے مطالعے کا خاص موضوع رہا ہے۔ بلیک پر ان کی دو کتابیں امریکہ میں شائع ہوئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ورڈز ورتھ، ملٹن، کیٹس اور ایلیٹ کو بھی اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔

انگریزی میں ان کے کاموں کی وقعت اور قدر و منزلت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ایک کتاب "Arrows of intellect" جو ۱۹۶۵ء میں ہندوستان میں چھپی تھی، ۱۹۷۰ء میں امریکہ سے شائع ہوئی۔ ان کی ایک اور کتاب "Prophecies William Blake's Minor" کی اشاعت ۲۰۰۱ء میں انگلینڈ، امریکہ اور کناڈا سے عمل میں آئی۔ اسلوب صاحب کی انگریزی کتابوں نے انھیں انگریزی مصنّفین کی اس صف میں جگہ عطا کی جو بہت کم ہندوستانی مصنّفین کو نصیب ہوئی۔ موصوف ایک عرصہ تک پابندی کے ساتھ انگریزی میں ایک رسالہ "The Aligarh Critical Miscellany" بھی نکالتے رہے۔ انگریزی ادبیات میں اپنے اس قابلِ فخر امتیاز کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو شعر و ادب کی پرکھ کے لیے فارسی و عربی سے بھی اخذ و استفادہ کیا۔ اس طرح انھوں نے ادب کی مغربی و مشرقی روایت کے مابین توازن و اعتدال قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

اردو کے متعدد علماء، نقادوں اور دانش وروں نے اسلوب صاحب کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف کیا ہے، مثال کے طور پر فراق گورکھ پوری نے اپنے پہلے شعری مجموعہ 'گلِ نغمہ' میں اسلوب صاحب کے 'تنقیدی مضمون' کو بہ طور دیباچہ شامل کیا۔ اس کے علاوہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے 'کاغذی پیرہن' کا پیش لفظ بھی اسلوب صاحب نے لکھا۔ کلاسیکل لٹریچر میں انھیں 'غالب اور اقبال' نے سب سے زیادہ متاثر کیا، اس کے علاوہ ترقی پسند شاعروں میں وہ 'مجروح' کے قائل نظر آتے ہیں۔ جدید شعرا میں ناصر کاظمی، منیر نیازی، احمد مشتاق اور شکیب جلالی ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ موصوف کے قلم میں روانی، پختگی اور ان کا مخصوص اسلوب بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی تصانیف اور علمی کارناموں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان سے اسلوب صاحب کی شخصیت اور علمی استعداد کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتابوں کی تصنیف و تالیف اور

ترجمہ وترتیب کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو اور انگریزی کے دو اہم معیاری جرائد کی نگرانی اور اشاعت کا جس طرح اہتمام کیا، اسے مشرق و مغرب کے علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ "Aligarh Journal of English Studies" کا اجرا اسلوب صاحب کا ایک یادگار کارنامہ ہے جس کے تقریباً ہر شمارے میں ممتاز انگریز اور امریکی نقادوں کے اہم مقالے شامل ہوتے تھے۔ اس کے ہر شمارے میں اسلوب صاحب کا اپنا مقالہ بھی ہوتا تھا۔ ان کے بیش تر مقالات میں شیکسپیئر اور دیگر مغربی نقادوں کے فکر وفن کو مربوط طریقے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مقالات کی انگلستان، امریکہ اور دیگر ممالک میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

شعبۂ انگریزی سے سبک دوشی کے بعد انھوں نے ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۰ء تک "The Aligarh Miscellany" کے نام سے بارہ سال تک دوسرا انگریزی رسالہ نکالا۔ اس میں بھی ممتاز علما اور ناقدین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان رسالوں میں اپنے انگریزی تبصروں کو اسلوب صاحب نے Glimpses of Books کے نام سے یکجا کر دیا۔

اردو ادب وتنقید میں ان کا جاری کردہ سہ ماہی مجلّہ 'نقد ونظر' اپنے امتیاز وانفرادیت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت کا حامل تھا، یہ ۱۹۷۹ء سے ۲۰۰۰ء تک انھوں نے بہت پابندی سے نکالا۔ وہ خود بھی تنقیدی وتجزیاتی مضامین لکھتے تھے اور انگریزی اور اردو کے دیگر علما و نقادوں کے اسی طرح کے مضامین وتبصرے شامل کرتے تھے۔ اس رسالے کا معیار بہت بلند تھا۔ دیگر امتیازات کے ساتھ ساتھ اس رسالے کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس میں اقبالیات کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ نقد ونظر کے اداریوں میں مختلف موضوعات پر بہت فکر انگیز مضامین تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلوب صاحب معروف افسانہ نگاروں پر مضامین بھی نقد ونظر کے اداریوں میں شامل کرتے تھے۔ بعد میں ان اداریوں کا مجموعہ 'حرفے چند' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں اس رسالے کے ۴۳ اداریے شامل ہیں۔ یہ اداریے بڑے عالمانہ اور ادبی فن پارے کی شان رکھتے ہیں۔ پروفیسر انصاری کے جو عالمانہ تبصرے اس مجلّہ میں شائع ہوئے ان کا ایک انتخاب 'تنقیدی تبصرے' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں نوّے کتابوں پر تبصرے ہیں۔

اپنے دیگر معاصرین کے مقابلے میں اسلوب صاحب کو متن کے تجزیے سے سب سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا نقد و نظر کے شماروں میں مختلف شعرا کے تجزیے اسلوب صاحب نے خود بھی کیے اور دوسروں سے بھی کرائے۔ نقد و نظر میں غزل کے ان تجزیوں کا انتخاب دو جلدوں میں 'غزل تنقید' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب ولی دکنی سے اقبال اور مابعد اقبال تک دو جلدوں میں شائع ہوئی جس میں ۱۱۳ غزلوں کے تجزیے شامل ہیں۔ ان میں تقریباً ۳۶ تجزیے خود اسلوب صاحب کے پیش کردہ ہیں۔ اس پر انھوں نے ایک جامع مفصل مقدمہ لکھا ہے، جس میں غزل کے معانی و مفاہیم کے مختلف اہم اور نازک گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اردو کے نامور شعرا کے کلام کی تفہیم و تعبیر میں یہ ایک وقیع کارنامہ ہے۔

اسلوب صاحب کی پہلی اردو کتاب 'ادب اور تنقید' ہے جو ۱۹۶۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں اسلوب صاحب اپنی تمام تر تنقیدی صلاحیت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئے۔ اس کتاب میں انھوں نے شعری صداقت، سائنٹفک نظریۂ تنقید، ادب کی قدریں، ادبی تنقید کے چند مسائل، نثر کا آہنگ جیسے متعدد موضوعات پر مضامین شامل کیے ہیں۔ اسلوب صاحب بلاشبہ اردو کے ایک قد آور اور ناقد اور ہمہ جہت عالم ہیں۔ انھوں نے نثر و نظم دونوں پر اپنی تنقیدی مہارت کے انتہائی قابلِ قدر کارنامے پیش کیے ہیں، بظاہر ان کی تنقید کا خاص دائرہ شاعری ہے۔ ان کی نثری تصانیف کے مطالعے سے عالمانہ بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے نثر میں متعدد قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں، چنانچہ تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ان کی کتاب 'اردو کے پندرہ ناول' فکشن پر ان کی گہری نظر کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس میں انھوں نے اردو کے معتبر قدیم و جدید ناول نگاروں کی نمائندہ تخلیقات کا محاکمہ کیا ہے۔ پیش لفظ میں پروفیسر انصاری نے انگریزی فکشن اور معاصر اردو ناول کے اہم نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں جو ناول ان کی توجہ کا مرکز بنے، ان میں امراؤ جان ادا، میدانِ عمل، آگ کا دریا، اُداس نسلیں، آنگن اور ایوانِ غزل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کتاب نے اردو ناول کی تنقید کا ایک خاص معیار قائم کیا ہے۔

اسلوب صاحب کا ایک خاص میدان اپنے بزرگوں اور معاصرین کی شخصیات پر تاثرات کا اظہار کرنا بھی ہے، جس نے بعد میں خاکوں کی شکل اختیار کر لی اور وہ ۱۹۹۰ کے بعد کے اہم خاکہ نگاروں میں

شامل ہوگئے۔ وہ اردو کے ممتاز انشائیہ نگار اور طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی کے شیدائیوں میں سے ہیں۔ وہ رشید صاحب کو علی گڑھ کا مغنی اور اردو کا ایک بڑا مرقع نگار مانتے ہیں اور ان کی مزاح نگاری کے بھی قائل ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے ممدوح کو نہ صرف خراجِ عقیدت پیش کیا بلکہ ان کے طنز و مزاح، خطوط نگاری اور تنقیدی تحریروں کا معروضی طور پر جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے انگریزی کے استاد خواجہ منظور حسین سے بھی بہت متاثر تھے۔ انھوں نے بڑے والہانہ انداز اور ادب و شائستگی سے بھرپور انداز میں تفصیلی طور پر ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ خواجہ صاحب کے انتقال سے عرصہ تک نہایت ملول رہے اور 'نذرِ منظور' لکھ کر گویا انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ کتاب تین سو صفحات پر مشتمل ہے، اس میں اسلوب صاحب کے علاوہ دوسرے بڑے جید نقادوں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اس میں اسلوب صاحب نے اپنے ایک مضمون 'ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے' میں ان کی بڑی موثر تصویر پیش کی ہے۔ اس مضمون کو اسلوب صاحب نے اپنے خاکوں کے مجموعے 'آئینہ خانے میں' بھی شامل کیا ہے۔ موخر الذکر کتاب میں انھوں نے دس افراد کی 'شخصیت' اور ان کے 'ادبی کاموں' سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے اسلوب صاحب کے نقطۂ نظر سے ان اشخاص کی زندگی کے نمائندہ پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ اس میں انھوں نے 'خواجہ منظور حسین' کے ساتھ مولانا ضیاء احمد بدایونی، مالک رام، خلیق احمد نظامی، آل احمد سرور پر بھی مضامین قلم بند کیے ہیں۔

اسلوب صاحب کے پسندیدہ شاعر دو ہیں غالب اور اقبال۔ غالب کی شاعری ان کی خاص دلچسپی کا مرکز ہے۔ شاعر سے متعلق ان کا پہلا مضمون 'کلامِ غالب کا ایک رُخ' کے نام سے منظر عام پر آیا، یہ گویا غالب تنقید کی تاریخ کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد غالب پر متعدد مضامین شائع ہوئے۔ اس مضمون کی ایک خاص اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد غالب کے مغربی شعرا سے تجزیاتی تقابل و موازنہ کی روایت شروع ہوئی۔ غالب کے متعلق اسلوب صاحب کے مضامین کا پہلا مجموعہ 'نقشِ غالب' کے نام سے شائع ہوا۔ اس عظیم شاعر کے بارے میں مضامین کے علاوہ انھوں نے دو اہم کتابیں بھی لکھیں۔ 'غالب: نقش ہائے رنگ رنگ' اور 'غالب جدید تنقیدی تناظرات'۔ ان کتابوں میں ان کے ادبی سرمایے کے تقریباً ہر پہلو کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ 'خطوطِ غالب' میں 'نفس کی جھلکیاں' کے عنوان

سے اسلوب صاحب کا مضمون غالب تنقید میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود مضامین لکھنے کے علاوہ اسلوب صاحب نے نقد و نظر کے لیے اپنے معاون قلم کاروں سے بھی غالب پر مضامین لکھوائے اور نقد و نظر کا غالب نمبر شائع کیا۔ اس کے علاوہ اسلوب صاحب نے اپنی کتاب 'نذرِ منظور' میں بھی غالب سے متعلق ایک مضمون شامل کیا۔

اسلوب صاحب کا اصل اور پسندیدہ موضوع 'اقبالیات' ہے۔ ان کا شمار محض مطالعۂ شاعری یا روایتی طور پر اقبال کے لکھنے والوں میں نہیں ہوتا بلکہ وہ 'عاشقینِ اقبال' میں تصور کیے جاتے ہیں اور ان کی فکر، فلسفہ اور سیاسی نظریہ سے کلیتاً اتفاق رکھتے ہیں۔ اسلوب صاحب اقبال کو تمام عالمی شعرا سے عظیم تر سمجھتے ہیں۔ اس عظمت کی وجہ وہ ان کی شاعری کے اعلیٰ مابعد الطبیعاتی ادراک کو قرار دیتے ہیں۔

اقبال سے اسلوب صاحب کی دلچسپی کی ابتدا ان کی بالکل اوائل عمری سے ہوئی۔ محض پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے 'اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا، جو رسالہ 'جامعہ' میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ اقبال سے اسلوب صاحب کے تعلق کی غیر معمولی ابتدا تھی اور آج بھی اتنی مدت اور عمر کی اتنی منزلیں گزر جانے کے باوجود اقبالیات کے سلسلے میں اسلوب صاحب کے ذوق و شوق کا یہی عالم ہے۔ شش ماہی رسالہ 'نقد و نظر' کے دیگر امتیازات کے ساتھ ساتھ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں 'اقبالیات' کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ پہلے ہی شمارے کے اداریے میں اسلوب صاحب نے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ ''اس رسالے کا خاص پہلو یہ ہوگا کہ اس میں اقبالیات کے مطالعے کو خصوصی اہمیت دی جائے گی۔'' لہٰذا نقد و نظر کے بہت سے اداریے کلامِ اقبال کے امتیازات اور فنی محاسن کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کے علاوہ نقد و نظر کے چار مخصوص شماروں پر مشتمل اقبال نمبر شائع ہوئے۔ نقد و نظر میں شائع شدہ مضامین اور اقبال نمبر میں سے مخصوص مضامین منتخب کر کے اسلوب صاحب نے 'اقبال: جدید تنقیدی تناظرات' کے نام سے کتاب شائع کی۔ افتتاحیہ کے عنوان سے اسلوب صاحب کا مقدمہ خاص طور پر لائقِ تحسین ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات پر انھوں نے اقبال کی شاعری کے بنیادی محرکات کو قلم بند کیا ہے جس میں خودی، فقر، انسانی وجود کے اسرار، خدا، ابلیس اور خضر وغیرہ کی استعاراتی معنویت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ فکر انگیز ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ بہر حال یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کی شاعری

سے متعلق مضامین، اسلوب صاحب کی علمی کاوشوں میں مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پر لکھی دوسری کتابوں کے مقابلے میں پروفیسر انصاری کی کتابیں زیادہ تجزیاتی، معروضی اور علمی ہیں۔

اس کے علاوہ موصوف کی مرتب کردہ 'نذرِ منظور' میں بھی اقبال پر مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام تحریریں اقبال سے اسلوب صاحب کی غیر معمولی دلچسپی کا بین ثبوت ہیں۔ 'اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں' اور 'نقشِ اقبال' بھی اقبالیات سے ان کی شیفتگی اور اس کے فکر و فن سے گہری آگہی اور شغف کی آئینہ دار ہیں۔ نظموں کے علاوہ اردو اور فارسی کی نمائندہ غزلوں کے تجزیوں کو کتاب میں شامل کر کے 'اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں' کی افادیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔ اقبال کی غزلوں کے تجزیوں میں بھی اُمتِ مسلمہ کے ملّی مسائل اور مابعد الطبیعاتی پہلوؤں کو روشن کر کے اسلوب صاحب نے شاعر کے تخلیقی ذہن اور ان کی بنیادی تھیم کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اردو شاعری میں کلامِ اقبال کی معنویت کے ضمن میں اسلوب صاحب فرماتے ہیں کہ:

> ''اردو شاعری کے Cannon میں اقبال کی غزلیں ایک نہایت اہم اور امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔ اپنی اعلیٰ شعری فطانت اور تخلیقیت کے بل بوتے پر انھوں نے غزل کے رنگ و آہنگ میں ایسی نمایاں تبدیلی پیدا کر دی جس کا سان و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ایک گونہ مماثلت نظر آتی ہے تو اس کا بدیہی سبب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک واحد غیر منقسم شعورِ حسیت کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ یعنی ان کا مخرج ایک ہی ہے، ان کی غزل کی شاعری ان کے پروازِ تخیل، فکری وفورِ ثروت اور ژرف نگاہی (Perspicacity) اور شخصیت کے ترنم و تموج کی آفریدہ ہے۔''[1]

'نقشِ اقبال' کے مضامین میں اقبال کا نظریۂ وجدان اور تصورِ فقر خاص طور پر لائقِ توجہ ہیں۔ اس میں ایک اور اہم موضوع 'غالب اور اقبال' کے عنوان سے ہے۔ جس میں انھوں نے غالب اور اقبال کے مابین امتیاز کو واضح کیا ہے۔ اقبال سے متعلق ان کی کتابوں میں 'اقبال: حرف و معنی' اقبالیات کے سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس سے اقبال کی فکر و فن کی بہت سی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ اس کتاب کا ایک

۱۔ اقبال: جدید تنقیدی تناظرات۔ اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۳

فکرانگیز مضمون 'اقبال کی اسطوری نظمیں' ہے، یہ کلامِ اقبال کا ایسا پہلو ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اقبال 'حرف و معنی' اپنے مضامین کے پیشِ نظر اقبالیات میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ کلامِ اقبال کے تجزیے اور تشریح کے سلسلے میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا بنیادی موقف یہ ہے کہ ''قرآنی تعلیمات اور اسلامی افکار سے صَرفِ نظر کر کے اقبال کی شاعرانہ عظمت تک نہ تو رسائی ممکن ہے اور نہ ہی ان کے کلام کی پیچیدہ تعمیری ساخت کو پورے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔''

اقبال کے سوسالہ جشنِ تقریبات کے موقع پر انھوں نے اقبال پر مختلف لوگوں کے مضامین کا ایک مجموعہ "Iqbal: Essays and Studies" کے نام سے بھی شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے فلسفۂ اقبال اور فلسفۂ وجودیت کے مابین مماثلت پر روشنی ڈالی ہے۔

اسلوب صاحب اقبال کی شاعری پر جب تبصرہ کرتے ہیں تو وہ ان کی شاعری، ان کی فکر، دنیا و آخرت سے متعلق ان کے نظریے من و تو کے فلسفے، ان کی سیاست، ان کے معاشی نظریے، پیغامِ انقلاب، معرفت، وجدان اور تعمیرِ خودی پر اپنے مزاج کے مطابق نہایت موثر گفتگو کرتے ہیں۔ اسلوب صاحب کی حیثیت اقبال شناسوں میں اس لیے بھی منفرد و ممتاز ہے۔ کیوں کہ ماہرینِ اقبالیات میں بہت کم لوگوں نے ان کی نظموں کے تجزیے کیے ہیں اور جن لوگوں نے کیے بھی ہیں وہ صرف ایک یا دو نظموں تک محدود رہے ہیں۔ اسلوب صاحب نے ایک دو نہیں بلکہ اقبال کی بہت سی نظموں کے تجزیے کیے اور ان کے فکری و فنی امتیازات روشن کیے اور تاثراتی یا تصوراتی گفتگو کرنے کے بجائے متن کی مثالوں سے ان کی نظموں کے امتیازات منکشف کیے۔ اقبال کے تصورات اور فنی محاسن کے محاکے میں اسلوب صاحب نے تجزیاتی انداز اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب صاحب کی تحریریں تازہ کار اور منفرد محسوس ہوتی ہیں۔ تفہیمِ اقبال کے لیے اسلوب صاحب ان کے انگریزی خطبات کے مطالعہ کو بھی ضروری قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''وہ خطبات جن میں اسلام کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید کو مرکز نگاہ بنایا گیا ہے اور جو ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کا حکم رکھتے ہیں، بہت اہم اور

دلچسپ روشنی ڈالتے ہیں اور بسا اوقات شیشۂ برق کی مانند ان کا مفہوم نظروں کے سامنے روشن کر دیتے ہیں۔ ان کے مطالعے کے بغیر بعض نظموں کے فکری تناظر اور اقبال کے ذہن پر جدید مسائل کے پیدا کردہ تصادم کو سمجھنا خاصا دشوار ہے۔ اس اصول کا اطلاق کم و بیش غزلوں پر بھی ہوتا ہے۔"[1]

ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے اسلوب صاحب کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اقبال سے جذباتی تعلق کے باوجود، شاعر کے محاکمے اور تعیینِ قدر میں ان کا رویہ تجزیاتی اور استدلالی ہوتا ہے۔ اسلوب صاحب کی کتابوں سے اقبالیات کے سرمایے میں نہ صرف وقیع اضافہ ہوا ہے بلکہ مطالعاتِ اقبال کی متعدد نئی راہیں بھی کھلی ہیں۔

گزشتہ سطور میں اسلوب احمد انصاری کے جن علمی، تنقیدی اور تجزیاتی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، اس سے موصوف کے تنقیدی رویوں پر واضح روشنی پڑتی ہے اور وہ اردو کے ایک منفرد و ممتاز اور بے مثال نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک طرف عربی و فارسی نقد و شعر پر بھرپور قدرت و مہارت رکھتے ہیں تو دوسری طرف انگریزی کے بزرگ پروفیسر اور انگریزی شعر و ادب کے ممتاز نقاد ہونے کے سبب مغربی و مشرقی تنقید کے جامع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ اردو ادبیات کا مطالعہ کرنے والے حضرات بالعموم یک نوعی نقاد ہوتے ہیں۔ خالص مغربی یا خالص مشرقی - عربی، فارسی اور اردو کے عالموں نے شعر و شاعری کی ماہیت اور مسائل پر جو کچھ لکھا ہے، اسلوب صاحب نے اس سے قطعِ نظر اپنے تنقیدی جائزوں میں انگریزی کے اکابر نقادوں سے بھی استفادہ کیا ہے اور اپنی بعض تحریروں میں اس کے حوالے بھی دیے ہیں، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اردو شعر و ادب کی تفہیم اور قدر شناسی کے لیے مغربی معیاروں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں انگریزی لفظیات کا بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بڑی خدمت انھوں نے یہ بھی انجام دی کہ انگریزی کی ادبی اصطلاحات کو استعمال کرتے ہوئے اردو میں ان کا ترجمہ بھی پیش کیا۔

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص: ۴

اسلوب صاحب نے نہایت متفرق مضامین و موضوعات اور مسائل کو اپنے احاطۂ تحریر میں لیا ہے۔ پروفیسر انصاری بہت نپے تلے جملے لکھتے ہیں اور تکلف کے بغیر اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں۔ 'تنقیدی تبصرے' ان کے ایسے ہی مطالعات کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے بے لاگ تبصرے کیے ہیں۔

ان تبصروں کے علاوہ اسلوب صاحب نے مختلف شخصیات پر لکھے ہوئے خاکوں میں بھی ان میں پائی جانے والی مختلف النوع صفات کے بیان کے ساتھ ساتھ ان میں پائی جانے والی بشری خامیوں اور کمزوریوں کو بیان کرنے میں بہت صاف گوئی سے کام لیا ہے اور کسی مصلحت اندیشی کو روا نہیں رکھا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے عظیم دانش وروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ آل احمد سرور کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''منافقت، کینہ پروری اور ایذا رسانی ان کی شخصیت کا جزوِ اعظم تھی۔ اس سے انھیں بڑی تسکین اور راحت ملتی تھی، لیکن وہ اپنی تواضع اور بزم سخنی کا رویہ بھی قائم رکھتے تھے۔ ان کے انداز میں بڑی شگفتگی اور شیرینی تھی شاید ایک چمچہ شکر سے کچھ زیادہ ہی۔ وہ چوں کہ جم کر اور پتہ مار کر کام کرنے کے بالطبع عادی نہیں تھے اس لیے کسی بھی کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔''[1]

دوسری جانب خواجہ منظور حسین کی خوبیوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''کُرتے اور چوڑی دار پائجامے میں ملبوس، میانہ قد، گٹھا گٹھا ہوا جسم، کشادہ پیشانی، سرخ و سپید رنگت، تابناک غلافی آنکھیں جن سے ذہانت اور شرافت ٹپکی پڑتی تھی، نظروں میں حیا اور پاکیزگی کی رمق.... تہذیب و شائستگی کے غماز۔''[2]

اسلوب صاحب نے متن پر مرکوز تنقیدی مطالعے کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ موصوف نے نقد و نظر کے تقریباً ہر شمارے میں بعض اردو اور فارسی غزلوں کو اپنے مخصوص تنقیدی عمل سے گزارا۔

۱۔ آئینہ خانے میں۔ اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۰۴

۲۔ ایضاً۔ ص: ۳۵

بقول خالد جاوید:

''اسلوب صاحب کی تحریریں اردو میں لکھی جانے والی فلسفیانہ تنقید کی واحد مثال ہیں۔''[1]

اسلوب صاحب کی ہر تحریر خواہ وہ ان کے تنقیدی تبصرے ہوں یا 'غزل تنقید' یا دیگر تصانیف، ان میں سے ہر ایک میں ان کے فلسفیانہ طریقِ کار کی نمایاں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ناقدانہ زندگی کا بڑا حصہ عملی اور اخلاقی تنقید لکھنے میں بسر کیا ہے۔ ایک جگہ ادبی تنقید سے متعلق لکھتے ہیں:

''ادبی تنقید میں ایک عام غلطی جو ہم سے سرزد ہوتی ہے وہ یہ کہ ہم الفاظ کو ایک بے جان اور منفعل سی چیز سمجھتے ہیں اور انھیں اس پورے عمل میں ایک ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ ہم بہت آسانی سے یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ الفاظ نہ صرف جذبات کی زبان ہیں، بلکہ وہ جذبات میں ہمواری، زرخیزی اور گہرائی بھی پیدا کرتے ہیں۔''[2]

تنقید و تخلیق کے باہمی رشتے کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''تنقیدی عمل کے لیے صرف معلومات اور ایک طرح کی ہنرمندی کافی ہیں اور اس میں تخلیقی عناصر کی کارفرمائی کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔''[3]

ابتدا میں اسلوب صاحب کا رجحان کسی قدر ترقی پسند تحریک کی طرف بھی رہا جس کو وہ 'ایامِ جہالت کا واقعہ' اور اب 'قصۂ پارینہ' سمجھتے ہیں۔ وہ مارکسی ادبیات کے مباحث پر بہت واضح رائے رکھتے ہیں اور مارکسی نقطۂ نظر کے سلسلے میں ان کا رویہ زیادہ مثبت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک عظیم ادب کو مارکسی پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا اور نہ ہی اس کی عظمت کا یقین یا ادراک کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری: نقاد اور دانش ور۔ مرتبہ شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۲۹

۲۔ ادب اور تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، تنقید اور تخلیق، سنگم پبلشرز الہ آباد، ۱۹۲۸ء، ص: ۲۴

۳۔ ایضاً۔ ص: ۲۱

پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کی پچاس پچپن سال سے زائد علمی، ادبی اور تنقیدی خدمات اور مذکورہ بالا عظیم الشان کارناموں کا اعتراف اردو ادبیات کے ہر اہم ادارے اور انجمن اور اکیڈمی نے کیا ہے۔ چنانچہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے آپ کو غالب ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ یوپی اکادمی نے بھی انھیں ادب کی مجموعی خدمات سے متعلق اپنا سب سے بڑا انعام عطا کیا۔ ان کی کتاب 'اقبال کی تیرہ نظمیں' پر ساہتیہ اکاڈمی، دہلی نے اپنا مایۂ افتخار قومی انعام عطا کیا۔ یوپی کی میرا کادمی' نے میرا ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ اقبالیات پر ان کے کاموں کی وقعت کو تسلیم کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان نے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اسلوب صاحب کا گزشتہ پچاس برس سے علمی اُفق پر چھائے ہوئے ہیں ان کے خیالات کی گہرائی کا تعلق ان کے وسیع اور فلسفیانہ مزاج سے ہے اور زبان پر قدرت ان خیالات کی بہترین ادائیگی کا ذریعہ ہے۔ اسلوب صاحب کی ایک بڑی خوبی تسلسل اور یکسوئی کے ساتھ علمی کاموں میں انہماک ہے۔ علی گڑھ کی علمی و ادبی زندگی میں انھیں بڑی قدر و منزلت اور عزت و احترام کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں کی ہر بڑی تقریب میں ان کی شمولیت باعثِ افتخار سمجھی جاتی ہے اور یہ اعزاز ہی کسی زندہ شخص کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔

○

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

ہند و پاک کے عظیم اقبال شناسوں اور ماہرین اقبالیات میں 'پروفیسر رفیع الدین ہاشمی' کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ وہ عہدِ حاضر کے چند ایسے ماہرینِ اقبالیات کی فہرست میں شامل ہیں جنھوں نے بہ یک وقت اقبال کے افکار و آثار، ان کے فن و فلسفہ اور ان کی شاعری کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی پس منظر پر بہت جامع انداز میں کلام کیا ہے۔

حیات و افکارِ اقبال کے تحقیقی گوشوں اور ان کے کلام کے تنقیدی و تجزیاتی سرمائے کی پیش کش میں ہاشمی صاحب اپنے معاصرین میں بے نظیر اور لاثانی حیثیت رکھتے ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی صاحب کا تعلق صوبۂ پنجاب کے ضلع سرگودھا سے ہے، وہ اسی ضلع کے مصریال گاؤں میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت سرگودھا میں ہی ہوئی تھی۔ اپنے سلسلۂ نسب اور اپنی تاریخ و جائے ندرت سے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> ''بزرگوں کے توسط سے دستیاب شجرۂ نسب کے مطابق متعدد واسطوں سے ہمارا سلسلہ آں حضرتؐ کے عم محترم حضرت عباسؓ بن عبدالمطلبؓ تک پہنچتا ہے اس لیے ہم بنی ہاشم ہیں اور ہاشمی کہلاتے ہیں۔
>
> تاریخ پیدائش: یکم اپریل ۱۹۴۲ء، جائے پیدائش: مصریال، ضلع اٹک (حال ضلع چکوال) ضلع اٹک کی تحصیل تلہ گنگ سے بیس پچیس کلومیٹر بہ جانب شمال ایک گاؤں ہے مصریال، میری پیدائش وہاں کی ہے، لیکن تعلیم کا سارا زمانہ سرگودھا میں گزرا۔''[۱]

حفظِ قرآن کے بعد انھوں نے ۱۹۵۳ء میں پرائمری جماعتوں کا مرحلہ کامیابی سے طے کرلیا۔ اس کے بعد وہ انبالہ مسلم ہائی اسکول میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۵۷ء میں انٹرمیڈیٹ کے لیے گورنمنٹ کالج سرگودھا

۱۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: سوانح اور کتابیات۔ عبدالعزیز ساحر، پنجابی ادبی سنگت، اٹک، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۲

میں داخل ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے ایف.اے کا امتحان دیا اور وظیفے کے ساتھ درجہ اوّل حاصل کیا۔ خرابیِ صحت کی وجہ سے بی.اے کا امتحان ۱۹۶۳ء میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔ اسی زمانے میں نوائے وقت، لیل ونہار، قندیل، سیارہ، اقدام، ایشیا اور دوسرے رسالوں میں ان کی شاعری، افسانے، انشائیے اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اورینٹل کالج لاہور میں ایم.اے میں داخل ہوگئے اور اوّل پوزیشن حاصل کی اور یونیورسٹی گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اس کی وجہ سے انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے بھی انھیں تمغاے بابائے اردو عطا کیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا، اور سرگودھا میں دورانِ قیام پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے پی ایچ.ڈی کے لیے ان کا رجسٹریشن ہوگیا اور ڈاکٹر وحید قریشی کی زیرِ نگرانی انھوں نے ''تصانیف اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ مکمل کر کے ۱۹۸۲ء میں ڈگری حاصل کی۔[۱]

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ایسی شخصیت کے مالک ہیں جنھیں عمومی ادبیات اور اقبالیات میں ہندو پاک دونوں جگہ یکساں اہمیت حاصل ہوئی۔ اقبال شناسی کی روایت میں ڈاکٹر رفیع الدین کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ ان کی تصانیف کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن کا گہرا مطالعہ کیا۔ ہاشمی صاحب نے اپنی عملی زندگی کا بیش تر حصہ محکمۂ تعلیم میں بسر کیا۔ انھوں نے تجزیاتی کاموں کے ساتھ ساتھ حوالہ جاتی کام بھی کیے ہیں اور ان کے تحقیقی وتنقیدی کام بھی بہت اہم ہیں۔

ہاشمی صاحب کی علمی وادبی زندگی کا آغاز بہت کم سنی سے ہی ہوجاتا ہے جس کی ابتدا شعر گوئی سے ہوتی ہے:

> ''ہاشمی صاحب نے اپنی ادبی اور علمی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ غزلیں اور نظمیں کہیں اور معروف ادیب اسعد گیلانی سے اصلاح لی۔''[۲]

ہاشمی صاحب برسوں مختلف اخبارات اور رسائل سے وابستہ رہے۔ انھوں نے کالم نگاری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ انشائیے کا میدان بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہا۔ رفیع الدین صاحب کے

۱۔ ارمغانِ رفیع الدین ہاشمی۔ مرتب ڈاکٹر خالد ندیم، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، (۹ر فروری اشاعت اوّل) ۲۰۱۳ء، ص: ۳۷۷۔۳۷۹

۲۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: سوانح کتابیات۔ عبدالعزیز ساحر، ص: ۱۴

ادبی و تحقیقی موضوعات کا دائرہ وسیع ہے لیکن فلسفۂ تعلیم کو وہ خصوصی ترجیح دیتے ہیں اور یہ ان کا محبوب موضوع ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنی عمر کا طویل عرصہ درس و تدریس میں گزارا:

''پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی عمر کا زیادہ تر حصہ درس و تدریس میں گزرا۔ ڈاکٹر ہاشمی غزالی کالج جھنگ، ایف.اے کالج لاہور، گورنمنٹ کالج سرگودھا، مری اور لاہور سے وابستہ رہے۔ وہ اورینٹل کالج لاہور (پنجاب یونیورسٹی) کے شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ بعدازاں پاکستان کے ہائرایجوکیشن کی طرف سے دو سال تک Eminent Professor بنائے گئے اور وہاں سے ریٹائرڈ ہوئے..... ہاشمی صاحب اقبال اکادمی پاکستان کے تاحیات رکن، مجلسِ منتظمہ اور مجلسِ حاکمہ کے رکن اور مجلس ترقی ادب کے مجلس حاکمہ کے رکن ہیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر ہاشمی ماہر اقبالیات کے درجے پر فائز ہیں۔''[1]

ہاشمی صاحب متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہوئے، جن میں انھوں نے اسپین، ترکی، بھارت، جاپان، بلجیم، جرمنی، فرانس اور سعودی عرب کے سفر کیے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی عالمانہ عظمت، ناقدانہ بصیرت، محققانہ مہارت، ادب کی مختلف اصناف اور اقبالیاتی سرمایے میں ان کی تخلیقی صلاحیت میں ان کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں پاکستان کے مختلف علمی اداروں کی اعزازی رکنیت بھی عطا کی گئی جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) تاحیات رکن (۱۹۸۷ء): اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

(۲) رکنِ مجلس ادارت: اقبال ریویو، شش ماہی مجلّہ اقبال اکادمی، حیدرآباد، دکن

(۳) رکنِ داخلہ کمیٹی برائے پی ایچ.ڈی اقبالیات: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(۴) رکنِ مجلس نصاب، شعبۂ اقبالیات: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(۵) رکنِ مجلس ادارت اقبالیات: مجلّہ اقبال اکادمی، لاہور

۱۔ اردو بک ریویو۔ جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۹ء، ص:۱۶

اس کے علاوہ رکن پاکستان رائٹرز گلڈ، رکنِ حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور اور رکنِ حلقۂ ادب، لاہور بھی رہے۔[1]

جس طرح علمی میدان میں ان کے کارناموں کی طویل فہرست ہے اسی طرح انھیں مختلف اعزازات وانعامات سے بھی نوازا گیا جن کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) پہلا انعام: ''انٹرمیڈیٹ وثانوی تعلیمی بورڈ، سرگودھا'' ۱۹۷۷ء میں صدسالہ یومِ اقبال کی مناسبت سے اساتذہ کے مابین مقالہ نویسی بہ عنوان 'اقبال اور احیائے اسلام'۔

(۲) اوّل انعام: ''انٹرمیڈیٹ وثانوی تعلیمی بورڈ، سرگودھا''، کتابیاتِ اقبال، ۱۹۷۷ء

(۳) خصوصی انعام: ''اصنافِ ادب اور سرور اور فسانۂ عجائب، سرگودھا''، ۱۹۸۰ء

(۴) داؤد ادبی انعام: ''پاکستان رائٹرز گلڈ''، تصانیف اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ، ۱۹۸۲ء

(۵) نقوش ایوارڈ: ''سفرنامۂ اندلس''، ۱۹۹۷ء

(۶) بہترین یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ، (یو.جی.سی)، ۲۰۰۱ء۔[2]

یوں تو ہاشمی صاحب نے بہت سے ادبی وتحقیقی کام انجام دیے، لیکن اقبالیات میں انھیں اختصاص حاصل ہے۔ 'اسلام اور اقبال' ان کی تحریر کے خصوصی موضوعات ہیں۔ اقبالیات کے حوالے سے ہاشمی صاحب کا پہلا مضمون 'کیا ہمیں اقبال کی ضرورت ہے' کے عنوان سے ستمبر ۱۹۷۱ء میں لاہور سے شائع ہونے والے رسالہ 'سیارہ' میں شائع ہوا۔

پی ایچ.ڈی میں ہاشمی صاحب کا موضوع ''تصانیفِ اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ'' تھا جو انھوں نے ۱۹۸۰ء میں معروف اقبال شناس ڈاکٹر وحید قریشی کی زیرِ نگرانی مکمل کیا۔ اس طرح ان کی وابستگی اقبالیات کے ساتھ اور پختہ ہوتی گئی۔ ہاشمی صاحب کا دینی مطالعہ بہت وسیع ہے، دین سے محبت اور دینی اقدار سے لگاؤ کے سبب وہ اقبال کے افکار ونظریات اور کلام کے مداح اور نقاد بنے۔

۱۔ بحوالۂ کتاب 'ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: سوانح اور کتابیات'۔ عبدالعزیز ساحر، ص:۲۲

۲۔ ایضاً۔ ص:۲۲

ہاشمی صاحب کی تصنیفات، تالیفات اور مرتّبات کی ایک طویل فہرست ہے جس میں کثیر تعداد اقبالیات سے متعلق ہے۔ مثلاً اقبال کی طویل نظمیں، کتبِ اقبالیات، خطوطِ اقبال، اقبال بہ حیثیت شاعر، کتابیاتِ اقبال (مرتب)، تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، اقبال بچوں اور نوجوانوں کے لیے، اقبال شناسی اور جنرل آف ریسرچ، اقبال شناسی اور محور، اقبالیاتی جائزے، علامہ اقبال... منتخب کتابیات، علامہ اقبال اور میر حجازؒ، اقبال کا تصورِ جہاد، اقبالیات کے سو سال، اقبال شخصیت اور فن، اقبال بہ حیثیت شاعر جیسی تصانیف اقبالیاتی ادب میں قیمتی سرمایے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہاشمی صاحب نے اقبالیات کے فروغ میں بہت اہم امور انجام دیے، جن میں ایک اہم کام تجزیاتی کام کے سلسلے میں ہاشمی صاحب کی خدمات ہیں۔ انھوں نے ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۹ء تک مستقل طور پر اقبالیاتی ادب کے سالانہ جائزے پیش کیے ہیں، جن میں 'اقبالیات کے گیارہ سال'، ۱۹۸۴ء کا 'اقبالیاتی ادب'، ۱۹۸۵ء کا 'اقبالیاتی ادب'، ۱۹۸۶ء کا 'اقبالیاتی ادب' اور 'اقبالیاتی ادب' کے تین سال قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ ہاشمی صاحب کی دیگر درج ذیل تصنیفات و تالیفات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ سوشلزم اور مذہب، خطباتِ رسولؐ، پوشیدہ تری خاک میں، چاند کا سلام، سوشلزم اور جمہوریت، سرور اور فسانۂ عجائب۔

ہاشمی صاحب نے اخبارات و رسائل میں کالم نگاری کے مضامین لکھے جن میں مسلم شخصیات پر خاص طور سے مضامین ہیں۔ انھوں نے متعدد سفرنامے لکھے، افسانے تحریر کیے۔ اس کے علاوہ ان کے لکھے ہوئے انشائیوں، مصاحبوں، مکالموں، مذاکروں، تراجم، تاثرات، فیچر، ڈرامے، خطوط، مقالات اور تبصروں کی بھی ایک طویل فہرست ہے، جس کو عبدالعزیز ساحر نے 'ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سوانح اور کتابیات' کے نام سے ایک کتابچہ کی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ یہ کتابچہ ہاشمی صاحب کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتا ہے اور اس میں ہاشمی صاحب سے متعلق ضروری معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ہاشمی کے لیے اقبال محض ایک شخصیت نہیں ہیں، بلکہ وہ اقبال کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ہاشمی صاحب نے خود کو اقبال اور اقبالیاتی تحقیق کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ان کی تصنیف ''اقبالیات: تفہیم و تجزیہ'' کو اقبالیاتی ادب میں ایک ایسی تصنیف کا درجہ حاصل ہے، جس میں

فلسفۂ اقبال کو ایک منفرد اور مربوط طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

''ان مضامین میں فکرِ اقبال کے تجزیاتی مطالعے سے ہاشمی صاحب کے ربط و دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے... ان مقالات میں انھوں نے فکرِ اقبال کے بعض ایسے گوشوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے جنھیں دوسرے نقادوں نے یا تو یکسر نظر انداز کر دیا، یا ان کی طرف معمولی اشارے کر کے نکل گئے۔ ہاشمی صاحب نے ان موضوعات پر جم کر لکھا ہے۔''[1]

ہاشمی صاحب نے اقبالیات کے فروغ میں بہت اہم کام کیے۔ اقبال پر تحقیق سے متعلق کچھ منصوبے تیار کیے اور اس کے تحت اقبالیاتی شمارے شائع کیے اور اس طرح اقبالیات کو ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا۔ ہاشمی صاحب نے ان کے کلام اور فکر کے دقیق نکات کو بڑے سہل اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ اقبال کے فکر و فن کو سمجھنے اور ان کی شاعری اور افکار پر تنقید و تحسین کا آغاز، ان کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سے رفیع الدین ہاشمی صاحب کے عہد تک ان پر سیکڑوں کتابیں وجود میں آ چکی تھیں۔ ہاشمی صاحب اقبال کے فکر و فن کے شارح اور نقاد کی حیثیت سے نمودار ہوئے، ان کی کتاب 'اقبال کی طویل نظمیں' فکری و فنی مطالعہ کے پیش لفظ میں خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے ہر نظم کا پس منظر اور فنی تجزیہ بڑی وضاحت اور جامعیت سے تحریر کیا ہے۔ اس طرح ایک ایسی کتاب وجود میں آئی ہے جو اقبالیات کے طلبہ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہاشمی صاحب نے اقبالیات کے جملہ پہلوؤں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کر رکھا ہے، اس لیے ان کی نظر ان نظموں کے تمام پہلوؤں پر پڑی ہے اور کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا۔''[2]

۱۔ اقبالیات: تفہیم و تجزیہ۔ رفیع الدین ہاشمی، اقبال اکادمی، پاکستان، ۲۰۰۴ء ص: ۷

۲۔ اقبال کی طویل نظمیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، دوسرا ایڈیشن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۸

Muslim University

اقبالیات کے موضوع پر ہاشمی صاحب کی کتاب 'اقبال کی طویل نظمیں' ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آئی جسے شعبۂ اقبالیات سے وابستہ اساتذہ نے سراہا اور اس طرح ہاشمی صاحب کی حوصلہ افزائی ہوئی جس نے اقبالیات کے ساتھ ان کے تعلق کو مزید استحکام بخشا۔

ہاشمی صاحب ایسے عالم، مصنف اور نقاد ہیں، جنھوں نے فکرِ اقبال کے عملی پہلو کو اہمیت دی۔ انھوں نے بہت محنت و کاوش سے شاعر کے نظریات و افکار کو ان کے قارئین کے لیے عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ ہاشمی صاحب نے اپنی تحریروں میں اقبالیات کے بہت سے اہم اور دقیق موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے مگر ان کا انداز اتنا عام فہم ہے کہ اوسط درجے کا قاری بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

ہاشمی صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اقبال کی شاعری کے مطالعہ کے علاوہ ان کی نثری تصانیف کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے اور ان کا جائزہ اپنی کتاب تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ میں لیا ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں سے پانچ ابواب اقبال کے نثری کارناموں پر مشتمل ہیں اور دو ابواب میں ان کے اردو و فارسی کلام کا جائزہ لیا گیا ہے، جس کے متعلق وہ خود کہتے ہیں کہ:

> ''یہ مقالہ، مطالعۂ نظم و نثر اقبال کو اصل اور مکمل تر شکل میں لانے کی پہلی کاوش ہے جس سے 'اقبالیات' کے ضمن میں ایک محکم تر اساس مہیا ہو جانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔''[۱]

ہاشمی صاحب اقبال کی محض فکری و فنی تشریح ہی نہیں کرتے بلکہ وہ ان کی مجموعی شخصیت کو ان کے فکر کے پس منظر میں رکھ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اقبال اور فکرِ اقبال ہم آہنگ اور یکجا محسوس ہوتے ہیں۔ اقبال بہ حیثیت شاعر میں ہاشمی صاحب نے مختلف مصنّفین کے مقالات کو یکجا کیا ہے، اس کے ابتدائیہ میں عرضِ مرتب کے طور پر لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال کا فکر، ان کے جسدِ شاعری میں خون بن کر گردش کر رہا ہے۔ اقبال کی تراکیب، ان کی تلمیحات، استعارے اور تشبیہیں ان کے شعری فن کا اہم جزو ہیں اور اپنی

۱۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، حرفِ آغاز، اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۸۳ء، ص: س

علامتی حیثیت میں ان کے فکری نظام سے مربوط ہیں۔ اقبال کا فکر عظیم لفظوں، علامتوں اور استعاروں کے ذریعے ہی قارئین پر اپنی معنویت آشکار کرتا ہے۔"[1]

ہاشمی صاحب اپنی تمام علمی و تحقیقی کاوشوں کو اقبال کے فیضان کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کے حوالے سے ہونے والی تحقیقات کی رفتار اور معیار پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضامین اور مقالات کے علاوہ ان کے تبصرے، تجزیے اور جائزے باقاعدگی سے اقبالیات کے طالب علموں اور محققوں کے لیے بہت اہم ثابت ہوئے ہیں۔

ہاشمی صاحب بیسویں صدی کے ایسے مفکر و مفسر ہیں، جنھوں نے فکرِ اقبال کے ذریعے سے حکمتِ قرآنی کو جدید اسلوب میں عصرِ حاضر کے سامنے پیش کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ اقبالیات کے موضوع کے علاوہ جن کتابوں کا گزشتہ سطور میں ذکر ہوا ان کی بعض دوسری تصانیف و تالیفات بھی لائقِ توجہ اور قابلِ تحسین ہیں۔ ان میں تصانیفِ مودودی، مضامین فرحت اللہ بیگ، مکاتیب مشفق خواجہ بھی بہت اہم ہیں۔ انھوں نے جس جس کے بارے میں جو عالمانہ باتیں لکھی ہیں، ان سے خود ان کی فاضلانہ بصیرت مترشح ہوتی ہے۔ اس کی تائید درج ذیل ایک خط سے ہوتی ہے۔ 'مکاتیب مشفق خواجہ بنام رفیع الدین ہاشمی' کے مقدمے میں وہ مشفق خواجہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"خوش بخت ہیں وہ معدودے چند لوگ جو خواہشاتِ نفس کے اس طغیان سے بچ بچا کر صحیح سلامت ساحل تک پہنچ جاتے ہیں۔ جناب مشفق خواجہ.... ایسے ہی معدودے چند لوگوں میں شامل تھے۔ ان کی شخصیت کے بعض نادر پہلوؤں نے انھیں ایک غیر معمولی انسان بنا دیا تھا۔ وہ ایک مہذب، شائستہ، منکسر المزاج اور مستغنی قسم کے شخص تھے.... مشفق خواجہ تہذیبِ نفس کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے جہاں انسان ہر طرح کے نام، نمود، جاہ و منصب اور مال و متاع کی خواہشات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔"[2]

۱۔ اقبال بحیثیت شاعر۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۱۱

۲۔ مکاتیب مشفق خواجہ بنام رفیع الدین ہاشمی۔ رفیع الدین ہاشمی، ادارہ مطبوعات سلیمانی، اردو بازار، لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص:۲۵

آخر میں رفیع الدین ہاشمی سے متعلق ڈاکٹر نثار احمد قریشی کا ایک اقتباس نقل کرنا زیادہ مناسب ہوگا، جس کو انھوں نے عبدالعزیز ساحر کی مرتب کردہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی... سوانح اور کتابیات میں توصیفی کلمات ادا کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی میدانِ تحقیق و ادب کی وہ شمع جہاں تاب ہیں، جس کی نورانی کرنیں برصغیر پاک و ہند میں علم و آگہی کا نور پھیلا رہی ہیں، وہ بہ یک وقت محقق بھی ہیں اور نقاد بھی، ماہرِ اقبالیات بھی ہیں اور استاد بھی۔''[1]

○

۱۔ بحوالۂ کتاب۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: سوانح اور کتابیات، عبدالعزیز ساحر، ص:۲۲

پروفیسر آل احمد سرور

اردو میں آل احمد سرور ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک پورے عہد کا نام ہے۔ وہ ایک عظیم نقاد، دانش ور اور اپنے عہد کے اہم شاعر بھی تھے۔ ادبی صحافت میں بھی انھیں امتیازی درجہ حاصل ہے۔ سرور صاحب نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایم.اے کیا تھا، اس لیے وہ نہ صرف ان زبانوں سے متعلق تمام ادبیات کے عالم تھے بلکہ ان زبانوں کے توسط سے انھوں نے مشرقی و مغربی علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز شاعری سے کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی توجہ تنقید کی طرف زیادہ مبذول ہوتی گئی اور بالآخر وہ اس میدان کی منفرد و ممتاز شخصیت کی حیثیت سے اُبھرے جس کے نتیجے میں انھوں نے تنقید کے اُفق کو بہت وسیع کر دیا۔

سرور صاحب ۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے، اس سلسلے میں انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری 'خواب باقی ہیں' میں تحریر فرمایا ہے: ''میری پیدائش ۱۵ر رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ کی ہے۔ تقدیم کے مطابق یہ ۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء ہوتی ہے۔''[۱]

سرور صاحب نے پیلی بھیت پھر آگرہ اور اس کے بعد غازی پور میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم.اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ اس کی تکمیل کے بعد انھوں نے اردو میں ایم.اے کیا۔ ان کے ادبی ذوق کے پیش نظر انھیں شعبۂ اردو کی مشہور انجمن اردوئے معلّٰی کا سکریٹری نامزد کیا گیا۔ اس کے بعد وہ علمی، ادبی اور فکری اعتبار سے ترقی کرتے رہے اور اسی مناسبت سے مختلف مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ اس طرح اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں علم و ادب اور صحافت کے میدان میں انھیں مختلف ذمہ داریاں مل گئیں، مثلاً ''انجمن ترقی اردو'' کے جنرل سکریٹری، ''اردو ادب'' اور ''ہماری زبان'' کے مدیر، ''رسالہ سہیل'' کی ادارت، علی گڑھ میگزین کی ادارت وغیرہ۔ اسی شان کے ساتھ سرور صاحب

۱۔ آل احمد سرور۔ خواب باقی ہیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۷

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے اور یہاں بھی انھوں نے اپنا امتیازی مقام حاصل کیا اور شاعر و نقاد کی حیثیت سے وہ بہت مشہور ہو گئے۔ اسی طرح وہ ترقی کرتے کرتے ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں کے رکن، فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین، آفتاب ہال کے پرووسٹ، اسٹاف ایسوسی ایشن کے صدر کے فرائض بھی انجام دیے اور ۱۹۷۲ء میں شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں انھیں 'انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز شملہ' کی فیلوشپ ملی، وہاں رہ کر انھوں نے ''اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر'' کے موضوع پر کام کیا۔ کچھ عرصے بعد کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال چیئر'' پر تقرر ہوا۔ انھوں نے بیس سال کی عمر سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ نوّے سال کی عمر پائی اور وہ آخر تک اسی شغف کے ساتھ مطالعے میں مصروف رہے۔

سرور صاحب ایک اچھے شاعر بھی تھے، ان کا شعری سرمایہ ان کی منفرد تخلیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ ''سلسبیل'' ان کا ابتدائی مجموعۂ کلام ہے۔ ان کے دوسرے شعری مجموعوں میں 'ذوقِ جنوں' اور 'خواب اور خلش' اہمیت کے حامل ہیں۔ سرور صاحب کا شمار دورِ جدید کے شعرا میں ہوتا ہے لیکن اپنی شاعری میں انھوں نے کلاسیکی طرز ہی کو پسند کیا۔ انھوں نے اپنے مضامین و مقالات لکھنے کی ابتدا اپنی ریڈیائی تقریروں سے کی، اس زمانے میں اس کی خاص اہمیت تھی۔ رشید احمد صدیقی اور بعض دوسرے ادیبوں نے بھی اسی طرح مضامین لکھے اور مجموعے تیار کیے تھے۔ چنانچہ اس طرح کے جب متعدد مضامین جمع ہو گئے تو سرور صاحب نے انھیں مجموعہ کی شکل میں شائع کرایا، جس کا نام 'تنقیدی اشارے' رکھا۔ ان کے تنقیدی سرمایے میں سب سے اہم رول ان کے تنقیدی مضامین نے ادا کیا۔ اس مجموعے کے بعد ان کے مضامین لکھنے کا سلسلہ بڑھتا گیا اور علمی و اسلوبیاتی اعتبار سے اس میں بہتری اور عمدگی بھی آتی رہی۔ جب مضامین کی ایک خاص تعداد ہو جاتی تو مجموعۂ مضامین کی حیثیت سے انھیں کتابی شکل میں شائع کر دیتے۔ چنانچہ تنقید کیا ہے؟، نئے اور پرانے چراغ، ادب اور نظریہ، مسرت سے بصیرت تک، پہچان اور پرکھ وغیرہ اسی طرح کے مجموعے اور کتابیں ہیں اور ان سے اردو کے تنقیدی سرمایے میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ سرور صاحب نے اردو فکشن پر بھی تنقیدی مضامین لکھے۔ ان میں اردو ناول کا ارتقا، اردو میں افسانہ نگاری،

فکشن کیوں اور کیسے؟ وغیرہ بہت اہم ہیں۔ شاعری سے متعلق انھوں نے میر تقی میرؔ، چکبستؔ، فانیؔ، اکبرؔ، جوشؔ، مجازؔ، جگرؔ اور حسرت موہانی جیسے شعرا پر اہم مضامین لکھے۔ سرور صاحب کا ایک اور اہم کارنامہ ان کی خودنوشت سوانح عمری 'خواب باقی ہیں' ہے۔ حقیقتاً یہ ایک پورے عہد کی ادبی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی معاملات سے متعلق انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سرور صاحب کی علمی، ادبی اور تدریسی خدمات کے ساتھ ان کی صحافتی سرگرمیوں میں علی گڑھ میگزین اور رسالہ سہیل کی ادارت کے علاوہ انھوں نے انجمن ترقی اردو کے معروف سہ ماہی رسالہ 'اردو ادب' اور ہفتہ وار 'ہماری زبان' کی ادارت کے فرائض کی بخوبی انجام دہی بھی شامل ہے۔

سرور صاحب نے مختلف سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کے مجموعوں کی شکل میں اور اس کے علاوہ اپنے شعبہ کے رفقا اور دیگر اردو دانش وروں کے مضامین کے ذریعے بہت سی کتابوں کی ترتیب کا کام بھی کیا۔ ان میں تنقید کے بنیادی مسائل، جدیدیت اور ادب، غالب کے خطوط کا انتخاب، عکسِ غالب، اقبال اور تصوف، اقبال اور مغرب، جدیدیت اور اقبال وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بھی سرور صاحب کا اقبالیاتی ادب کی تاریخ میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ ڈائرکٹر کا منصب سنبھالنے کے بعد ان کی اقبال سے متعلق دلچسپی بہت بڑھ گئی، وہاں انھیں گہرائی سے اقبال کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ وہاں بھی انھوں نے ماہرینِ اقبال کے مضامین و مقالات پر مشتمل تین کتابیں شائع کیں: (۱) تشخص کی تلاش اور اقبال (۲) جدیدیت اور اقبال (۳) اقبال اور اردو نظم۔ کشمیر کے قیام کے نتیجے میں سرور صاحب نے اقبالیات پر ایک مبسوط کتاب 'دانش ور اقبال' لکھ کر ایک قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا اور اس کے بعد سے اقبال ان کا خصوصی موضوع بن گیا۔ انھوں نے مختلف جہتوں اور متعدد پہلوؤں سے اقبال کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ یہاں کچھ کتابوں اور مضامین کی وضاحت کرنا مناسب ہوگا مثلاً: 'تنقیدی اشارے' میں 'اقبال اور ان کا فلسفہ' کے عنوان سے ایک مقالہ شامل ہے۔ ان کے دوسرے مجموعے 'نئے اور پرانے چراغ' میں اقبال پر تین مقالے ہیں: 'اقبال اور اس کے نکتہ چیں'، 'روحِ اقبال' اور 'اقبال اور ابلیس'۔ تیسرے مجموعے 'تنقید کیا ہے؟' میں 'اقبال کے خطوط' کے عنوان سے ایک مضمون ہے۔ چوتھے مجموعے 'ادب اور نظریے' میں اقبال کی عظمت سے متعلق ایک مقالہ شامل ہے۔

تنقیدی مضامین کے مجموعے 'مسرت سے بصیرت تک' میں اقبال پر اُن کے دو مضمون 'اقبال اور مغرب' اور 'اقبال اور تصوف' کے عنوان سے موجود ہیں۔ سرور صاحب نے اقبال کی شاعری کا جائزہ بہت باریک بینی سے لیا ہے اور اس میں ان کے فکری میلانات و تصورات اور کلام کے فنی محاسن واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کے اردو کلام کے ساتھ ساتھ فارسی کلام کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا۔

سرور صاحب کے مضامین میں دانش ور اقبال، اقبال کی مشرقیت، تشخص کا مسئلہ، اقبال اور جمہوریت اور اقبال کی سیاسی فکر جیسے موضوعات ان کے طرزِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اقبال پر سرور صاحب کی تین کتابیں 'اقبال اور ان کا فلسفہ'، 'عرفانِ اقبال' اور 'اقبال-نظریہ اور شاعری' اقبالیات میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اقبال کی نظم گوئی پر مجموعی تبصرے کے علاوہ سرور صاحب نے ان کی نظموں کا فنی تجزیہ بھی کیا ہے اور ان کے محاسن کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ سرور صاحب نے بالِ جبریل کی دیگر نظموں پر بھی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ موصوف نے اقبال کی جن نظموں پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کی ہے ان میں مسجدِ قرطبہ، خضرِ راہ، جبریل و ابلیس، ہمالہ، شعاعِ امید اور ساقی نامہ جیسی متعدد نظمیں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے جائزے میں انھوں نے اقبال کے فکر و فن پر تجزیاتی انداز میں گفتگو کی ہے۔ معنوی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اس کتاب کے ایک اہم مضمون 'اقبال کا فن' میں انھوں نے دوسرے مسائل پر گفتگو کے ساتھ ساتھ اقبال کے صوتی آہنگ سے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''نیا شوالہ کا لہجہ اور ہے، عبدالقادر کے نام کا اور گورستان شاہی کا اور، شکوے کا اور، جواب شکوے کا اور، اسی طرح خضرِ راہ کے لہجے اور طلوعِ اسلام کے لہجے میں فرق ہے۔''[1]

اسی مضمون میں نظم جدید کے ارتقا میں اقبال کے کارناموں سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

۱۔ دانش ور اقبال۔ آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۷

''ہماری نظم جدید حالی اور آزاد، اسماعیل اور اکبر کے سہارے پروان چڑھی مگر اسے بلوغت اقبال نے ہی عطا کی ہے۔''[1]

سرور صاحب نے علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کے اردو ترجمے 'تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ' کے حوالے سے اقبال کی دانش ورانہ اہمیت پر مدلل اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کو دانتے، ملٹن اور ٹیگور کی صف کا فن کار شمار کیا ہے۔ وہ اقبال کے مطالعے و مشاہدے کی وسعت، ان کے انسان کی عظمت پر اصرار، خود آگہی اور خود اظہاری کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔

سرور صاحب نے اقبال کی جن نظموں پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کی ہے ان میں 'خضرِ راہ' بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اس نظم کے جائزے میں اقبال کے فکر و فن کی سحر کاری پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''خضرِ راہ میں ہمیں ماضی کی صالح قدروں کا احساس، آیات و تلمیحات کے ذریعہ سے قوم کے حافظے کو تازہ رکھنے کا سلیقہ اور شاعر کے آئینۂ گفتار میں آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر، یہ تینوں پہلو ملتے ہیں۔ اسلوب موضوع کے مطابق ہے۔ لہجہ کرداروں کی شخصیت سے ہم آہنگ ہے۔ جا بہ جا بیان کو تشبیہات، استعارات، تلمیحات کے ذریعہ سے تہہ دار اور پہلو دار بنایا گیا ہے۔''[2]

سرور صاحب نے 'جدیدیت اور ادب' کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی جس میں مختلف نقادوں جیسے شمس الرحمٰن فاروقی، قاضی عبدالستار، ڈاکٹر قمر رئیس اور وارث کرمانی وغیرہ کے جدیدیت سے متعلق مضامین شامل ہیں۔

اس کے علاوہ سرور صاحب نے اقبال پر بھی اپنی مختلف کتابوں میں مضامین قلم بند کیے ہیں۔ مثلاً اقبال اور ان کا فلسفہ، روحِ اقبال اور اقبال اور ابلیس جیسے مضامین اقبال کے شعری مرتبے کو سمجھنے میں معاون ہیں:

۱۔ دانش ور اقبال۔ آل احمد سرور، ص: ۲۷۵

۲۔ ایضاً۔ ص: ۲۵۳

''ان کا فلسفہ وہ ہے 'جو خونِ جگر سے لکھا جائے'، وہ 'مستی احوال' یا 'مستی گفتار' کے قائل نہیں۔ 'مستی کردار' پر جان دیتے ہیں۔ ان کا اپنا فلسفۂ حیات ہے۔''[1]

''اقبال کے یہاں وہ روحانی کیفیت ہے جو وجدان سے تعلق رکھتی ہے۔ خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہوتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آجاتی ہیں۔''[2]

'دانش ور اقبال' میں اقبال پر بیس مضامین ہیں۔ ان میں سے بارہ اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی کے مختلف سمیناروں میں پڑھے گئے تھے ان میں سے ایک مضمون 'اقبال-ہمالہ سے شعاعِ امید تک' بھی ہے، جس میں انھوں نے اقبال کی ابتدائی نظم ہمالہ اور شعاعِ امید کا جائزہ لیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقبال نے جو سفر ہمالہ سے شروع کیا تھا، شعاعِ امید اسے مکمل کرتی ہے۔ براہِ راست اظہار کی جگہ بالواسطہ اظہار ملتا ہے۔ اب شاعر کو خوش نما تراکیب کے ذریعہ سے اپنے دریچے کو سجانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے الفاظ پر فتح حاصل کر لی ہے اور لفظ کو کائنات بنانے کا گُر اسے آ گیا ہے۔''[3]

سرور صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں ادبی تنقید پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''میں ادبی تنقید کو ادب کی ہی ایک شاخ اور اس کی ایک ضروری اور اہم صنف سمجھتا ہوں۔ اسی لیے تنقید میں بھی ان خوبیوں کو ضروری سمجھتا ہوں جو ادب پارے کے لیے لازمی ہیں۔ نقاد بھی بنیادی طور پر ادیب ہوتا ہے اور وہ ادب پارے پر تنقید کے دوران خود بھی ایک تخلیقی عمل سے گزرتا ہے اس لیے اس کی تحریروں میں ادبیت اور جمالیاتی قدر کا ہونا ضروری ہے۔''[4]

۱۔ تنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، ۱۹۴۲ء، ص:۱۰۱

۲۔ ایضاً۔ ص:۱۰۲

۳۔ دانش ور اقبال۔ آل احمد سرور، ص:۱۰۲

۴۔ آل احمد سرور۔ شخصیت اور فن۔ امتیاز احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۷ء، ص:۲۴

سرور صاحب نے جدید مغربی تصورات سے استفادہ کے ساتھ ساتھ مشرقی تصوراتِ فن کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی تنقید میں ایک احساسِ توازن و اعتدال ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے ادبی مسائل پر بھی خاصی تعداد میں مضامین لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین موجودہ ادبی مسائل، ادب میں اظہار و ابلاغ کا مسئلہ، ادب میں قدروں کا مسئلہ وغیرہ بہت بصیرت افروز ہیں۔ وہ بہت ہی دلچسپ اور شگفتہ انداز میں اپنی بات کہتے ہیں۔ سرور صاحب کی ایک خصوصیت ان کی کثیر جہتی اور ہمہ رنگی بھی ہے، انھوں نے اپنی جوانی کے زمانے میں ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت تینوں اہم ادبی دبستانوں میں شرکت کی ہے اور ان کا اثر قبول کیا ہے اور اس اثر کو اعتدال و توازن کے ساتھ اپنی فکر کا جزو بنایا ہے، جس میں ایک نظم، ربط اور سلجھا ہوا انداز ملتا ہے۔ اسی لیے ان کی اکثر تنقیدی تحریریں سائنٹفک تنقید کے زمرے میں بھی آ جاتی ہیں۔ انھوں نے مغربی ادب کے اصول و نظریات سے بھی براہِ راست استفادہ کیا اس لیے ان کی تحریروں میں انگریزی ادب کے حوالے خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ مثلاً آئی۔اے۔رچرڈس اور ایلیٹ کا تذکرہ تو انھوں نے جا بہ جا کیا ہے۔ سرور صاحب کے ادبی نظریات کو سمجھنے کے لیے 'نئے اور پرانے چراغ' کا دیباچہ، ان کے مضامین، موجودہ دور کے ادبی مسائل اور تنقید کیا ہے؟ وغیرہ کتابیں کافی معاون و مددگار ہو سکتے ہیں۔ 'نئے اور پرانے چراغ' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''میں ادب میں پہلے ادبیت دیکھتا ہوں، بعد میں کچھ اور گو یہ جانتا ہوں کہ ادب میں جان، زندگی سے ایک گہرے اور استوار تعلق سے آتی ہے۔ میں ادب کا مقصد نہ ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں نہ اشتراکیت کا پرچار۔''[1]

تنقید کیا ہے؟ میں اچھی اور بری تنقید کا فرق واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورّخ، ماہرِ نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔''[2]

۱۔ نئے اور پرانے چراغ۔ آل احمد سرور، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، ص: ۷

۲۔ تنقید کیا ہے؟۔ آل احمد سرور، مکتبۂ جامعہ، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص: ۱۵۰

سرور صاحب کو اپنی خدمات کے لیے بہت سے اعزازات اور انعامات بھی ملے۔ انھیں اپنے کارناموں اور خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومتِ ہند نے 'پدم بھوشن' کے اعزاز سے نوازا۔ اس کے علاوہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے غالب مودی ایوارڈ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اور اقبال سمان سے نوازے گئے۔ ان کی تصنیف اقبال نظریہ اور شاعری پر انھیں صدرِ پاکستان کی جانب سے طلائی تمغہ بھی دیا گیا تھا۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور، اردو کے ایک عظیم نقاد اور اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے اپنی مسلّمہ حیثیت کے حامل ہیں اور ان کے تنقیدی رویوں کا بھرپور انعکاس ان کی اقبال تنقید اور کلامِ اقبال کے تجزیوں سے ہر جگہ ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں ماہر اقبالیات تسلیم کرنے میں کوئی تامّل نہیں ہو سکتا۔

○

پروفیسر عبدالمغنی

بیسویں صدی کے اردو اور انگریزی زبان وادب کے عالموں میں پروفیسر عبدالمغنی کا نام بہت اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے اور ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے بھی ان کا اہم مقام ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی بنیادی طور پر ادیب اور نقاد تھے۔ عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبان و ادب پر ان کی گہری نظر تھی اور اسلامی تاریخ، فلسفہ اور دینیات پر انھیں عبور حاصل تھا۔ وہ ایک جید عالم، انشا پرداز، محقق، نقاد، صحافی، خطیب اور مجاہدِ اردو تھے۔ موصوف ہی کے تدبر، انتھک کوششوں، سیاسی حکمتِ عملی اور تنظیمی صلاحیت سے ریاستِ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل سکا۔

ان کا پورا نام ابوالمبرد عبدالمغنی تھا۔ ان کا تعلق صوبہ بہار کے ضلع اورنگ آباد کے ذی علم گھرانے سادات سے تھا اور وہیں وہ ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالرؤف ندوی مشہور عالمِ دین تھے۔ عبدالمغنی صاحب نے ابتدائی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی، اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف توجہ کی۔ ان کی اعلیٰ تعلیم پٹنہ یونیورسٹی میں ہوئی اور انگریزی زبان وادب میں ایم.اے کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی سے "T.S. Eliot's Concept of Culture" پر پی ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں درس وتدریس سے وابستہ ہوئے اور یہیں ترقی کرتے ہوئے پروفیسر کے عہدہ تک پہنچے اور ۱۹۹۶ء تک اسی تندہی سے مصروف رہے۔ ۵ر ستمبر ۲۰۰۶ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

پروفیسر عبدالمغنی ایک کثیر التصانیف اور کثیر الجہات مصنف تھے۔ وہ عمومی طور پر اردو ادب اور خصوصی طور پر اقبالیات کے بہت اہم نقاد تھے۔ ادبی تنقید کے علاوہ انھوں نے جن دیگر موضوعات پر کتابیں تحریر کیں ان میں قرآن مجید اور تاریخ کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے اورنگ زیب، ٹیپو سلطان اور محمود غزنوی پر بھی مدلل اور تحقیقی کتابیں لکھیں۔ ان کا بہت اہم اور قابلِ قدر کارنامہ قرآن مجید کا انگریزی

ترجمہ ہے، جس کا نام "Translation of Quran" ہے۔ عبدالمغنی نے مختلف شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کی تخلیقات وتنقیدات کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا، چنانچہ ان کے تنقیدی مطالعات میں جہاں ایک طرف غالب، انیس، اقبال، جگر، جوش، فراق، فیض جیسے شعرا شامل ہیں، دوسری جانب ابوالکلام آزاد، پریم چند، قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدی جیسے ادبا اور احتشام حسین، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، اختر اورینوی وغیرہ جیسے جید ناقدین بھی موجود ہیں۔ ان کے ادبی تنقیدی، لسانی، ملّی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل مضامین ہندو پاک کے مختلف موقر رسائل واخبارات میں شائع ہوئے۔ وہ ایک صحافی اور کالم نگار بھی تھے، اردو کے علاوہ انگریزی اخباروں میں بھی مستقل کالم لکھتے تھے۔ انھوں نے پوری زندگی اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے وقف کردی۔ ان کی ادارت میں پٹنہ سے ایک معیاری رسالہ مریخ جاری ہوا، اس میں بھی ان کے گراں قدر مضامین چھپے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پٹنہ سے ہی ایک ہفتہ وار اخبار معاشرہ بھی جاری کیا تھا۔ تنقید میں وہ تعمیری، اعتدال پسند اور متوازن طرزِ فکر کے حامل تھے۔ ایک مبصر کی حیثیت سے انھوں نے دہائیوں علمی وادبی کتابوں پر پُر مغز تبصرے لکھے لیکن ان کا اصل موضوع ادب وتنقید ہی تھا جس کے تحت انھوں نے نقطۂ نظر، جادۂ اعتدال، معیار واقدار، فروغ تنقید اور زاویے وغیرہ جیسی علمی کتابیں لکھیں۔ وہ مشرقی تصورِ نقد کے پاسدار تھے، اردو تنقید میں اسلامی واخلاقی اقدار کے فروغ میں ان کی تحریروں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ علامہ اقبال کے افکار ونظریات پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔

عبدالمغنی یوں تو انگریزی کے پروفیسر رہے اور مغربی شعر وادب پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی لیکن مشرقی ادبیات سے انھیں گہری محبت اور شغف تھا۔ اردو زبان ان کا ذریعۂ اظہار تھی۔ اردو کے بعد ان کے خصوصی مطالعہ کا میدان اقبال تھا۔ وہ اقبال کی شاعری اور فکر کے زبردست مداح اور عاشق تھے اور اس معاملے میں خاصے انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ ان پر انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں اقبال اور عالمی ادب، اقبال کا نظامِ فن، اقبال کا نظریۂ خودی اور تنویر اقبال وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب 'اقبال اور عالمی ادب' میں مغربی شعرا اور اقبال کے کلام کا تقابلی وتجزیاتی مطالعہ پیش کرکے دوسرے بہت سے انگریزی شعرا پر اقبال کی برتری ثابت کی ہے۔ یہ کتاب دراصل انھوں نے کلیم الدین احمد کی کتاب 'اقبال ایک مطالعہ' کے جواب میں تصنیف کی۔ اس میں عبدالمغنی صاحب نے اقبال پر کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا جواب

بہت واضح اور مدلل انداز میں دیا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کا اردو میں ہی نہیں بلکہ عالمی ادب میں اہم اور ممتاز مقام ہے۔ اس کے علاوہ 'اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا' اور ایک انگریزی کتاب "Iqbal the Poet" اقبالیات میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس موضوع پر مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے اپنی دوسری تصانیف میں بھی اقبال کے فکر وفن پر مضامین قلم بند کیے ہیں۔ مثلاً اقبال اور شخصیت، اقبال کی فارسی شاعری، اقبال کا فن، موازنۂ اقبال اور غالب، اقبال کی انسان دوستی، اقبال اور کارل مارکس۔ انھوں نے اپنی ایک دوسری تصنیف 'اقبال کا نظریۂ خودی' لکھ کر گویا اقبال کے تصورِ خودی پر بہت مدلل اور جامع کلام کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

> ''دراصل خودی ایک بہت سادہ سی فطری چیز ہے جسے ہم بہ آسانی عرفانِ ذات کہہ سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو پہچاننا اپنی حد میں رہنا، اپنے نفس کی معرفت، اس کا تزکیہ، اس کی ترقی، شخصیت کی تعمیر، جوہرِ ذاتی کی پرورش، کردار کی تشکیل و تہذیب ہر باہوش انسان کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔''[1]

عبدالمغنی صاحب ذہنی وفکری ہر لحاظ سے اقبال شناسوں میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے 'اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا' میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے یہاں ہر جگہ ایک ہمواری واستواری پائی جاتی ہے۔ ان کی فکر میں تضاد نہیں تسلسل ہے۔ عبدالمغنی نے علامہ اقبال کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کر کے ان کے ذہنی وفکری سفر کے مختلف مراحل کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔

کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب 'اقبال - ایک مطالعہ' میں ایک طرف تو اقبال کی شاعری اور ان کے فکر وفن کو سراہا ہے، وہیں دوسری جانب انھوں نے یہ بھی کہا کہ بلاشبہ اقبال بڑے شاعر تھے اور بہت بڑے ہو سکتے تھے، اگر وہ شاعر ہی رہتے، پیغمبر بننے کی کوشش نہ کرتے وغیرہ وغیرہ۔ کلیم الدین احمد کی انھیں باتوں کے جواب میں عبدالمغنی صاحب نے اپنی ضخیم کتاب 'اقبال اور عالمی ادب' کے ذریعے نہ صرف کلیم الدین احمد کے خیالات کو رد کیا بلکہ اقبال کو دنیا کا عظیم ترین فن کار ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی اور

۱۔ اقبال کا نظریۂ خودی۔ عبدالمغنی، مکتبۂ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۴

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس رغبت اور والہانہ انداز میں انھوں نے اقبال کے فکر وفن کے مختلف گوشوں کو منور کیا، وہ ان کے ادبی وتنقیدی سرمایے میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقبال کی شاعری میں قدیم و جدید روایات کو برتا گیا ہے، کبھی موضوع اور کبھی علامت کے طور پر، اگرچہ شاعر نے مسئلوں کے بجائے قدروں پر زور دیا ہے اور اپنے جذبے کی گرمی سے غیر متعلق آلودگیوں کو پگھلا کے فن کے زر خالص کو چمکایا ہے.... اقبال کے فن کی اصل پرکاری یہی ہے۔ حقائق کی افسانہ طرازی کے لیے اقبال نے تلمیحات کے ذریعہ علامتوں کا ایک پورا نظام مرتب کیا ہے۔ اس نظام میں فرہاد وشیریں سے لے کر رومی ورازی تک موجود ہیں۔''[1]

اقبال کے فکر وفن پر ان کی تنقید اس اعتبار سے بڑی متوازن اور معتدل ہے کہ وہ اقبال کی شاعری میں ان کی فکر کے ساتھ، ان کے فن کو بھی برابر کی اہمیت دیتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا عبدالمغنی صاحب علامہ اقبال کو عالمی سطح کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اور یہ ان کی سوچی سمجھی رائے تھی۔ دونوں زبانوں میں ان کی مستقل کتابیں شائع ہوئیں۔ اقبالیات کے باب میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میں نے اقبال کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا تھا میں اسے ہرگز مبالغہ تصور نہیں کرتا، اگر ایلیٹ، اطالوی شاعر دانتے کو اس کی مشہور کتاب طربیۂ خداوندی کی بنیاد پر دنیا کا عظیم ترین شاعر قرار دے سکتا ہے تو میں اقبال کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر کیوں نہیں کہہ سکتا۔''[2]

عبدالمغنی صاحب نے 'تشکیلِ جدید' میں بھی چند مضامین اقبال پر قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے 'عالمی ادب میں اقبال کا مقام' اور 'اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید' جیسے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کلام اقبال میں اپنے زمانے کی تمام پیچیدگیوں کو شاعری کی ہیئت میں

۱۔ نقطۂ نظر۔ عبدالمغنی۔ اقبال کا فن (تنقیدی مقالات کا مجموعہ)، کتاب منزل، پٹنہ، ۱۹۶۵ء، ص ۲۵۹

۲۔ نوائے وقت۔ لاہور، ۲۲ر جنوری ۱۹۹۹ء

بیان کردیا گیا ہے اور اقبال نے اپنی فکر کو فن بنا دیا ہے۔ نیز یہ کہ اقبال اس میں پوری طرح کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ 'تشکیلِ جدید' میں انھوں نے اسلامی فکر میں اقبال کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کا خیال ہے کہ اقبال نے عالمِ انسانیت کی تشکیل جدید کے لیے اسلامی نصب العین اختیار کیا:

''اقبال نے اپنے موضوع ذہنی کو ایک جمالیاتی معروضیت بخشی اور اپنی شخصیت کو اپنے فن میں گم کردیا۔ ان کے شاعرانہ احساسات کی سالمیت قابلِ رشک ہے۔ کلامِ اقبال میں مواد و ہیئت کی عضویت کمال درجے پر ہے.... ان کے الفاظ ان کے معانی کے ساتھ بالکل پیوستہ ہیں... ان کے اشارات و علامات نے احساسات و جذبات کی ایک خاص الخاص دنیا بسائی ہے۔''[1]

عبدالمغنی نے اپنی ایک دوسری تصنیف 'جادۂ اعتدال' میں بعض عظیم شعرا و فن کاروں کے فن کا احاطہ کیا ہے۔ اس میں ہلکی سی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے جب کہ ان کی دوسری کتابوں میں سنجیدگی، علمیت اور گہرائی کا عنصر غالب ہے۔ اس میں ایک مضمون اقبال کی انسان دوستی میں انھوں نے فطرتِ انسانی کے اسرار و رموز پر اظہارِ خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ اقبال کی شاعری کا اصل موضوع 'انسان' ہے۔ اقبال کی انسانیت کا محرک و مقصود صرف ایک جذبہ ہے اور وہ ہے بنی نوعِ انسان کی ہمدردی۔ کہتے ہیں کہ:

''اقبال نہ صرف یہ کہ ایک صاحب پیغام شاعر ہیں، بلکہ وہ ایک الہامی شاعر بھی ہیں.... انھوں نے اسلام کو شعوری طور پر انسان اور انسان، اور انسان اور کائنات کے درمیان ارتباط کا سب سے فطری، معقول اور مکمل طریقہ سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک جدید انسان علم و عقل کی فراوانی کے باوجود جو اس درجہ پریشان اور زار و نزار ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اسلام کے اصولِ فطرت طور طریق حکمت سے دور ہٹ گیا ہے۔''

اس طرح بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عبدالمغنی صاحب نے اقبال کے تقریباً تمام افکار اور ان کی فنی انفرادیت کو اپنے احاطۂ تحریر میں لیا اور گویا اقبال شناسی کا حق ادا کرتے ہوئے اردو کے معتبر اور اہم اقبال شناسوں میں اپنا مقام حاصل کیا۔

۱۔ تشکیلِ جدید (عالمی ادب میں اقبال کا مقام)۔ عبدالمغنی، شعبۂ انگریزی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ، ۱۹۷۶ء، ص: ۱۱

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ عبدالمغنی صاحب محض اقبالیات کے عالم نہیں، بلکہ وہ ہمہ جہت اور مکمل نقاد ہیں اور ادب و شاعری کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر ان کے تنقیدی افکار موجود نہ ہوں۔ ان کی ادبی تنقید میں خاصا تنوع ہے، ان کے تنقیدی تجزیوں کا انداز بہت دوٹوک، بے باکانہ اور صاف و صریح ہے۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی، اسلوب میں تازگی، خیالات میں پختگی اور استواری ہے۔ عبدالمغنی صاحب نے اردو تنقید میں اپنی راہ خود متعین کی، اپنے منفرد اسلوب اور واضح نقطۂ نظر کے سبب اپنے ہم عصروں میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کے تنقیدی افکار و اظہار میں عالمانہ بصیرت اور گہرے تنقیدی شعور کا احساس نمایاں ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''شعور و آگہی تنقید کی پہلی شرط ہے۔ ایک صاحبِ فکر اور باذوق انسان ہی ادبی نمونوں کی تشریح اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کر سکتا ہے۔... تنقید ادبی تجربے کی توضیح کے ساتھ ساتھ اس کا تخمینہ بھی لگاتی ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتی ہے اور تاریخ ادب میں اس کا درجہ متعین کرتی ہے۔''[1]

عبدالمغنی کا پایہ اردو ادب و تنقید میں اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ انھوں نے جب ادب و تنقید کے میدان میں قدم رکھا تو اس وقت اردو میں ترقی پسند تحریک کا زور تھا، لیکن چوں کہ ان پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ اقبال کے خاص اثرات تھے اور انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے دینی افکار کا بھی اثر قبول کیا تھا، اس لیے وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر اور اس کے موید نہ ہو سکے، اور انھوں نے اس کے متوازی ادب اسلامی کی تحریک سے اپنا رشتہ جوڑا، انھوں نے داستان، ناول، افسانے، ڈرامے سے لے کر غزل، نظم، مثنوی اور قطعہ پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی۔ تحریر کے ساتھ ساتھ انھیں تقریر پر بھی زبردست ملکہ حاصل تھا۔ جو کہتے برجستہ اور دوٹوک کہتے۔

عبدالمغنی کی تنقید کی ایک اہم خوبی ان کا اسلوب ہے وہ الفاظ کے انتخاب پر خاص توجہ کرتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان وضاحتی، مدلل اور محتاط ہے۔ عبدالمغنی ادب پاروں کا تجزیہ معروضی انداز میں کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ:

۱۔ تصورات۔ عبدالمغنی۔ ادارہ فکر جدید، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص: ۷

''ادبی تنقید معانی و بیان کی ضروری تشریح سے آگے بڑھ کر ان تہذیبی و اخلاقی قدروں پر بھی بحث کرتی ہے جو کسی تخلیق میں موجود ہوتی ہیں، چنانچہ کسی ادب پارے کی صحیح قدر و قیمت اسی وقت معین ہوتی ہے جب اس کے تمام وہ مضمرات روشنی میں آجائیں جن کا تعلق بہ یک وقت فکر و فن، مواد و ہیئت، موضوع و اسلوب اور لفظ و معنی دونوں سے ہوتا ہے۔ یہی ادب کا جامع ہیئت اور تعمیری نقطۂ نظر ہے اور ہر اچھی تنقید اس کو مدنظر رکھتی ہے۔''[1]

ان معروضات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادب کا تخلیقی شعبہ ہو یا تنقیدی ہر جگہ ایک خاص مقصدیت ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تنقید کے اصولی و عملی پہلوؤں پر بھی عبدالمغنی نے اپنے محسوسات و معروضات قلم بند کیے ہیں۔

عبدالمغنی کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ حکومت بہار کے محکمہ راج بھاشا کی جانب سے بھی انھیں انعام پیش کیا گیا تھا۔ وہ بہت سی علمی، تعلیمی اور ادبی انجمنوں سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے۔

ان کے تنقیدی تصورات اور طریق ہائے کار سے واضح ہوتا ہے کہ وہ وسعتِ مطالعہ کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کا ذہن تجزیاتی ہے، وہ دوٹوک انداز میں تنقیدی فیصلے دیتے ہیں۔ ان کی زبان رواں دواں ہے جس میں ناقدانہ متانت اور جامعیت پائی جاتی ہے۔ عبدالمغنی اردو تنقید کے تعمیر پسندانہ، افادی تناظر میں ایک اہم نام ہے۔ ان کے یہاں فکر و اسلوب دونوں شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ عبدالمغنی کی تنقید، ادبی تنقید کے افادی نظریہ و عمل کا ایک واضح نقطہ ہے اور ان کے تنقیدی تجزیے، خاص طور سے کلامِ اقبال کے تجزیوں میں ان کا یہی رویہ جاری و ساری ہے۔

○

۱۔ اسلوبِ تنقید۔ پروفیسر عبدالمغنی، عاکف بک ڈپو، پٹنہ، ۱۹۸۹ء، ص:۵

ڈاکٹر عابد علی عابد

سید عابد علی عابد اردو شعر و ادب کی نامور ہستیوں میں سے ہیں۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، لیکن انھیں اصل شہرت تلمیحاتِ اقبال کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ یہ کتاب ان کا وقیع کارنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے کلامِ اقبال میں شامل تلمیحی اشاروں اور شخصیتوں کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی یا تاریخی بہت وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔

سید عابد علی عابد ۱۹۰۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت لاہور ہی میں ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں اسی یونیورسٹی سے بی.اے انگریزی میں کیا۔ ۱۹۲۵ء میں لاء کالج، پنجاب یونیورسٹی سے ایل.ایل. بی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں فارسی سے ایم.اے کیا۔[1]

سید عابد علی عابد کو زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر و ادب سے دلچسپی تھی اور وہ ادبی صحافت سے بھی شروع سے وابستہ رہے۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں وہ ہادی حسین کے ساتھ رسالہ 'ہزار داستاں' کی ادارت میں شریک ہوئے۔ اسی دوران 'ادبی دنیا' لاہور کے نائب مدیر بھی رہے۔ اس کے بعد رسالہ 'گلِ خنداں' لاہور کے مدیر کے فرائض بھی انجام دیے۔ موصوف نے لاہور کے ایک اور اہم جریدہ 'صحیفہ' کی ادارت کی خدمات بھی انجام دیں۔

سید عابد علی عابد کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ ترجمہ نگاری میں بھی وہ اچھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے تراجم کی تعداد خاصی طویل ہے جن میں گلہائے بہار، اُما، درستاں، بشر ہے کیا کہیے، قیامت کی رات، تعلیم کا عمل، بن ماں باپ کا کنبہ، ایرانِ قدیم اور داستانِ فلسفہ اہم ہیں۔

۱۔ بحوالہ بیسویں صدی کے اردو مصنّفین۔ ڈاکٹر سنجیدہ خاتون، بھارت آفسیٹ، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۴۶

عابد صاحب نے ریڈیائی ڈرامے، فیچر اور افسانے بھی لکھے جن کے عنوانات یہ ہیں: روپ منی اور دہلی میں قتل عام، شہباز خاں، یدِ بیضا، رہبر ادب، گرائمر، قصائد خاقانی، اردو نظمیں، ریاض ادب اور گنجینۂ ادب وغیرہ۔ بعض دیگر اصنافِ نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔ موسیقی میں بھی خاصا درک حاصل کرلیا تھا۔ ابتدائی شاعری پر بھی اقبال کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ 'شعرِ اقبال' کے انتساب میں عابد صاحب کا یہ شعر رقم ہے:

کوئی ہم زباں تو ہوگا، کوئی راز داں تو ہوگا
یہ غزل پڑھوں گا عابد سر بزم ارجمنداں

عابد صاحب کی تصانیف کی فہرست طویل ہے جن میں اصولِ انتقادِ ادبیات، تنقیدی مضامین، انتقاد، البدیع شامل ہیں۔ ناولوں میں چاندنی، دکھ سکھ اور سہاگ، حجاب زندگی اور دیگر افسانے، قسمت اور دوسرے افسانے اور طلسمات لکھے۔ انھوں نے شاعری کے دو مجموعے جو 'شب نگار نبداں' اور بریشم خود کے نام سے منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ ان کی مرتب کردہ کتابوں میں موازنۂ انیس و دبیر از شبلی نعمانی اور سوانح مولانا روم از شبلی نعمانی بھی شامل ہیں۔

ان کے علاوہ عابد صاحب نے 'اسلوب' کے نام سے بھی ایک کتاب تصنیف کی جس کو انھوں نے دس ابواب میں منقسم کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اسلوب اور ہیئت، اسلوب کی صفات، اسلوب کی صفاتِ جذباتی اور اسلوب کی صفاتِ تخیلی پر بحث کی ہے۔ اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت وصورت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے، لیکن انتقادی تصانیف میں اکثر وبیش تر کلمات مستعملہ کے معانی متعین نہیں ہوتے اور اسلوب کو محض انداز نگارش طرزِ بیان کہہ کر اس کلمے کی وہ تمام دلالتیں ظاہر نہیں کی جاسکتیں جن کا اظہار مطلوب ہے۔''[1]

ان تصانیف کے علاوہ عابد صاحب نے اقبالیات کے ضمن میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ انھوں نے اقبال پر تین کتابیں لکھیں، ان میں تلمیحاتِ اقبال، شعرِ اقبال اور نفائسِ اقبال شامل ہیں۔

۱۔ اسلوب۔ عابد علی عابد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء، ص: ۴۰

اوّل الذکر اس لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے کہ اس میں انھوں نے کلامِ اقبال میں شامل تلمیحات کو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے۔

'نفائسِ اقبال' علامہ پر مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے ''شکوہ و جوابِ شکوہ- ایک سلسلۂ خیال کا تجزیہ'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون شامل کیا ہے۔ اس تجزیاتی مطالعے کے شروع میں انھوں نے پہلے نظم کی ساخت سے بحث کی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ نظم ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی تھی، اس وقت بالعموم عالم اسلام میں افراتفری، بے چینی اور مایوسی پھیلی ہوئی تھی اور مسلمان سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ ان حالات کا شکار کیوں ہو گئے۔ اسی ضمن میں وہ خدا سے گلہ وشکوہ کی کیفیات میں بھی مبتلا تھے۔ اقبال نے اس نظم میں اپنے عہد کے اسی طرح کے مسلمانوں کی ترجمانی کی ہے۔ نظم کے تیسرے حصے کو تین شقوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) سیاسی (۲) اقتصادی (۳) مذہبی۔ چوتھے حصے کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بہت مختصر ہے اور اس حصے میں اقبال کا روئے سخن ہندوستانی مسلمانوں کی طرف ہے۔ پانچویں حصے کو کلام کی جان قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد آخر میں انھوں نے نظم کی تلمیحات کی طرف توجہ کی ہے مثلاً ساسانی، محمود وایاز، قیس ولیلیٰ، حضرت سلمان فارسی اور اویس قرنیؓ وغیرہ۔ بدیع وبیان اور صنائع لفظی ومعنوی کی بھی وضاحت کی ہے۔

عابد صاحب اس کے بعد نظم جوابِ شکوہ کی جانب توجہ کرتے ہیں جس میں خدا کی جانب سے مسلمانوں کی شکایات کا جواب دیا گیا ہے۔ اس میں بھی انھوں نے نظم میں شامل تلمیحی اشاروں کی وضاحت کی ہے، اسلام کے بنیادی حقائق کی جانب بھی توجہ دی گئی ہے۔ اقبال کے کلام میں لا الہ کی علامتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

'نفائسِ اقبال' میں ایک اور نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' ہے۔ نظم کے تجزیاتی مطالعے میں عابد صاحب کہتے ہیں کہ اس میں علامہ اقبال نے ابلیس کی زبانی مسلمانوں کو محکوم ومجبور رکھنے کے طریقے بیان کیے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی ملّی اور معاشرتی کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نظم دوسری جنگِ عظیم سے پہلے لکھی گئی ہے اور ان تمام خرابیوں اور فسادات کا سراغ دیتی ہے، جو دوسری جنگِ عظیم کا باعث ہوئے۔

ان نظموں کے علاوہ عابد علی عابد نے مذکورہ کتاب میں اقبال کے دوسرے موضوعات پر بھی تنقیدی کلام کیا ہے۔ مثلاً اقبال اور مقامِ رسالتؐ، اقبال کے کلام میں مطابقتِ الفاظ ومعانی، اقبال اور فنونِ لطیفہ،

کلامِ اقبال میں لالہ کی علامتی حیثیت، بابا طاہر عریاں اور اقبال، اقبال کے کلام میں رباعی کی اہمیت اور اقبال اور عطار۔ مذکورہ کتاب میں 'اقبال کے کلام میں مطابقتِ الفاظ و معانی' سے متعلق بہت جامع مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی، متنبّی اور ابنِ الرومی کے الفاظ و معانی سے متعلق بیانات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ و معانی کی مطابقت کے متعلق کہتے ہیں کہ:

> ''اقبال کی نگاہ ایسی دور رَس ہے کہ گویا لفظ کے سینے میں اُتر جاتی ہے اور اس کے تمام امکانات کو ٹٹول لیتی ہے۔ پھر جب وہ اپنے مطلب کو اپنے منتخب الفاظ میں ادا کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس مطلب کے لیے یہی الفاظ وضع کیے گئے تھے اور اب ان میں ذرا ترمیم و تغیر کیا گیا تو معانی کے لطیف ترین پہلو تشنۂ اظہار رہ جائیں گے۔''[1]

اقبالیاتی ادب سے متعلق عابد صاحب کی ایک اور کتاب 'شعرِ اقبال' ہے۔ اس کتاب میں عابد علی نے علامہ اقبال کے شعورِ تخلیق کا جائزہ لیا ہے۔ پوری کتاب کو عابد صاحب نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جز اوّل میں اقبال کے خاندانی پس منظر، ابتدائی تعلیم و تربیت، احباب، داغ اور اردو کی شعری روایت اور ابتدائی عوامل تخلیق اور ان کے اثرات کے سلسلے کا جائزہ لیا ہے۔ جز دوم میں یوروپ کا سفر اور فکری انقلاب کا تذکرہ ہے۔ جز سوم میں اقبال کے شعور تخلیق کا ابلاغ و اظہار کا عنوان قائم کیا ہے، جس کے تحت انھوں نے مطابقت الفاظ و معانی، علائم و رموز، صنعت گری، تشبیہات و استعارات، محسناتِ شعر (صنائع و بدائع) لفظی و معنوی، خیال افروزی اور ایجاز و حذف کے بارے میں لکھا ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے کہ عابد صاحب کو اصل شہرت 'تلمیحاتِ اقبال' کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں عابد صاحب نے اقبال کے تمام شعری مجموعوں میں بیان کردہ تلمیحی اشاروں خواہ وہ تاریخی شخصیات ہوں یا تاریخی مقامات اس کے علاوہ اس میں عابد صاحب نے چرند پرند، پھولوں اور قرآنی آیات کی بھی وضاحت کردی ہے۔ مثلاً 'لَن ترانی' کی توضیح اس طرح کی ہے:

۱۔ نفائسِ اقبال۔ عابد علی عابد۔ مرتبہ شیما مجید، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص ۲۹۔۲۸

Aligarh Muslim University

''سورۂ اعراف میں ظہورِ تجلی اور حضرت موسیٰ کا ذکر ہے۔ مقام یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ وحی کے اشارے سے کوہِ طور پر پہنچے اور اعتکاف پورا ہو گیا تو خدائے تعالیٰ نے ان سے کلام کیا۔ حضرت موسیٰ نے دیدار سے بھی شرف اندوز ہونا چاہا اس وقت خدا نے کہا: 'لَن ترانی' تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

ظہور تجلی ہوا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا، حضرت موسیٰ کو غش آ گیا۔ اس کے بعد جناب پر تورات نازل کی گئی۔ لَن ترانی، تجلی، طور، ایمن ان الفاظ میں جو ذخیرۂ تلمیحات کا مخفی ہے اس سے فارسی اور اردو کی ادبی روایت نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ولی کی غزل سے لے کر تاثیر کی نظم ید بیضا تک ان تلمیحات کے آثار و نشانات ملتے ہیں۔''[1]

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے عابد صاحب نے کلامِ اقبال میں استعمال کردہ تلمیحات کو قارئین کے لیے عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے جو اقبالیات کے سرمایے میں بہت اہمیت کی حامل اور قیمتی اضافہ ہے۔

عابد علی عابد کا انتقال ۲۰ رجنوری ۱۹۷۱ء میں ہوا۔

○

۱۔ تلمیحاتِ اقبال۔ عابد علی عابد، مطبوعات بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۸۳

پروفیسر مسعود حسین خاں

پروفیسر مسعود حسین خاں، جدید اردو لسانیات میں ایک اہم اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۲۸ر جنوری ۱۹۱۹ء میں قائم گنج، ضلع فرخ آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ دہلی سے حاصل کی، اس کے بعد مسعود صاحب نے ڈھاکہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر دہلی کے اینگلو عربک کالج سے بی.اے کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد علی گڑھ آ گئے۔ ۱۹۴۱ء میں ایم.اے اردو سے کیا اور پھر یہیں عارضی طور پر تقرر ہو گیا۔ اسی ملازمت کے دوران ۱۹۴۵ء میں مسعود صاحب نے اپنا مقالہ مکمل کیا اور شعبۂ اردو میں مستقل لکچرر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۵۲ء میں مسعود صاحب نے پیرس یونیورسٹی سے لسانیات میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اردو لسانیات کے میدان میں مسعود صاحب کی غیر معمولی تصنیفی اور تالیفی خدمات کو ہمیشہ سراہا گیا۔ وہ بلند پایہ عالم اور صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ اس کے علاوہ محقق بھی ہیں اور اسلوبیاتی نقاد بھی۔ علمی حلقوں میں ان کی شخصیت لسانیات، صوتیات اور خصوصاً 'مقدمۂ تاریخ زبان اردو' کی وجہ سے متعارف ہوئی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس میں گزرا۔ اردو لسانیات کے میدان میں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اپنے مطالعے کے سلسلے میں انھوں نے یورپ، فرانس اور انگلستان وغیرہ کے سفر بھی کیے۔ ان کی لسانی خدمات کے کئی پہلو ہیں، جن میں تاریخ زبان اردو، صوتیات، اسلوبیات، دکنیات اور قدیم متون کے لسانی مطالعے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تدوین لغت اور اردو رسمِ خط کے مسائل سے بھی مسعود صاحب کو خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ اس سلسلے میں 'دکنی اردو لغت' اور 'قدیم اردو' اہم ہیں۔ مسعود صاحب کا سب سے بڑا لسانیاتی کارنامہ ان کی تحقیقی کتاب 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو زبان کو جدید لسانی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اردو کے آغاز کے بارے میں الگ نظریہ دیا ہے۔ اس کتاب پر انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ.ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ اس کتاب میں اردو زبان کے ارتقا سے

متعلق وہ خود کہتے ہیں کہ:

''اردو کا سلسلہ کھڑی بولی کے توسط سے شورسینی اپ بھرنش سے ملتا ہے جو ۱۰۰۰ء کے قریب مدھیہ پردیش (انبالہ تا الٰہ آباد اور دہرہ دون تا اجین کا علاقہ) کی سب سے مستند زبان تھی۔ اس لیے ہند آریائی کے محققین نے اردو کے کھڑی بولی روپ کی نشان دہی کا سلسلہ اپ بھرنش کی ادبیات سے کیا ہے۔''[۱]

اردو صوتیات کی طرف بھی مسعود صاحب نے خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے کی ایک اہم انگریزی کتاب Phonetic and Phonological Study the Word in Urdu کے نام سے شائع ہوئی جس کا ترجمہ مرزا خلیل احمد بیگ نے 'اردو لفظ کا صوتیاتی نظام' کے نام سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان سے متعلق ایک اور اہم کتاب 'اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ' اور 'اردو زبان تاریخ، تشکیل و تقدیر' کے نام سے لکھی۔ لسانیات و صوتیات کے علاوہ مسعود صاحب نے اسلوبیات کے میدان میں بھی خاصی ترقی کی۔ انھوں نے اسلوبیات سے متعلق اردو میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس قسم کے مضامین ان کی کتاب 'شعر و زبان' میں شامل ہیں۔ اسلوبیات کے نظری پہلوؤں کو اردو میں عام کرنے کے علاوہ مسعود صاحب نے اسلوبیاتی تجزیوں کے بہترین نمونے بھی پیش کیے جن میں غالبؔ، اقبالؔ اور فانیؔ کے کلام کے تجزیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسلوبیاتی مطالعہ و تجزیے کا ایک بہترین نمونہ ان کی کتاب 'اقبال کی نظری و عملی شعریات' ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و وقعت کے پیشِ نظر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس کتاب میں وہ خود ایک جگہ اقبال کے متعلق لکھتے ہیں:

''جگہ جگہ فارسی کے مصرعے اور اشعار اردو کے دریا میں اس طرح موجزن ہو جاتے ہیں جیسے اردو اور فارسی کے ڈانڈے شاعر کے تخلیقی عمل میں ایک دوسرے سے مل گئے ہوں۔ بڑی نظمیں ہوں کہ چھوٹی نظمیں اقبال کی زبان تغزل کی داخلیت اور فارسی شاعری کی صدائے بازگشت لیے ہوئے ہے۔''[۲]

۱۔ مقدمۂ تاریخ زبان اردو۔ مسعود حسین خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص: ۷۱

۲۔ اقبال کی نظری و عملی شعریات۔ مسعود حسین خاں، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۳ء، ص: ۷۰

مسعود صاحب نے لسانیاتی واسلوبیاتی نقطۂ نظر سے علامہ اقبال کی دو نظموں کی باز آفرینی کی، پہلی نظم خضرِ راہ ہے اور دوسری مسجدِ قرطبہ۔

لسانیاتی تجزیے کے لیے مسعود صاحب نے ناقد شعر کے لیے دو قسم کی صلاحیتوں سے متصف ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اوّل زبان کی تشکیل اور اس کے شاعرانہ استعمال سے واقفیت اور دوم شعری ہم گدازی (Empathy) اور پھر ان دونوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

نظم 'خضرِ راہ' کا آغاز ۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے اور اس کی تباہ کاریوں کے ذکر سے کرتے ہیں۔ مسعود صاحب کہتے ہیں کہ انھیں حالات اور ذہنی کشاکش کو ذہن میں رکھ کر اقبال نے نظم لکھی ہے۔ مسعود صاحب نے اس مقام پر شاعر کے کلام کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں اقبال کی شاعری اور دوسرے میں ان کی فکر و فلسفہ۔ نظم کے پس منظر کی وضاحت کے لیے انھوں نے ۱۹۱۹ء کے 'گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ' اور 'ڈیوک آف کیناٹ' کا تذکرہ کیا ہے۔ سرمایہ و محنت کے ضمن میں ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کا ذکر کیا ہے اور آخر میں سجاد انصاری کا یہ قول نقل کیا ہے:

''اگر قرآن اردو میں نازل ہوتا تو اقبال کی نظم یا ابوالکلام کی نثر کا پیرایہ اختیار کرتا۔''[۱]

پھر مسعود صاحب نظم کے اصل مضمون کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ انھوں نے نظم کو پانچ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے، بھی نظم کی ہیئت کی جانب بھی توجہ کرتے ہیں۔ انھوں نے نظم کی ڈرامائی فضا کی وضاحت کرتے ہوئے اسی تسلسل میں مسعود صاحب نظم کی منظر نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے 'محمود و ایاز' اور 'موسیٰ و طلسم و سامری' کی تلمیحات کی وضاحت کی ہے۔

خضرِ راہ کے بعد انھوں نے 'مسجدِ قرطبہ' کو لیا ہے۔ ابتدا میں سالِ تصنیف پر روشنی ڈالی ہے اور اقبال پر برگساں اور آئنسٹائن کے اثرات کو بھی دکھایا ہے۔ برگساں اور اقبال کی ملاقات اور دونوں کے درمیان زمان و مکان سے متعلق جو گفتگو ہوئی اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اقبال کے سیاحتِ اسپین پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے نظم مسجدِ قرطبہ کے تجزیے کے آغاز ہی میں اس کی ہیئت پر روشنی ڈالی ہے۔ نظم میں اس کی شان و شکوہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ دوسرے بند میں عشق کی نیرنگیوں کی پیش کش میں اقبال نے جن نکات کو واضح کیا ہے،

۱۔ اقبال کا فن۔ گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ایڈیشن دوم ۱۹۸۹ء، ص: ۵۶

اس پر مسعود صاحب نے جامع تبصرہ کیا ہے۔اسی تسلسل میں سیلِ زمان، مردِ خدا اور سیلِ عشق کے مجرد تصورات کا تذکرہ کیا ہے۔ مسجدِ قرطبہ کو دیکھ کر اقبال پر جو رقت طاری ہوتی ہے اس کا بھی پُر زور بیان ہے۔ چوتھے بند میں اقبال کی جمالیات کی طرف اشارہ ہے۔ مسعود صاحب اس بند کی فضا کو عربی جمالیات کے عین مطابق قرار دیتے ہیں، اس میں عربی شہ سواروں کا تصور انھیں طارق بن زیاد کی یاد دلاتا ہے۔ مسعود صاحب لوتھر کی اصلاحِ دین کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے مسولینی کے فاشسٹ انقلابی نظریے کو بھی بیان کرتے ہیں۔ آخری بند، جس میں مناظر قدرت کے بیان اور دریائے کبیر کا ذکر ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ: ''اس بند میں نہایت گہرے اور شوخ چھینٹوں سے یہ پس منظر تیار کیا گیا ہے۔'' اس میں ایک نئے انقلاب کی بشارت بھی دی گئی ہے۔

مسعود صاحب کہتے ہیں کہ یہ نظم ''اقبال کا ایک ایسا خواب ہے جس میں رومان بھی ہے اور خیال بھی، تاریخ بھی ہے اور یقین بھی اور سب سے بڑھ کر فتح مبین ہے۔''

آخر میں مسعود صاحب نے مذکورہ دونوں نظموں پر اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''نظم کا خاتمہ نہایت فن کارانہ انداز میں ہوتا ہے جب کہ خضر راہ ایک قسم کی رجائی خطابت پر ختم ہوتی ہے۔ مسجدِ قرطبہ ایک بشارت پر 'خضر راہ' میں اقبال رہبر ہے 'مسجد قرطبہ' میں پیمبر!''[1]

اقبالیات کے ضمن میں ان کا وہ انتخاب بھی قابلِ ذکر ہے جس کو انھوں نے ۱۹۹۵ء میں 'انتخاب کلامِ اقبال' کے نام سے پیش کیا۔ اس میں انھوں نے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کی نظموں، غزلوں اور رباعیات کا انتخاب شامل کیا ہے۔ اس انتخاب کے پیشِ کلام میں اقبال کی نظموں اور غزلوں پر انھوں نے ایک جگہ اس طرح تبصرہ کیا ہے:

> ''اقبال نے اردو شاعری کی روایات کا پورا اہتمام رکھا ہے۔ نظم کے تسلسل اور وحدت کو بیش تر انھوں نے متداول اصنافِ سخن کے ذریعے ہی نمایاں کیا ہے۔ 'شکوہ' کے مسدس میں ایک ہی موضوع کا تسلسل ملتا ہے۔ 'شمع اور شاعر' اور 'خضر راہ' میں ایک دوسری صنف 'ترکیب بند' میں انھوں نے غزل کی غنائیت بھر دی ہے۔''[2]

۱۔ اقبال کا فن۔ گوپی چند نارنگ، ص: ۶۷

۲۔ مسعود حسین خاں (مرتبہ)، انتخاب کلامِ اقبال۔ سرسید بک ڈپو، جامعہ اردو، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص: ۷

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا مسعود صاحب ایک ماہر لسانیات کے ساتھ ساتھ دکنیات کے بھی ماہر تھے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں، مولوی عبدالحق اور سید محی الدین قادری زور کے بعد دکنیات کی طرف توجہ دی جس کی عمدہ مثال عبدل دہلوی کا 'ابراہیم نامہ' ہے۔ اس کی انھوں نے سائنٹفک طرز پر تدوین کی۔ اس کے علاوہ 'دکنی اردو لغت' کی تدوین بھی مسعود صاحب کا نادر کارنامہ ہے۔ 'قدیم اردو' کے نام سے بھی مسعود صاحب نے تین جلدیں شائع کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے دکنی اردو کا لسانیاتی جائزہ بھی لیا۔ اس سلسلے میں غواصی کا کلام، ابلیس نامہ، عاجز کی لیلیٰ مجنوں، قدیم اردو اور دکنی رباعیات ان کے امتیازی کارنامے ہیں۔

دکنی اردو کے علاوہ مسعود صاحب نے شمالی ہند کے قدیم متون مثلاً قصۂ مہر افروز و دلبر، بکٹ کہانی اور عاشور نامہ کی بھی تدوین کی۔

مسعود صاحب نے 'ورودِ مسعود' کے نام سے خودنوشت سوانح عمری لکھی، جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات، تجربات اور تاثرات کو بہت تفصیل سے پیش کیا ہے، جس میں ان کے تمام امتیازات کے ساتھ ساتھ تعصّبات بھی ہیں۔

مسعود صاحب کی ایک حیثیت شاعر کی بھی رہی ہے۔ 'دو نیم' ان کا شعری مجموعہ ہے، جس میں ان کے فکر و فن کی نیرنگیاں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔

مسعود صاحب کو بھی اپنی کاوشوں کے سلسلے میں متعدد اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ''اقبال کی نظری و عملی شعریات'' پر ملا۔ ۱۹۸۶ء میں حکومتِ پاکستان نے انھیں نیاز فتح پوری ایوارڈ سے نوازا اور ۲۰۰۹ء میں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔ ان کے علاوہ مسعود صاحب گیان پیٹھ کی اردو مشاورتی کمیٹی کے دس برس تک رکن رہے ہیں۔

مسعود حسین خاں کا انتقال ۱۶/ اکتوبر ۲۰۱۰ء میں علی گڑھ میں ہوا۔

○○○

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

عربی اور اردو کے مشہور مصنف، بلند پایہ ادیب و عالم، صاحبِ طرز اسلوب نگار، مورّخ و سیرت نگار اور عظیم دانش ور، داعی، مصلح اور مفکر مولانا ابوالحسن علی ندوی عرف 'علی میاں' مطالعاتِ اقبال میں بہت اہمیت رکھتے ہیں، وہ بہت بڑے مقرر بھی تھے۔ ان کی تصانیف کی ایک عالمانہ شان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ پایہ کے ادیب بھی تھے۔ عربی زبان پر ان کو زبردست قدرت و مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے بہ یک وقت اردو اور عربی دونوں زبانوں میں یکساں قدرت و کمال کا ثبوت دیا ہے۔

مولانا علی میاں ندوی سیدنا حسنؓ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے دادا سید فخر الدین خیالی ایک ثقہ عالم، صاحبِ حال بزرگ اور مصنف تھے۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب بھی اپنے والد ماجد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بہت سی کتابوں کے مصنف ہوئے۔ وہ اردو میں اپنے 'تذکرہ شعرائے اردو' اور 'گلِ رعنا' کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق مولانا علی میاں کو ورثے میں ملا۔

مولانا علی میاں مرحوم ۶ رمحرم ۱۳۳۳ھ/ ۲۵ رنومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم یعنی اردو، فارسی اور حساب گھر پر اپنے عزیزوں کے ذریعے ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے سوتیلے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی اور والدہ محترمہ کا بڑا عمل دخل رہا۔ خاندان کے علمی ماحول نے کم سن علی میاں میں عربی زبان سے محبت و شیفتگی پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، فراغت و تکمیلِ تعلیم کے بعد اسی درس گاہ میں تدریسی سلسلہ شروع کیا اور تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر اور تحقیق و تدریس میں دن بہ دن ترقی کرتے گئے، یہاں تک کہ جامعہ کی انتظامی ذمہ داریاں بھی انھوں نے سنبھال لیں اور بڑی شان اور عالمانہ عظمت کے ساتھ یہ ذمہ داریاں تادم حیات ادا کرتے رہے۔ مولانا محترم دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ کے ناظم، دارالعلوم دیوبند، مدینہ یونیورسٹی اور المجمع العلمی دمشق کی شوریٰ کے معزز رکن رہے، تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بھی اپنی فیض رسانی سے محروم نہیں رکھا۔ اسی طرح

مدارس عربیہ، دینی تعلیمی تحریک، مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی اور بہت سے علمی اداروں کے روحِ رواں بھی رہے۔ مولانا علی میاں ہندوستان کی دینی تحریکوں سے بھی وابستہ رہے، جماعت اسلامی اور مولانا مودودی سے بھی تعلق رہا۔ تبلیغی جماعت سے مولانا کو دلی لگاؤ تھا۔

ملک وملّت کے لیے مولانا کی خدمات بہت ہی وسیع اور متنوع ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ نمایاں، ناقابلِ فراموش اور دائمی اہمیت کے حامل ان کے تصنیفی کارنامے ہیں۔

مولانا علی میاں کی ڈیڑھ سو سے زائد کتب ورسائل میں ایک کثیر تعداد عربی کتابوں کی ہے۔ ان میں مشہور ترین تصنیف 'ما ذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' ہے، اس کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مولانا نے اردو میں پہلی کتاب 'سید احمد شہید' لکھی۔ انھوں نے قرآن، حدیث، سیرت، فقہ، تاریخ، سوانح، تعلیم، تہذیب اور عمرانیات کے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ کی دعوت پر وہاں ایک مبسوط علمی مقالہ پڑھا جو بعد میں 'دین و مذہب' کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا نے 'تاریخ دعوت وعزیمت' کی پانچ جلدیں لکھیں۔ ان کا یہ عظیم، منفرد اور اہم علمی کارنامہ ہے۔ انھوں نے عربی زبان کی تدریس کے لیے نصابی کتابیں مرتب کیں، اس سلسلے میں مختارات، قصص النبین اور القرأۃ الراشدہ بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ مولانا مرحوم نے عصرِ حاضر کے بزرگ مشائخ کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں، ان میں حیاتِ عبدالحیٔ، تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، سوانح حیات حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا کاندھلوی اور حضرت نظام الدین اولیا وغیرہ لکھ کر ان علما کی زندگی کو قابلِ تقلید بنایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد سفرنامے بھی تحریر کیے۔ علی میاں ندوی کی تصنیفات اور تالیفات میں 'کاروانِ زندگی' کو انفرادیت کا درجہ حاصل ہے جو کہ ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا اپنی نگارشات میں بہ یک وقت عالمِ دین، مفکر اسلام، محقق، مصلح، ادیب اور انشاپرداز نظر آتے ہیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے مولانا پہلے عالمِ دین ہیں، جنھوں نے اردو اور فارسی کے عظیم شاعر و مفکر اقبال کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت کے ساتھ کیا۔ اگر مولانا علی میاں کو اقبال کی تعبیر بلکہ خود اقبال کی اصطلاح میں 'مردِ مومن' کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ دراصل ان کی تمام تصانیف میں اقبال کی فکر اور ان کے پیغام ہی کی روح کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ اقبال کے

بعض مصرعے اور ٹکڑے بھی علی میاں کی تقاریر و مضامین کا عنوان بنتے ہیں۔ مثلاً پا جا سراغِ زندگی، کسی جمشید کا ساغر نہیں میں وغیرہ۔ مولانا علی میاں اقبال کے لب ولہجہ سے بھی متاثر تھے، جس کا اندازہ کی تحریر و تقریر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں اقبال کی ایک نظم 'چاند' کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، جسے خود اقبال نے دیکھا اور وہ مولانا سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا علی میاں کو کلامِ اقبال سے زندگی بھر شغف رہا۔ وہ اپنے جذبات واحساسات کی وضاحت کے لیے اپنی گفتگو میں برجستہ طور پر اقبال کے اشعار شامل فرماتے تھے۔

علی میاں ندوی نے عربی ادب میں قابلِ قدر اور وقیع کارنامے انجام دیے لیکن اقبال فہمی میں اردو کا کوئی بھی مصنف آپ کی برابری نہیں کرسکتا۔ مولانا نے اقبال سے متعلق عربی میں بھی اپنے مطالعات اور ان کے تاثرات پیش کیے اور 'روائع اقبال' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو دمشق سے شائع ہوئی بعد میں اس کے متعدد ایڈیشن چھپے۔ 'شمس تبریز خاں' نے 'نقوشِ اقبال' کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ پیش کیا اور اس کتاب کو اہلِ اردو نے بہت پسند کیا اور یہ بڑی مقبول ہوئی۔ اس کتاب سے پہلے مولانا نے مصر کے سفر میں اقبال پر دو مبسوط مقالے، عربی میں پڑھے جو پہلے ایک مختصر کتابی صورت 'شاعر الاسلام اقبال' کے نام سے شائع ہوئے اور بعد میں مولانا نے اقبال پر متعدد مضامین کے علاوہ مسجدِ قرطبہ اور ذوق وشوق جیسی نظموں کے تجزیے اور مطالعے پیش کیے۔ اس کتاب میں انھوں نے اقبال کے 'انسان کامل' کے تصور پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس طرح یہ ایک مکمل کتابی شکل میں 'روائع اقبال' کے نام سے وجود میں آئی۔ اس سے روحِ اقبال عربوں میں منتقل ہوئی۔ مولانا علی میاں نے فکرِ اقبال کی روح کو جس خوبی وخوب صورتی سے اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کی داد اردو کے متعدد بڑے ادیبوں اور نقادوں نے دی ہے۔ رشید احمد صدیقی 'نقوشِ اقبال' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا پہلے عالمِ دین ہیں جس نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندے اور عظیم شاعر اقبال کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت سے کیا ہے..... سید صاحب کا ذہن جدید، ذہن کے تقاضوں سے آشنا ہے اور اس کا لحاظ رکھتا اور احترام کرتا ہے۔''[۱]

۱۔ نقوشِ اقبال (ترجمہ)۔ شمس تبریز خاں، مجلسِ نشریات اسلام لکھنؤ، طبع دوم، ۱۹۷۰ء، ص: ۱۴

مولانا نے 'روائع اقبال' میں کلامِ اقبال کے ان حصوں کو خصوصیت سے شامل کیا، جو عربوں سے متعلق تھے، کیوں کہ انھوں نے خاص طور سے اہلِ عرب کو اقبال سے متعارف کرانے کے لیے درج ذیل مضامین لکھے تھے۔ مسجدِ قرطبہ، ذوق وشوق، طارق کی دعا، ابوجہل کی نوحہ گری اور مسافر وغیرہ۔ انھوں نے اس عہد کے عرب کی مسموم اور مکدر فضا کے اثرات کو فکر اقبال کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی۔ روائع اقبال کو عرب دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

مولانا علی میاں نے 'نقوشِ اقبال' کا مقدمہ لکھتے ہوئے کلامِ اقبال سے اپنی دلچسپی اور ان کی شاعری سے جذباتی سطح پر مغلوب ہونے کا حال کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے:

> ''میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لیے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں۔ ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادّی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں۔ وہ اسلام کی عظمتِ رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گزشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر وقومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔''[1]

نقوشِ اقبال (ایڈیشن دوم) میں مبصرین حضرات نے اپنی ناقدانہ رایوں کا اظہار کیا ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کہتے ہیں کہ:

> ''انھوں نے (مولانا مرحوم علی میاں ندوی) اُن کی (اقبال) اہم نظموں اور متفرق اشعار سے اسلام کی بنیادی تعلیمات ان کی روح اور ملت اسلامیہ کی تجدید واصلاح، مغربی تہذیب اور اس کے علوم وغیرہ کے متعلق اقبال کے افکار وخیالات کا خلاصہ اور لب لباب پیش کر دیا ہے، جس سے اس کے اہم رُخ سامنے آجاتے ہیں۔..... اقبال کے مقصد، پیام اور افکار وتصورات کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہیں۔''[2]

۱۔ نقوشِ اقبال (ترجمہ)۔ شمس تبریز خاں، ص:۳۲

۲۔ ایضاً۔ ص:۱۱۔۱۲

مولانا علی میاں نے اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے فکر و کلامِ اقبال کا جائزہ لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ ذہن اقبال کی سوچ سے بڑی مطابقت رکھتا ہے۔ ذوق وشوق، مسجدِ قرطبہ، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ان تینوں نظموں میں اقبال کے فکر وفن کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ مولانا نے اقبال کی فارسی نظم 'حرفے چند باامت عربیہ' کو 'اقبال کا پیغام بلادِ عربیہ' کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اقبال نے اس نظم میں عربوں کے بارے میں اپنی جن خواہشات کا اظہار کیا ہے، مولانا نے انھیں اجاگر کیا ہے۔ مولانا ندوی نے اس نظم کے مطالب کا تجزیہ بڑے موثر انداز میں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''وہ کون سی قوم ہے جس کے نام پہلے پہل قرآن جیسا مقدس صحیفہ اترا؟ وہ کون سی جماعت ہے، جسے اللہ نے توحید کا راز دار بنایا اور جس نے معبودانِ باطل کی خدائی سے اعلانیہ انکار کر کے ان کی عظمت کا تختہ الٹ دیا..... اور یہ سب ایک نبی اُمّی کا زندہ معجزہ ہے جس نے اس صحرا کو چمن زار بنا دیا۔ جہاں حریت ومساوات کی ہوا چلی اور جہاں تہذیب نے آنکھیں کھولیں۔''[1]

مولانا ندوی کی پوری کتاب عالمانہ افہام وتفہیم کے ساتھ تاثراتی تنقید وتحسین کی بہترین مثال ہے۔ علی میاں نے اقبال فہمی کے لیے صرف ان کی شاعری کو اپنا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اقبال کی نثری کاوشیں مثلاً 'اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید' اور 'ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعات کا ارتقا' جیسی اہم فلسفیانہ کتابیں بھی ان کے پیش نظر رہیں۔

مولانا کے نزدیک اقبال عزم، محبت اور ایمان کا شاعر ہے۔ ان کی تصانیف میں اقبال کی فکر اور فلسفے کے متعدد پہلو جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ایک خاص عقیدے کے ساتھ قلبی وابستگی اور اقبال کے ساتھ فکری وذہنی ہم آہنگی کی بنیاد پر لکھا۔

مولانا کا اسلوبِ تحریر عالمانہ، داعیانہ اور مصلحانہ ہے۔ ان کی تقاریر کا مجموعہ 'حدیثِ پاکستان' کے نام سے شائع ہوا۔ ان تقریروں میں بھی وہی برجستگی اور ادبی شان نظر آتی ہے جو مولانا کی تحریروں کا خاصا ہے۔ مولانا ایک عجمی تھے مگر ان کی عربی نگارشات نے عالم عرب کے صاحبانِ ادب وانشاء سے جو خراجِ عقیدت وصول کیا ہے، وہ زمانہ قریب میں کسی دوسرے غیر عرب مصنف کو حاصل نہیں ہوا۔

۱۔ نقوشِ اقبال (ترجمہ)۔ شمس تبریز خاں، ص: ۱۶۰

مولانا علی میاں کو ان کی مخلصانہ اور دردمندانہ کاوشوں کی وجہ سے ۱۹۷۹ء میں 'شاہ فیصل ایوارڈ' سے نوازا گیا اور ۱۹۹۹ء میں دبئی کی حکومت نے انھیں ۱۹۹۸ء کی سب سے بڑی 'اسلامی شخصیت' قرار دیا۔ اس کے علاوہ انھیں کشمیر یونیورسٹی نے پی ایچ.ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۹۹ء میں آکسفورڈ اسلامک سینٹر نے انھیں سلطان برونائی ایوارڈ سے بھی نوازا۔

مختصراً یہ کہ مولانا ایک ایسے بالغ نظر روشن خیال اور وسیع النظر مفکر تھے، جنھوں نے مختلف زاویوں سے ذاتی اصلاح پر زور دیا اور وہ اسلام کی علمی تعبیر کے ساتھ کے شدت سے قائل تھے۔ انھوں نے زندگی بھر ایمان ویقین، عزم وحوصلے، خودشناسی وخداشناسی، دردوسوز اور جرأت وفراست کا درس دیا، جس کی تلقین ہمیں کلامِ اقبال میں ملتی ہے۔ ان کی اپنی زندگی ایک نئے جہان کی آرزومندی سے عبارت تھی اسی لیے انھیں 'ترجمانِ اقبال' کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

علی میاں ندوی کا انتقال ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو ہوا۔

○

محمد بدیع الزماں

اقبال کے فکر وفن پر لکھنے والوں میں ہند و پاک کی قد آور شخصیتوں میں 'محمد بدیع الزماں' کا نام بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا شمار ان اقبال شناسوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے علامہ اقبال پر تقریباً سترہ کتابیں لکھیں۔ قرآن کی تفسیر، اسلامی تاریخ اور سیاست سے بھی انھیں خاص شغف رہا۔ اقبال کے علاوہ غالب، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، فیض احمد فیض بھی ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ موصوف کو تبصرہ نگاری اور تجزیہ نگاری میں بھی امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

بدیع الزماں صاحب ضلع مظفر پور موضع مہر تھا میں ۲۲/اگست ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کی۔ پٹنہ سے ہی بی.اے اور ایم.اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال سرکاری ملازمت میں بھی داخل ہوگئے۔ بدیع الزماں صاحب بہار سول سروس سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۸۰ء تک ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز رہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۹ء سے ہوگیا تھا لیکن وہ سرکاری ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ہی باقاعدگی سے اس طرف راغب ہوئے۔

اقبالیات کے حوالے سے محمد بدیع الزماں کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے اقبال کی شاعری، فکر وفن اور دیگر کارناموں کا ایک نئے انداز سے جائزہ لیا ہے۔ اگر چہ انھوں نے مختلف موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر ان کے یہاں مرکزیت ''اقبالیات'' کو ہی حاصل ہے۔ وہ اقبال کو ''خاتم الشعرا'' سمجھتے تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی روشنی میں کلامِ اقبال کا جائزہ لیا اور ان سے متعلق تقریباً چار ہزار صفحات لکھے۔ اقبال پر ان کے مضامین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ ہے۔ ان میں سے بہت سے مضامین کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔ کلامِ اقبال کے سیکڑوں اشعار میں قرآن کریم کی آیتوں کے حوالے تلاش کیے اور قارئین کے سامنے رکھے۔ اسی طرح اقبال کے یہاں احادیث نبویؐ کے جو حوالے ملتے ہیں، ان کی بھی وضاحت کی ہے۔ زماں صاحب کے اقبالیات سے متعلق ان کی تصانیف کے عنوانات بھی مذہبی رنگ و آہنگ

لیے ہوئے ہیں مثلاً مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ، رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی، عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی وغیرہ۔ ظاہر ہے یہ تمام عنوانات کلامِ اقبال سے ہی ماخوذ ہیں۔ یہ بات ہر جگہ محسوس ہوتی ہے کہ زماں صاحب نے اقبال کو فکرِ اسلامی کا ترجمان اور شاعرِ قرآن تسلیم کرتے ہوئے آیاتِ قرآنی کی روشنی میں کلامِ اقبال کی توضیح وتشریح کی۔ اقبال پر ان کی سب سے پہلی تصنیف 'پیامِ اقبال' ہے جو ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے اپنی کتاب 'رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی' میں اقبال کے تصورِ خودی سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اقبال نے اسلام کی حقیقی تہذیب کی اساس پر 'خودی' کے تصور کو از سرِ نو مرتب کیا اور جدید اسلامی فکر کو اس کا تصور دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کے انحطاط اور زوال اور ان کے اپنے مرتبے اور مقام کی طرف سے بے خبری کو نفیِ خودی سے تعبیر کیا اور اس کا علاج اثباتِ خودی یا احساسِ نفس قرار دیا۔''[۱]

محمد بدیع الزماں نے اشعار کی تفہیم میں قرآن کی باریکیوں میں اُترنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ان کے مضامین کے عنوانات سے بھی لگایا جاسکتا ہے، مثلاً اقبال کے کلام میں ابلیس کا کردار، اقبال کا نظریۂ فن وادب، اقبال کے کلام میں یقین کی اصطلاح وغیرہ۔

زماں صاحب نے کلامِ اقبال میں موجود اشعاروں، کنایوں اور علامتوں کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح اقبال کی تراکیب کی بھی شرح کی اور ان کے کلام میں شامل قرآنی تلمیحات پر روشنی ڈالی، اس کے ساتھ ساتھ جغرافیائی مقامات اور اہم شخصیات سے منسوب تلمیحات واشارات کو وضاحت سے بیان کیا۔

موصوف نے اقبال کو شاعرِ قرآن کی حیثیت سے بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور کلامِ اقبال کی مختلف جہتوں سے تشریح کی ہے۔ انھوں نے قرآن پاک کے علاوہ احادیثِ نبوی کے حوالوں سے بھی کلامِ اقبال کی تشریح، توضیح اور تفسیر پیش کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''کلامِ اقبال میں 'دل' کی اہمیت سراسر قرآن پر مبنی ہے اس لیے کہ قرآن کی رو سے 'دل' سوچ سمجھ کر انسان کو حقیقت تک پہنچانے میں واحد رہنما ہے۔ دل کے فرض منصبی کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے۔

۱۔ رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی۔ محمد بدیع الزماں، دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، یوپی ۲۰۰۳ء، ص: ۱۰

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے والے دل دیے۔ (سورۃ المومنون: ۲۳، رکوع: ۵)

اس گوشت کے ٹکڑے یعنی دل کے متعلق رسولؐ نے فرمایا: ''انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے اور اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے۔'' (مشکوٰۃ شریف)[1]

زماں صاحب کی تحریریں سادگی اور صفائی سے معمور ہیں، ان میں علمیت کی نمائش نہیں ہوتی۔ موصوف نے علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انھوں نے اپنے اکثر و بیش تر اشعار میں قرآنی موضوعات کی ترجمانی کی ہے۔ اقبالیات کے موضوع پر انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، ان میں گزشتہ اوراق میں مندرج کتابوں کے علاوہ دو مزید کتابیں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ''اقبال کے کلام میں قرآنی تلمیحات اور قرآنی آیات کے منظوم ترجمے'' اور دوسری ''اقبال کی جغرافیائی اصطلاحات اور شخصیتوں سے منسوب اصطلاحات'' یہ دونوں کتابیں بھی اقبال اور کلامِ اقبال کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بدیع الزماں صاحب اپنی کتاب ''اقبال کا پیام نوجوانانِ اسلام کے نام'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اقبال کا مطمحِ نظر اپنی شاعری سے مسلمانوں کے مردہ جسم میں قرآنی روح بیدار کرنا اور ان کے دلوں میں عشقِ رسولؐ کا سوز پیدا کر کے ان کو خودی کی ترتیب کیے جانے کی ترغیب تھی..... فقر، قرآنی روح، خودی، عشقِ رسولؐ، سلطانی اور جہانبانی اقبال کے نظامِ فکر میں ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں اور ان کڑیوں کو ایک دوسرے میں سمو کر پیش کرنا ہی ان کا سارا پیام ہے۔''[2]

بدیع الزماں صاحب ماہر اقبالیات ہی نہیں اور صرف اردو ادب پر ہی ان کی گہری نگاہ نہیں بلکہ دوسرے علوم و فنون پر بھی ان کے تصنیفی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔

۱۔ مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ (اقبال کے اشعار قرآن کی روشنی میں)۔ محمد بدیع الزماں، دانش بک ڈپو، ٹانڈہ ۲۰۰۲ء، ص: ۶۵

۲۔ اقبال کا پیغام نوجوانانِ اسلام کے نام۔ محمد بدیع الزماں، دانش بک ڈپو، ٹانڈہ ۱۹۹۶ء، ص: ۸

ملک و بیرون ملک کے مختلف رسائل، جرائد، اخبارات واشتہارات میں ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی رسالوں میں بھی ان کے مقالے شائع ہوتے رہے ہیں۔ نثر نگاری کے میدان میں زماں صاحب نے مختلف پہلوؤں پر اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔

زماں صاحب کے مطالعہ میں وسعت، سوچ میں گہرائی اور زبان میں سلاست ہے۔ ان کی عبارت کی خوبی یہ بھی ہے کہ موصوف، عام فہم انداز اور سیدھی سادی زبان میں اپنی بات کہتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف اور اس کے تحت تخلیقی کارنامے پیش کرنے والے ادبا پر بھی بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ انھیں غزل کے مطالعے میں خصوصی دلچسپی رہی ہے اس لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ قصیدہ، مرثیہ، قطعہ و رباعی، انشائیہ، طنز و مزاح اور بچوں کے ادب پر ایسے مضامین لکھے ہیں، جن سے ان کے سنجیدہ مطالعے اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ زماں صاحب نے ممتاز شخصیتوں مثلاً گاندھی جی، نہرو، ابوالکلام آزاد وغیرہ پر بھی قابلِ قدر مضامین لکھے ہیں۔

زماں صاحب بنیادی طور پر مذہبیات اور قرآنیات کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھنے اور پرکھنے کے عادی رہے ہیں، اس لیے مطالعاتِ اقبال میں قدم قدم پر ان کی اس خصوصیت کا اظہار ملتا ہے۔ اسی طرح دین و مذہب کے موضوعات پر کم و بیش ۱۷۷ مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے چند کا ایک انتخاب 'دین و ایمان' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اسی طرح کی ایک کتاب 'مسلمان عورت قرآن کی روشنی میں' خاصی اہمیت رکھتی ہے جس میں عورت کے تشخص، اس کے مسائل، اس کی ذاتی اور ازدواجی زندگی وغیرہ پر کافی معلومات افزا مضامین شامل ہیں۔

انھوں نے اردو کے دیگر ناقدین کی طرح الفاظ و تراکیب کی بحثوں، تشبیہوں اور استعاروں کی گرہ کشائی اور ہیئت و اسلوب کی نادرہ کاری کو اپنا محور نہیں بنایا ہے۔ انھوں نے اردو تنقید میں ایک نئی روش قائم کی ہے کہ الفاظ کے مفہوم اور فن کار کے پیغام کو ہر چیز پر اوّلیت دی ہے۔ ان کے مضامین کی زبان نہایت عام فہم ہے۔

ان کی پہلی کتاب 'پیامِ اقبال' بہار اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے اسے ۱۹۸۶ء میں انعام سے نوازا۔ اس کے علاوہ 'بیت الحکمت' کراچی نے بھی انھیں عزت بخشی اور دیگر ممالک میں بھی آپ کے کارناموں کو سراہا گیا۔

پروفیسر نورالحسن نقوی

پروفیسر نورالحسن نقوی، بیسویں صدی کے ربع آخر کے ایک اہم محقق، مدوّن، مورّخ، نقاد اور اقبال شناس ہیں۔ ان کی پیدائش ۲ رمئی ۱۹۳۲ء کو امروہہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں پر ہوئی۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے بعد موصوف نے مختلف جگہ ملازمت کی، لیکن ان کی باقاعدہ علمی و ادبی ملازمت کا آغاز دہلی کے مسلم سینئر سکنڈری اسکول کی تدریسی خدمات سے ہوا جہاں وہ طویل عرصے تک رہے اور وہیں رہ کر انھوں نے پہلے اردو اور پھر انگریزی دونوں زبانوں میں ایم۔اے کیا اور اس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے۔ اسی سلسلۂ تدریس کے دوران انھوں نے ڈی لٹ کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کر لی تھی۔ یہاں انھوں نے پروفیسر کے عہدے تک ترقی کی اور ۱۹۹۳ء میں اپنے ریٹائرمنٹ کے ساتھ وہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

نقوی صاحب عملی زندگی میں بہت سے مناصب پر فائز ہوئے۔ ادبی صحافت کے میدان میں بھی انھوں نے بہت ترقی کی مثلاً ایک طویل عرصہ تک ''تہذیب الاخلاق'' اور سہ ماہی ''فکر و نظر'' دونوں کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان دونوں رسالوں کے علاوہ فکر و نظر کے ''ناموران علی گڑھ'' کے خاص شمارے بھی ان کی کاوشوں کے مرہونِ منت ہیں۔ ان سب کے علاوہ نقوی صاحب رسالہ ''الفاظ'' کے بھی مجلسِ ادارت میں شامل رہے تھے۔

نقوی صاحب بہ یک وقت بہت سی کتابوں کے مصنف، مؤلف، محقق، نقاد، انشا پرداز، خاکہ نگار، مرتّب اور مترجم تھے۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک اور اس کے متعلق دیگر موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ نقوی صاحب نے ادب و تحقیق کے ساتھ ساتھ ترویج علم کو بھی اپنا فریضہ بنایا جس کی زندہ مثال علی گڑھ میں ''ذاکر حسین سینئر سکنڈری اسکول'' کا قیام اور اس کی ترقی ہے۔ وہ طویل عرصہ بلکہ زندگی کے آخری لمحوں تک اس اسکول کے منیجر رہے۔

ان گونا گوں صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ نقوی صاحب کی ایک حیثیت 'اقبال شناس' کی بھی ہے۔ اگر چہ انھوں نے اقبالیات سے متعلق صرف دو کتابیں لکھیں، ایک ''اقبال، فن اور فلسفہ'' اور دوسری ''اقبال شاعر و مفکر''۔ ان کتابوں سے ہی ان کی دانش وری اور اقبال شناسی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ اقبالیات کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف کی طویل فہرست ہے مثلاً: سرسید اور ہندوستانی مسلمان، نذیر احمد، سرسید کا خواب، فلسفۂ جمال اور اردو شاعری، فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری، مصحفی: حیات اور شاعری، تاریخِ ادب اردو، تصویریں اجالوں کی، سرسید اور ان کے کارنامے، غالب: شاعر و مکتوب نگار۔

ان کتابوں کے علاوہ کلیاتِ مصحفی، کلیاتِ جرأت، اردو لغت، تذکرہ عیار الشعرا، رام چرت مانس، راجہ رام موہن رائے اور میرا بائی اور اس کے روپ وغیرہ ان کی مرتب کی ہوئی کتابیں ہیں۔

نقوی صاحب کو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انگریزی میں بھی انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

نقوی صاحب کی کتاب 'فلسفۂ جمال اور اردو شاعری' اگر چہ اردو میں ہے لیکن اس سے ان کی انگریزی اور سنسکرت ادبیات پر گہری نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حسن و فن کے بنیادی مباحث، ہندوستانی جمالیات، جمالیاتی تنقید اور اردو شاعری کا جمالیاتی مطالعہ جیسے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ابتدائیہ میں 'حسن و فن' کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''فلسفۂ حسن و فن اب فلسفے کی محض ایک شاخ نہیں بلکہ ایک جداگانہ علم ہے جس کے لیے ہماری زبان میں 'جمالیات' کی اصطلاح رائج ہے اور پچھلے ڈھائی سو برس میں اس علم نے بہت ترقی کی ہے۔''[1]

'فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری' میں انھوں نے تنقید کا مفہوم اور اہمیت کے ساتھ ادبی تنقید کے اصولوں سے بھی بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ تنقید کے مختلف دبستانوں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ 'شعرائے اردو کے تذکرے' کے باب میں انھوں نے گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، آل احمد سرور اور

۱۔ فلسفۂ جمال اور اردو شاعری۔ نور الحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص: ۷

وزیر آغا اور دوسرے نقادوں کی تنقیدی بصیرت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ادبی تنقید کے اصولوں سے بھی بحث کی ہے:

''مواد اور ہیئت ان دونوں کا آپس میں جان وتن کا سا رشتہ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن فن پارے کو سمجھنے اور سمجھانے اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے نقاد انھیں الگ الگ دیکھنے پر مجبور رہے۔''[1]

نقوی صاحب کی کتاب 'تاریخ ادب اردو' بھی ان کا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ اس کے مختلف ایڈیشن شائع ہوئے اور ہر نئی اشاعت سے قبل انھوں نے کتاب پر نظر ثانی کر کے اسے وقیع تر بنانے کی کوشش ہے۔ اس اعتبار سے اردو کی ادبی تاریخوں میں اس کتاب کی خاصی اہمیت ہے۔

نقوی صاحب ایک اچھے خاکہ نگار بھی تھے۔ اس موضوع پر ان کی کتاب 'تصویریں اجالوں کی' خاکہ نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ ان کے خاکوں پر اردو اور انگریزی ادب کے ایک اہم نقاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اپنی کتاب 'تنقیدی تبصرے' میں لکھا ہے کہ:

''وہ (نورالحسن نقوی) فضا آفرینی پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور بہ ظاہر غیر اہم جزئیات کی مدد سے تصویر کو جان دار بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں..... یہ مرقع بہت دلچسپ ہیں اور بڑے شگفتہ اور رواں دواں انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں مروّت اور کشادہ جبینی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان میں برجستگی بھی ہے، بے تکلفی اور غیر رسمی پن بھی اور گوارا لب ولہجہ بھی۔''[2]

اقبالیات سے متعلق نقوی صاحب کی کتاب 'اقبال، فن اور فلسفہ' کو انھوں نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ فلسفیانہ مسائل میں الجھے بغیر اقبال کے افکار و خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر دیا جائے۔ پہلا باب حیاتِ اقبال سے متعلق ہے۔

۱۔ فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری۔ نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۳

۲۔ تنقیدی تبصرے۔ اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۴ء، ص: ۵۳۸۔۵۳۹

دوسرے باب میں انھوں نے اقبال کے فن کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالی ہے یہ قدرے طویل ہے۔ تیسرے باب میں انھوں نے اقبال کے فلسفیانہ افکار پر گفتگو کی ہے۔

اقبالیات سے متعلق نقوی صاحب کی دوسری اہم تصانیف میں 'اقبال شاعر و مفکر' ہے۔ اس کے ابتدائی تین ابواب مصنف نے چند جزوی تبدیلیوں کے ساتھ وہی رکھے ہیں جو اس موضوع پر ان کی اوّل الذکر کتاب یعنی 'اقبال۔ فکر و فلسفہ' کا حصہ ہیں، البتہ چوتھے باب میں 'اقبال کے فکری سرچشمے' کے عنوان سے مختلف مشرقی و مغربی دانش وروں اور فلاسفر کے حالات و افکار اور اقبال پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس بحث میں انھوں نے مجدد الف ثانی، مولانا جلال الدین رومی، دانتے، برگساں اور نیطشے کو بہ طور خاص شامل کیا ہے۔

اس کے بعد پانچویں اور آخری باب میں نقوی صاحب نے 'اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ' پیش کیا ہے جن میں خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، سید کی لوحِ تربت، والدہ مرحومہ کی یاد میں، شکوہ، جواب شکوہ اور شمع اور شاعر، جبریل و ابلیس، لینن خدا کے حضور میں، مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ اور ذوق و شوق، شعاعِ امید، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ شامل ہیں۔ ان طویل نظموں کے علاوہ نقوی صاحب نے کلامِ اقبال سے چند مختصر نظموں کا بھی تجزیاتی مطالعہ کیا ہے، جس میں طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام، پھول، بزمِ انجم اور چاند تارے کو لیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ آل احمد سرور نے لکھا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

> ''پروفیسر نورالحسن نقوی نے اس کتاب میں ان (اقبال) کے فکر و فن دونوں کا جائزہ لیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ انھوں نے صرف عمومی باتیں کہنے کے بجائے زیادہ تر ان کی اہم نظموں کا تجزیہ کیا ہے اور اس طرح عملی تنقید کے بھی قابلِ قدر نمونے پیش کیے ہیں۔''[1]

نقوی صاحب نے اس کتاب میں اقبال کی نظموں کا تجزیاتی جائزہ بہت توجہ، انہماک اور محنت سے لیا ہے۔ ان نظموں کے مطالعے کے دوران میں انھوں نے مختلف عنوانات بھی قائم کیے ہیں مثلاً پس منظر،

۱۔ اقبال شاعر و مفکر۔ نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص:۶

تکنیک، شعری وسائل، استعارہ، تشبیہ، الفاظ وتراکیب، پیکر تراشی، لب ولہجہ، امیجری، فنی محاسن، اسلوب، فنی آداب اور اقبال کا پیغام وغیرہ۔

غرض یہ کہ نقوی صاحب نے اقبال کی ان تمام نظموں کا تجزیاتی مطالعہ بہت باریک بینی سے کیا ہے۔ چوں کہ ان کا طریقِ کار ناقدانہ ہے اس لیے ان کے تنقیدی رویے کی جھلک ان نظموں میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

نقوی صاحب کا انتقال ۲۵ رجنوری ۲۰۰۶ء میں ہوا۔

○○○

پروفیسر سید محمد ہاشم

پروفیسر سید محمد ہاشم کا شمار اردو فارسی کے اہم محققین اور ناقدینِ فن میں ہوتا ہے۔ وہ بہ یک وقت محقق، مدوّن اور ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے فن میں بھی انھیں امتیازی مقام حاصل ہے۔

ہاشم صاحب کی پیدائش ۱۹۵۷ء میں امروہہ کے ایک معزز، علمی خاندان 'سادات' میں ہوئی۔ نو سال کی عمر میں انھوں نے 'جامعۃ اسلامیہ عربیہ، جامع مسجد امروہہ میں قرآن پاک حفظ کرلیا تھا۔ اس کے بعد دو سال میں وہیں تجوید مکمل کر کے قرأت کی سند حاصل کی۔ انھوں نے یوپی بورڈ سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فرسٹ پوزیشن کے ساتھ بی۔اے (آنرز) مکمل کیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۸ء میں امتیازی نمبروں میں ایم۔اے پاس کیا۔ 'سید سلیمان ندوی۔ حیات اور ادبی کارنامے' کے عنوان سے ۱۹۸۲ء میں اے۔ایم۔یو، علی گڑھ سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ہاشم صاحب کو مضمون نگاری کا شوق تعلیمی زمانے سے ہی تھا اور متعدد اخبارات و رسائل اور کالج میگزینوں میں ان کے مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ دورانِ ایم۔اے شعبۂ اردو کی جانب سے ہونے والے 'انٹرنیشنل اقبال سمینار' میں 'اقبال کی غزل گوئی' پر مقالہ پیش کیا، جسے مستند علماء مثلاً پروفیسر خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن اعظمی اور احمد جمال پاشا وغیرہ نے بطور خاص پسند کیا۔ ہاشم صاحب نے ۱۹۷۸ء میں مختلف تحقیقی مضامین جمع کر کے 'تحقیق و تدوین' کے عنوان سے اس موضوع پر ایک اہم کتاب شائع کی جو اسی زمانے میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے اردو اور فارسی شعبوں کے ایم۔فل کے کورس میں شامل ہوگئی تھی اور اس پر ۱۹۷۸ء کا یوپی اردو اکیڈمی کا انعام بھی دیا گیا تھا۔

اس کتاب میں ہاشم صاحب نے تحقیق، تدوین اور اس کے اصول و مسائل پر گفتگو کے علاوہ دیگر بہت سے موضوعات پر بھی کلام کیا ہے۔ متنی تحقیق کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ:

''حقیقت اور سچائی کی تلاش کو تحقیق کہتے ہیں۔ جو وقت، حالات، شواہد اور اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔

متن کے سلسلے میں کی جانے والی تحقیق کو متنی تحقیق کہتے ہیں۔ تحقیق نازک فن ہے جس کے لیے ایک خاص مزاج، خاص علمی پس منظر اور مخصوص صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔''[1]

اس کتاب میں ہاشم صاحب نے اپنے عہد کے چند اہم اور ممتاز محققین و مدوّین پر تعارفی مضامین بھی شامل کیے ہیں جن میں قاضی عبدالودود، مالک رام، ضیاء احمد بدایونی، نذیر احمد اور تنویر احمد علوی وغیرہ شامل ہیں۔ معروف محقق 'قاضی عبدالودود' کے متعلق اپنے مضمون میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ ایک دیانت دار محقق ہیں۔ یہ اس وقت تک کوئی بات کہنا پسند نہیں کرتے جب تک انھیں مکمل معلومات حاصل نہ ہوں۔ اپنی تحقیق کے غلط ثابت ہو جانے پر صدق دل سے اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ ہر بات دلیل کے ساتھ کہنے کے عادی ہیں..... حافظہ نہایت قوی ہے۔''[2]

اس کتاب میں شامل مختصر سوانحی مضامین کے علاوہ ہاشم صاحب نے 'سر گھٹا ملاّ' کے عنوان سے ایک خاکہ نما مضمون لکھا۔ ان کا دوسرا مضمون 'وقار الملک - ایک یادگار شخصیت' کے نام سے فکر و نظر، علی گڑھ میں شائع ہوا، جس میں سوانحی مضمون اور خاکہ نگاری کی تمام اہم خصوصیات موجود ہیں۔ اس میں انھوں نے نواب صاحب کی پُر وقار شخصیت پر واقعات کے حوالوں سے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ہاشم صاحب نے 'محسن الملک' اور 'علامہ شبلی' پر بھی خاکہ نما مضمون لکھے ہیں، جو اُن کے وسیع مطالعے، تجزیاتی انداز بیان، فن کی خوبیوں، زبان کی نیرنگی اور اسلوب کی دل کشی کے مظہر ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے رسائل میں سید سلیمان ندوی، رشید احمد صدیقی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور دیگر مشاہیر پر ان کے دلچسپ مضامین شائع ہوئے۔

۱۔ تحقیق و تدوین (جلد اوّل) مرتبہ سید محمد ہاشم، رعنا لیتھو پریس، لال مسجد روڈ، مراد آباد، ۱۹۷۸ء، ص:۱۳

۲۔ ایضاً۔ ص:۱۹۱

اقبالیات سے متعلق ہاشم صاحب کے متعدد مضامین کے علاوہ ایک گراں قدر تصنیف 'اقبال: فکروفن' کے عنوان سے ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں انھوں نے اقبال کی درج ذیل مختصر اور طویل نظموں کو تجزیہ نگاری کے عمل سے گزارا ہے۔ سید کی لوحِ تربت، شکوہ، جوابِ شکوہ، مسجدِ قرطبہ، لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت، فرمانِ خدا فرشتوں سے، ذوق وشوق، جبریل وابلیس اور شعاعِ امید وغیرہ۔ اس کتاب میں ہاشم صاحب نے مذکورہ نظموں کے تجزیوں کے علاوہ اقبال کے فکروفن کے دوسرے موضوعات پر بھی متعدد تفصیلی مضامین لکھے ہیں، جن میں اقبال کی حیات کا خاکہ، ان کی اردو غزل، فارسی غزل سرائی، بانگِ درا کی نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔

اقبال کی ابتدائی دور کی نظم 'سید کی لوحِ تربت' کو ہاشم صاحب نے، سرسید کی فکری وعملی کاوشوں کی علامت قرار دیا ہے۔ اقبال کے خیال میں سرسید کی مذہبی، سیاسی اور ادبی فکر، جو اس نظم میں اُبھر کر سامنے آتی ہے اس کو ہاشم صاحب نے واضح لفظوں میں بیان کیا ہے۔ نظم کے آخر میں وہ کہتے ہیں کہ: ''فنی اعتبار سے اقبال کی ابتدائی نظموں میں شامل ہونے کے باوجود یہ ایک کامیاب مکالماتی نظم ہے۔''[۱]

ہاشم صاحب نے شکوہ، جواب شکوہ کو ایک ہی سلسلے کی نظمیں قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال بیرسٹر تھے اور اپنے اس علم وفن کے مطابق انھوں نے اس عہد کے مسلمانوں میں مذہبی پختگی قائم رکھنے، ان کے اندر سے بے عملی نکال کر ان میں قوتِ عمل پیدا کرنے اور انھیں زندہ قوموں میں شامل کرنے کے خیال سے اس طرح کا فنی طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ ابتدائی حصہ تمہیدی ہے اور تیسرے بند سے اصل شکوہ کا آغاز ہوتا ہے جس میں عام مسلمانوں کی پریشانیوں کا اظہار خدا سے شکایتوں کی شکل میں جاری رہتا ہے۔ بقول ہاشم صاحب:

> ''مسدس کی فارم میں لکھی گئی ۳۱ بندوں پر مشتمل جذباتی وخطیبانہ لہجہ کی نظم 'شکوہ' میں مسلمانوں کے دلوں میں گھٹن کا اظہار مسلمانوں کی زبانی کیا گیا ہے۔ خدا سے بے باکانہ تخاطب بظاہر اپنی حدوں کو پار کر گیا ہے۔ اگرچہ اس میں اقبال کے حکیمانہ انداز، متانت، سنجیدگی اور وقار کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کا لہجہ جذباتی، خطیبانہ اور

۱۔ اقبال: فکروفن۔ ڈاکٹر سید محمد ہاشم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۰۳

بے باکانہ ہونے کے باوجود مخلصانہ ہے۔ سب سے بڑی خوبی اپنائیت اور جذبہ کی صداقت ہے جس میں غزل کا سا خلوص ہے۔ اس کے تیکھے پن اور شوخی میں داغؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ اس مخصوص لہجہ نے نظم کو نادر و ممتاز بنا دیا ہے۔''

نظموں کے اس سلسلۂ خیال میں پہلے شاعر نے مسلمانوں کی طرف سے شکوہ میں خدا سے شکایتیں کی ہیں اور اس کے بعد جواب شکوہ میں خدا کی طرف سے ان شکایات کے جوابات دلوائے ہیں۔ ہاشم صاحب نے شکوہ کے تجزیے کی ابتدا میں اوّلین بندوں کی فنی صنعت گری اور فکری اور تخیلی ارتقاع پر اظہارِ خیال کیا ہے اور جوابِ شکوہ کے تجزیے کے آغاز میں عشق کے طاقت ور اور تاثیر سے بھرپور نتائج کا ذکر کر کے انھوں نے ایک ایک کر کے نظم کے تقریباً سبھی بندوں کی تشریح و فنی تجزیہ کیا ہے۔ اس ضمن میں نظم کا فکری پس منظر، نظم کا ارتقا، موضوعات کی تفصیل اور زبان و بیان کی عمدگی کے ساتھ تجزیے کو آگے بڑھایا ہے۔ نظم کے ابتدائی دو بندوں کو استعاراتی زبان کی پیش کش کہا ہے۔ نظم کے آخری حصے کے اس شعر کو:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اُجالا کر دے

تجزیہ نگار نے ایک طرح سے نظم کے نعتیہ جزو کا آغاز قرار دیا ہے۔

نظم کے آخری شعر:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کو اقبال کے پیغام کا اصل مقصد و منشا قرار دیا ہے۔ اس کی وضاحت تجزیہ نگار نے اس طرح کی ہے:

''شکوہ کے سوال کا جواب واضح ہو چکا ہے کہ ترقی کے لیے عشقِ محمدؐ از بس ضروری ہے۔ نام محمدؐ دل کی گہرائیوں میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ گلے پیدا ہوئے ورنہ خود اسلام کی حفاظت کی آرزو کا دل میں مچلنا بھی اسی فیضان کا مرہونِ منت ہے اور کائنات کا وجود و حرکت بھی اسی پر منحصر ہے۔''[1]

۱۔ اقبال: فکر و فن۔ پروفیسر سید محمد ہاشم، ص: ۱۳۳

شعری محاسن کے ذیل میں تجزیہ نگار نے استعاروں، تشبیہوں، تلمیحوں اور دیگر صنائع لفظی و معنوی اور تاریخی کنایوں کی بھی وضاحت کی ہے اور نظم کی مقصدیت کے غلبہ کو اس کی خامی قرار دیا ہے۔ تجزیے کے آخر میں ہاشم صاحب کہتے ہیں کہ عقل و عشق، زندگی و خودی اور مردِ مومن جیسے اقبال کے تصورات و نظریات جو باقاعدہ طور پر بعد میں یعنی اسرارِ خودی کے ذریعہ واضح ہو کر سامنے آئے، ان کی ابتدائی شکل جوابِ شکوہ ہی میں نظر آنے لگی تھی۔

'مسجدِ قرطبہ' کو ہاشم صاحب نے اقبال کی اعلیٰ ترین تخلیق قرار دیا ہے وہ اس نظم کو اقبال کے فکر و فن کا نچوڑ قرار دیتے ہیں۔ نظم کے پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''مسجدِ قرطبہ میں انھوں نے سبھی بنیادی تصورات پوری جامعیت کے ساتھ پیش کیے ہیں اس میں نہ صرف زمان و مکان، مردِ مومن اور خودی کے تصورات کے ساتھ عشق، حسن، فن اور تاریخ کے نظریات موجود ہیں، بلکہ شکوہ کا جذبہ 'خضرِ راہ' کی فکر اور 'طلوعِ اسلام' کا اضطراب بھی ملتا ہے۔''[1]

نظم 'لینن - خدا کے حضور میں' کو بھی تجزیہ نگار نے ایک سلسلۂ خیال کی تین نظمیں قرار دیا ہے جس میں پہلا حصہ تو یہی زیرِ نظر موضوع ہے جس میں لینن کو خدا کے حضور میں پیش کر کے 'سرمایہ پرستی' کے خاتمہ کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس نظم کی دوسری جہت 'فرشتوں کا گیت' کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں بھی سرمایہ داروں کے ذریعے غریب طبقے کا استحصال ہو رہا ہے، فرشتوں کے پینل کے ذریعہ اس کی تصدیق کرائی گئی ہے۔

ہاشم صاحب کے نزدیک 'فرمانِ خدا فرشتوں سے' اقبال کے منصوبے کا تیسرا اور اصل رُخ ہے اور یہی اس سلسلہ کی تینوں نظموں کا مقصد اصلی ہے اور تجزیہ نگار کے نزدیک اس عہد کے خیالات پر موثر وار ہے۔ موصوف نے اس نظم کو اقبال کی اہم ڈرامائی نظموں میں شمار کیا ہے۔

'ذوق و شوق' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ابتدا میں انھوں نے نظم، اس کی شانِ نزول، محل نزول پر روشنی ڈالی ہے اور پھر فلسطین لیکن اقبال کے تصور میں مدینہ منورہ کے نزدیک پہنچ کر پہلے بند میں بہت خوب صورت

۱۔ اقبال: فکر و فن۔ پروفیسر سید محمد ہاشم، ص: ۱۴۷

انداز میں منظر نگاری کی ہے اور اس بند کے ٹیپ کے شعر کو اقبال کے تصورِ فراق سے جوڑا ہے:

آئی صدائے جبریل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

ہاشم صاحب نے بتایا ہے کہ اقبال نے عشق کو انسان کی انتہائی توانائیوں اور صلاحیتوں کے فروغ کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ تصورِ فراق کو اقبال نے عشق کے لیے سب سے پُرکشش شے کہا ہے۔ مسلسل حرکت و عمل، جدوجہد اور کبھی نہ تھکنے کی وجہ سے ابلیس، بے عملوں کے مقابلے میں پسندیدہ شخصیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ تجزیہ نگار نے تصورِ فراق کے ساتھ ساتھ رسول اکرمؐ کے نعتیہ بندوں کو 'ذوق وشوق' کا مرکز و محور قرار دیا ہے اور نظم پر اس طرح سے اظہارِ خیال کیا ہے:

''ذوق وشوق، سلوک کی وہ کیفیت ہے جو سالک پر ذکر و فکر میں محویت کے وقت طاری ہوتی ہے، لیکن اقبال کے یہاں بصیرت، بلندی، فکر، جذبہ، عشق و فراق میں سرشاری، استعدادِ عمل اور زندگی سے نبرد آزمائی کی لذت اور حوصلہ کو 'ذوق وشوق' سے تعبیر کیا گیا ہے۔''[1]

تصورِ فراق کی وضاحت کے لیے مرشدِ رومی اور ان کی مثنوی معنوی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس نظم کا مشہور بند جو مختلف علما کے درمیان حمدیہ اور نعتیہ کی حیثیت سے بحث کا موضوع رہا ہے۔ ہاشم صاحب نے بھی اس بند کے حمدیہ یا نعتیہ ہونے پر اصولی بحث کی ہے، اس کے بعد اہم اور سب سے مختلف بات یہ کہی ہے کہ اس بند کا ابتدائی شعر حمد کا ہے اور بقیہ اشعار پر نعتیہ رنگ غالب ہے۔ ہاشم صاحب نے نظم ذوق وشوق میں موجود مختلف صنعتوں اور تلمیحی اشاروں کی بھی وضاحت کی ہے۔

ہاشم صاحب نے نظم 'جبریل و ابلیس' کو اقبال کی مختصر مگر کارآمد تخلیقات میں شمار کیا ہے۔ نظم کی وضاحت کرتے ہوئے 'بھرتری ہری' کا یہ شعر نقل کیا ہے:

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

۱۔ اقبال: فکر و فن۔ پروفیسر سید محمد ہاشم، ص: ۲۰۴

نظم شعاعِ امید کے متعلق ہاشم صاحب کہتے ہیں کہ یہ نظم مکالماتی تکنیک میں لکھی ہوئی ہے اور اس پر بھی فکر کا غلبہ ہے۔ مثلاً:

''اس میں عمومی طور پر ہندوستانیوں کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو ان کا شان دار ماضی یاد دلا کر اسی کے مطابق محنتِ مسلسل اور عمل پیہم کرنے اور خوابِ غفلت سے جاگنے کا سبق دیا ہے۔''[1]

اپنی کتاب 'اقبال: فکر و فن' میں شامل ان تمام تجزیوں کے ذریعے ہاشم صاحب نے اقبال کی فکر اور ان کے فن کے بہت سے نئے گوشے آشکارا کیے ہیں اور اس اعتبار سے یہ کتاب اور اس کے مصنف اقبال کے تجزیہ نگاروں کی فہرست میں ایک اہم درجہ رکھتے ہیں۔

○○○

۱۔ اقبال: فکر و فن۔ پروفیسر سید محمد ہاشم، ص: ۲۴۶

باب سوم

''اقبال کی اہم نظموں کے تجزیوں کا تنقیدی مطالعہ''

(تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کے حوالے سے)

☆ ذوق وشوق

☆ خضرِ راہ

☆ مسجدِ قرطبہ

☆ ساقی نامہ

☆ شعاعِ امید

☆ جبریل وابلیس

ذوق وشوق

اردو اور فارسی شعر و ادب میں علامہ اقبال کی حیثیت صرف شاعر ہی کی نہیں بلکہ ایک عظیم فلسفی کی بھی ہے۔ اپنے فکر و فلسفہ کے حوالے سے انھوں نے اردو اور فارسی غزل، نظم، مثنوی اور قطعہ و رباعی جیسی اصناف میں اپنی فنی پختگی و مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے اردو نظم کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ ان کی نظمیں دوسرے شعرا کے مقابلے میں فن کی بہت بلندی پر نظر آتی ہیں۔ نظم مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ اور ذوق وشوق میں فن کی یہ پختگی و بلندی اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے۔ بالِ جبریل کی ان منتخب منظومات میں بعض اوصاف قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایجاز یعنی قلتِ الفاظ میں کثرتِ معانی کی جلوہ گری کے لحاظ سے بھی یہ نظمیں بہت بلند پایہ رکھتی ہیں۔ ان طویل نظموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا آغاز، تمہید اور فضا سازی سے ہوتا ہے۔

یہ حقیقت اہلِ نظر پر عیاں ہے کہ جس طرح انگریزی میں سب سے زیادہ شیکسپیئر پر لکھا گیا اسی طرح اردو ادب میں سب سے زیادہ کتابیں اقبال پر تصنیف کی گئیں ہیں۔ خواہ وہ فن سے متعلق ہوں، فکر و فلسفہ سے یا ان کی حیات سے متعلق۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں کلامِ اقبال کی عظمت و معنویت کے تناسب سے ہی اقبال شناسوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد ہے، جنھوں نے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اقبال کو دیکھنے، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور تجزیہ نگاری کے فن کو بھی وسعت بخشی۔ ان تجزیہ نگاروں میں اسلوب احمد انصاری، عبدالمغنی، رفیع الدین ہاشمی، نورالحسن نقوی وغیرہ کے تجزیے امتیازی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ان تمام تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں میں خاصا فرق بھی نظر آتا ہے۔ نظم 'ذوق وشوق' کے حوالے سے یہاں ان کے تنقیدی رویوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

نظم 'ذوق وشوق' اقبال کی فکر اور فلسفہ کا ماحصل ہے۔ یہ اقبال کے مجموعۂ بالِ جبریل میں شامل ہے اور ان کے بالغ، پختہ اور اعلیٰ درجہ کے فکری وفنی مظاہر کا نمونہ ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی نظم یعنی 'پروانہ اور جگنو' سے لے کر بڑی معرکہ آرا نظمیں مثلاً مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، لینن (خدا کے حضور میں)، جبریل وابلیس، پیر (رومی) ومرید (ہندی) اور ساقی نامہ وغیرہ جیسی مایۂ ناز نظمیں اسی مجموعہ کا حصہ ہیں۔ نظم 'ذوق وشوق' کو بال جبریل ہی میں نہیں بلکہ اقبال کے پورے کلام میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ دیگر دوسری فنی خوبیوں کے بالخصوص اقبال کا مردِ مومن اور ان کا تصورِ عشق، خودی اور آرزو کا مخصوص فلسفیانہ تصور اس میں ہنرمندی سے نظم ہوا ہے۔ علامہ اقبال کو اصل میں ذوق وشوق کا ہی شاعر کہنا چاہیے۔ ان کی تمام شاعری میں شروع سے آخر تک ذوق وشوق کی ایک لہر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس نظم میں پانچ بند ہیں اور ہر بند چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس طرح پوری نظم میں اشعار کی تعداد تیس ہے اور ہر بند کا آخری شعر اگلے بند کے لیے ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پوری نظم ترکیب بند کی ہیئت میں ہے اور ہر بند میں ایک مضمون بیان کیا گیا ہے۔ تاہم کہیں کہیں غزل کی سی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ ہر شعر ایک جداگانہ مفہوم لیے ہوئے ہے لیکن ایک اندرونی رو اور کیفیت شروع سے آخر تک اس میں رواں دواں ہے۔ نظم کا پس منظر مسلمانوں کی ملّی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ نظم کا آغاز قدرتی مناظر سے ہوتا ہے، اس کے بعد سوز وساز، ذوق وشوق، عقل وعشق، مومن کا جلال وجمال، خدا کی عظمت ورفعت کا کمال، نعت رسول پاکؐ اور عشق وفراق کا موازنہ اور ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ بعض شارحینِ اقبال اس نظم کو 'نعتیہ قصیدہ' یعنی نعتیہ نظم بھی کہتے ہیں۔

نظم کی ابتدا مناظرِ فطرت کی عکاسی سے ہوتی ہے جو کہ اقبال کی بیشتر شاعری کا خاصہ ہے۔ اقبال کے مناظرِ فطرت سے متعلق محمد بدیع الزماں اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''اقبال مناظرِ فطرت کے ذریعے ایک منفرد آہنگ پیدا کرتے ہیں اور فکر ونظر کو نئی بلندیوں سے آشنا کرتے ہیں۔ وہ روایت کے نہ تو اسیر ہیں اور نہ اس سے باغی۔ مگر ان چاند تاروں سے حسن وعشق، بلندیٔ خیال، جدتِ ادا، معنی آفرینی، فلسفۂ حیات اور مسائل، حکمت وتصوف کی نئی نئی راہیں کھولتے ہیں۔''[1]

۱۔ بدیع الزماں۔ مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ، دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، یوپی ۲۰۰۲ء، ص: ۲۴۳۔۲۴۴

نظم کے عنوان اور اصل متن کے مابین سعدی شیرازی کا یہ شعر درج ہے:

دریغ آدم زان ہمہ بوستاں

تہی دستی رفتن سوئے دوستاں

اس نظم کو مختلف اہم تجزیہ نگاروں کے تجزیوں اور تنقیدی رویوں کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا شمار اقبال شناسوں کی ممتاز شخصیات میں ہوتا ہے، وہ ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ ایک اچھے ادیب، کامیاب اور ذی وقار استاد، بلند پایہ مصنف و محقق اور ماہر اقبالیات ہیں۔ انھوں نے زندگی کا قیمتی زمانہ علمی مشاغل میں گزارا۔ مطالعاتِ اقبال کے سلسلے میں رفیع الدین ہاشمی صاحب کا کام اپنی نوعیت اور وقعت کے اعتبار سے منفرد ہے۔

ہاشمی صاحب کی کتاب 'اقبال کی طویل نظمیں' ان کا ایک گراں قدر علمی کارنامہ ہے جس کے مطالعے سے کلامِ اقبال کے بہت سے اہم اور تاریک گوشے منور ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں موجود اقبال کی نظموں کے تجزیے اردو ادب میں گراں قدر سرمایے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اقبال کی دس نظموں کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا ہے، جس میں شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، ذوق و شوق، مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ اور ابلیس کی مجلس شوریٰ شامل ہیں۔ ہاشمی صاحب کی اس کتاب کے پیش لفظ میں ان نظموں کے متعلق خواجہ محمد زکریا کہتے ہیں کہ:

> ''انھوں نے (رفیع الدین ہاشمی) ہر نظم کا پس منظر اور فنی تجزیہ بڑی وضاحت اور جامعیت سے تحریر کیا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اقبالیات کے جملہ پہلوؤں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کر رکھا ہے۔ اس لیے ان کی نظر ان نظموں کے تمام پہلوؤں پر پڑی ہے اور کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا۔''[1]

مذکورہ نظم سے متعلق ہاشمی صاحب نے شروع میں اس کا طویل پس منظر بیان کیا ہے۔ اس کے بعد بالصراحت نظم کا تجزیہ کیا ہے۔ اس میں انھوں نے متعدد عنوانات قائم کیے ہیں مثلاً تعارف اور پس منظر، فکری جائزہ، تمہید، مسلم انحطاط کا پُرسوز تذکرہ، بہ حضور رسالت مآبؐ، عشق و فراق، (فنی تجزیہ کے تحت)،

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں (طبع دوم)۔ رفیع الدین ہاشمی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۸

عربی اثرات، سوز و گداز، ایجاز و بلاغت، محاکات، صنعت گری وغیرہ۔ نظم کے پس منظر میں تاریخی پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے اور شانِ نزول کے متعلق طویل بیانیہ ہے جس میں تاریخ و سنین کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ نظم کی شانِ نزول سے متعلق کہتے ہیں:

''۳۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور پہنچے (اقبال)۔ فرمایا: میرا یہ سفر زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ 'ذوق وشوق' اسی دلچسپ سفر کی یادگار ہے اور جیسا کہ اقبال نے خود تصریح کی ہے: ''اس نظم کے اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے۔''[1]

ہاشمی صاحب کا نقطۂ نظر اسلامی ہے اور پوری نظم پر بھی عربی اثرات غالب ہیں۔ نظم کا پس منظر مسلمانوں کی ملّی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں قیامِ فلسطین کے دوران دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت، اسلامی وفود سے ملاقاتوں اور مقدس مقامات کی زیارت سے علامہ اقبال کے دل میں مسلم ممالک کی ترقی اور روضۂ اطہر کے دیدار کی تمنا بیدار ہوئی، اسی تمنا اور آرزو کے تحت انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کو 'ذوق وشوق' میں نظم کر دیا۔ یہی اس نظم کا پس منظر ہے جس کے متعلق ہاشمی صاحب کا قول ہے:

''یہ نظم ایک تو اس ذوق وشوق کی آئینہ دار ہے جو اقبال کے دل میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے موجود تھا۔ دوسرے اس میں ملّت اسلامیہ کے احیا کا ذوق وشوق ہے جس کے لیے اقبال عمر بھر تڑپتے رہے اور روشن مستقبل کے لیے پُر امید بھی رہے۔''[2]

ہاشمی صاحب نے فکری جائزے میں اس نظم کو سفرِ فلسطین کا حاصل قرار دیا ہے۔ تمہیدی نوٹ میں انھوں نے اقبال کی اس نظم میں مناظرِ فطرت کے بیان کو خضرِ راہ سے اس حیثیت سے مشابہ کہا ہے کہ اس میں بھی اقبال نے نظم کی ابتدا مناظرِ فطرت سے کی ہے۔ خضرِ راہ کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں (طبع دوم)۔ رفیع الدین ہاشمی، ص:۱۵۱

۲۔ ایضاً، ص:۱۵۲

ساحلِ دریا پہ تھا اک رات میں محو نظر
گوشۂ دل میں چھپائے ایک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں، کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب؟

زیرِ تجزیہ نظم کا پہلا بند پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ ہے، اس کے بعض اشعار میں عربی شاعری کا رنگ پیدا کیا گیا ہے۔ صحراؤں میں خیمے کی ٹوٹی ہوئی طناب اور بجھی ہوئی آگ مشہور عربی قصائد کی فضا قائم کر دیتی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں حضرت جبریل کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اقبال نے اپنی کئی نظموں میں جبریل و ابلیس کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ نظم 'جبریل و ابلیس' میں ان دونوں کی استعاراتی معنویت کا بہت واضح اظہار ملتا ہے۔ زیرِ تجزیہ نظم کے ابتدائی بند میں اقبال نے دو الفاظ 'کاظمہ' اور 'کوہِ اضم' استعمال کیے ہیں۔ اس کی وضاحت ہاشمی صاحب نے اس طرح کی ہے:

''کاظمہ مکہ کی جانب والے ایک راستے، ایک مقام یا ایک چشمے کا نام ہے۔ یہ مدینے کے متعدد ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اضم مضافاتِ مدینہ کے ایک پہاڑ یا وادی کا نام ہے۔ اقبال نے پہاڑ مراد لیا ہے۔ کاظمہ اور اضم کے نام قصیدۂ بردہ کے اس شعر سے ماخوذ ہیں:

ام هبت الريح من تلقاء كاظمة
اَوْ اوْ مضَ البرق فی الظمآءِ من اضم[1]

دوسرے بند کے متعلق ہاشمی صاحب کہتے ہیں کہ ''مسلم انحطاط اس درجے کو پہنچ چکا ہے کہ لوگ اپنے اسلاف کی روایات کو بھولتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں کارگاہِ حیات میں کوئی حسین جیسی خصوصیات سے متصف نظر نہیں آتا۔'' ہاشمی صاحب نے اتباعِ رسولؐ کو لوگوں کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے اور اس ضمن میں ایک حدیث نقل کی ہے:

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں (طبع دوم)۔ رفیع الدین ہاشمی، ص: ۱۵۴

''از روے فرمانِ نبویؐ: آں حضورؐ سے محبت کرنا ایک مسلمان کے ایمان کا جز ہے۔
آپ نے فرمایا: ''لما یومن احدکم حتی اکون احب الیه من والده ولده و الناس اجمعین''
ترجمہ: (تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ اپنے والدین، اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر مجھ سے محبت نہ کرے۔'')[1]

تیسرے بند کی وضاحت کرتے ہوئے ہاشمی صاحب نے عرب وعجم کے انحطاط کے اسباب پر طویل بحث کی ہے جس میں مسلکِ تصوف سے متعلق بھی اہم نکات کی نشان دہی کی ہے۔

نظم کے چوتھے بند کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ حمد کے اشعار ہیں یا نعت کے؟ اس طرف بھی ہاشمی صاحب نے توجہ مبذول کی۔ کہتے ہیں:

''اس نظم کے نعتیہ یا حمدیہ ہونے کے بارے میں شارحین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یوسف سلیم چشتی، غلام رسول مہر، محمد عبدالرشید فاضل اور خواجہ محمد زکریا چوتھے بند: لوح بھی تو، قلم بھی تو..... کا مشارٌالیہ آں حضورؐ کو قرار دیتے ہیں مگر پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالمغنی اور ڈاکٹر اسرار احمد کا خیال ہے کہ اس میں خطاب اللہ کی طرف ہے۔ پروفیسر غلام رسول ملک کا خیال ہے کہ ''ذوق وشوق'' کا مطالعہ ''حمد کی حیثیت سے بھی کیا جاسکتا ہے، اور نعتیہ قصیدے کی حیثیت سے بھی۔ حمد یا نعت میں سے کسی کا انتخاب کریں تو تعبیر وتشریح میں تھوڑا سا اختلاف ہوسکتا ہے۔ اقبال کے اشارات کی بنا پر یہ بات قدرے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اسے نعتیہ قصیدے کی حیثیت سے پڑھا جانا چاہیے۔''[2]

پانچویں بند کی وضاحت کے لیے ہاشمی صاحب نے 'عشق وفراق' کا عنوان قائم کر کے اقبال کے فلسفۂ عشق وفراق کے بعض پہلوؤں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عشق وعقل کے مابین

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں (طبع دوم)۔ رفیع الدین ہاشمی، ص:۱۵۹

۲۔ ایضاً، ص:۱۵۹۔۱۶۰

فرق واضح کیا ہے۔ اقبال نے عقل پر عشق کو ترجیح دی ہے۔ عشق کے ساتھ فراق ایک اہم کڑی ہے کیوں کہ عشق وخودی دونوں کا استحکام فراق پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں ہاشمی صاحب اقبال کا فارسی شعر نقل کرتے ہیں:

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل

چیست حیاتِ دوام؟ سوختن ناتمام

پوری نظم میں جابہ جا محاکات کی بڑی خوب صورت مثالیں ملتی ہیں۔ ہاشمی صاحب نے دوسرے اشعار کے ذریعے محاکاتی پہلو کی جانب توجہ کی ہے اس کے علاوہ نظم میں اقبال نے جن شعری تلازمات کو برتا ہے۔ ہاشمی صاحب نے 'صنعت گری' کے عنوان کے تحت ان تمام صنائع لفظی و معنوی کی وضاحت کر دی ہے۔

غرض یہ کہ ہاشمی صاحب نے تجزیے کے بنیادی اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کے تمام محاسن کی نشان دہی کی ہے۔

اقبالیاتی ادب میں ایک وافر تعداد پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے تجزیوں کی بھی ہے۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں، اقبال: جدید تنقیدی تناظرات، نقشِ اقبال، اقبال حرف و معنی وغیرہ ان کا رشتہ اقبالیات سے ہموار کرتی ہیں اور اقبال شناسی میں ان کا درجہ متعین کرتی ہیں۔ اقبال کے علاوہ انھوں نے متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا مثلاً اردو کے پندرہ ناول، حرفے چند، تنقیدی تبصرے، ادب اور تنقید جن میں اسلوب صاحب اپنی تمام تر تنقیدی صلاحیت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئے۔

اسلوب صاحب کو عاشقینِ اقبال تصور کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال پر لکھی دوسری کتابوں کے مقابلے میں پروفیسر انصاری کی کتابیں زیادہ تجزیاتی، معروضی اور علمی ہیں۔ یہاں اسلوب صاحب کے ذریعے تجزیہ کی گئی اقبال کی نظم ذوق وشوق کے حوالے سے ان کی فکر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

اسلوب صاحب نظم کی ابتدا سے متعلق لکھتے ہیں کہ ذوق وشوق کا آغاز دشت میں ایک حسین صبح کی سحر آفریں منظر کشی سے ہوتا ہے۔ منظر ایسا جلیل وجمیل ہے کہ قلب ونظر کو ایک نئی زندگی بخشتا ہے۔ آفتاب جہاں تاب کی سنہری کرنیں اس طرح اُبھر رہی ہیں جیسے وہ نور کے چشمے سے نکلی ہوئی نہریں ہیں۔

اسلوب صاحب براہِ راست ذوق وشوق سے متعلق خیال آرا ہیں۔ تجزیے میں اسلوب صاحب نے نظم کی شانِ نزول، پس منظر اور سنین وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ موصوف نے اوّلاً نظم پر تبصرہ کیا ہے، پھر بند در بند نظم کی صراحت کی ہے۔ ابتدائی بند میں مکانی پیکر کی نشان دہی کرتے ہیں اور اسے بالِ جبریل ہی کی ایک اور اہم نظم 'لالۂ صحرا' کے مشابہ قرار دیتے ہیں، اور اس کا شعر نقل کرتے ہیں:

یہ گنبد مینائی، یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پنہائی

ابتدائی بند میں جو ساحرانہ تصویر کشی کی گئی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''فطرت کے اس بدیع اور انوکھے نقش کو صفحۂ قرطاس پر اُبھارنے میں اقبال نے ہر طرح کے حسّی پیکروں سے کام لیا ہے، یعنی حرکی (Kinetic)، سماعی (Auditory)، بصارتی (Visual) اور لمسیاتی (Tactile)۔''[1]

نظم کا پہلا بند پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس بند کے بعض اشعار میں عربی شاعری کا رنگ پیدا کیا گیا ہے۔ صبح پاکیزگی، تروتازگی، طہارت، روشنی اور نور سے عبارت ہے۔ صبح کی عظمت وجلالت کو اردو کے اور شعرا نے بھی محسوس کیا اور بیان کیا مثلاً جوش ملیح آبادی کہتے ہیں:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

اسلوب صاحب چوں کہ انگریزی کے پروفیسر، ادیب اور نقاد ہیں اس لیے ان کے یہاں مغربی مفکرین سے استفادہ بہ کثرت ملتا ہے۔ اس نظم میں وہ اقبال کی فطرت نگاری کو ورڈز ورتھ کے نقوشِ فطرت سے کسی قدر کم بتاتے ہیں اور ورڈز ورتھ کی شاہکار نظم The Prelude اور Snow Don کی چند سطریں نقل کرتے ہیں:

The Universal Spectacle Throughtout
Was Shaped For Admiration And Delight
Grand in Itself Alone, But In That Breach
Through Which..... (Page:126)

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۱۲۵

پہلے بند کے آخری شعر میں علامہ اقبال نے ''اہلِ فراق'' کو مخاطب کیا ہے، اس کے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ:

''اہلِ فراق سے اقبال کی مراد ان لوگوں سے ہے، جو زمان کے تسلسل میں گرفتار ہیں اور ابدیت سے جن کا رشتہ کچھ عرصے کے لیے ٹوٹ گیا ہے، لیکن جو ذوق وشوق یا نفسی واگزاشت کے طفیل اس رشتے کو دوبارہ مستحکم اور استوار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''[1]

دوسرے بند کے پہلے شعر میں شاعر نے جس کرب کا اظہار کیا ہے اس کا منشا عالمِ اسلام کی زبوں حالی، جذبۂ عشق کا فقدان، مقصدِ حیات سے گریز اور مسلم اقوام کی بے عملی ہے۔ اس موقع پر وہ عالم اسلام کو دیکھتے ہیں تو وہاں ظاہری افلاس وپس ماندگی کے ساتھ ہی عقل وشعور اور فکر ووجدان کا فقدان اور ذہنی افلاس نظر آتا ہے۔ اس زوال وانحطاط کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت حسینؓ کا کردار باقی نہیں رہا اور نہ ان میں قربانی وشجاعت کا وہ جذبہ موجود ہے جس کا نمونہ بدر وحنین میں ان کے اسلاف نے پیش کیا تھا۔ اسلوب صاحب اس واقعے کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

''یہ رمز ہے حق وباطل اور حریت واستبداد کے درمیان ابدی پیکار کا اور حسینؓ کا عزم اور استقلال اور صبر وثبات، اعلان ہے اس امر کا کہ حکم، حق اور حکمت اٹل اور جاودانی ہیں۔ یہ معرکۂ خیر وشر زندگی کے ہیولیٰ میں پیوست ہے۔''[2]

اس کے بعد اسلوب صاحب اقبال کے تصورِ عشق سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان تمام کاموں کا رمز عشق میں پوشیدہ ہے۔ یہ دنیاوی عشق سے بالاتر ہے، یہ عشق کوئی تصوراتی چیز نہیں ہے۔ یہ صدقِ خلیل ہے، صبر حسین ہے اور بدر وحنین کی معرکہ آرائی بھی اسی عشق کا کرشمہ ہے:

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری، ص:۱۲۶

۲۔ ایضاً۔ ص:۱۲۸

جذبۂ عشق کے بغیر کوئی انسان منزلِ مقصود کو نہیں پا سکتا، اسی جذبے کے تحت حضرت حسینؓ نے جامِ شہادت نوش کیا اور انھیں خدا کا قرب نصیب ہوا۔ اسی عشق کی بدولت ہی انسان مردِ مومن کی صفات حاصل کر لیتا ہے۔ اس موقع پر اسلوب صاحب ٹی.ایس.ایلیٹ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''عمل صعوبت ہے اور صعوبت عمل''

"Action is Suffering And Suffering Action."[1]

تیسرے اور چوتھے بند میں اقبال نے روانی سے تاریخی تسلسل کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے اس کے متعلق اسلوب صاحب نے اپنے طویل بیانیہ میں سنجر و سلیم کی تاریخی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ اسلوب صاحب کی مشرقیت پسندی کا بیّن ثبوت ہے۔ انھوں نے جس قدر مغرب کو سمجھا اور پیش کیا ہے اسی قدر مشرق سے متعلق اپنی معلومات کو بھی منظرِ عام پر لائے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی اور حضرت جنید بغدادیؒ کی شخصیتوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''حضرت بایزید بسطامی اور حضرت جنید بغدادی کی شخصیتیں جو بہ ظاہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں، مرکزی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس تضاد کا سرچشمہ یہ ہے کہ جہاں ایک طرف بایزید حالتِ سکر (Intoxication) پر زور دیتے ہیں۔ وہاں دوسری جانب حضرت جنید کے یہاں صحو یا صبر (Sobriety) کا مسلک ملتا ہے۔''[2]

پانچویں بند میں اسلوب صاحب نے عقل و عشق کے موضوع پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اقبال کے نزدیک عقل و عشق میں کیا تضاد ہے اور کیا مطابقت اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آخری بند کے متعلق کہتے ہیں کہ اس میں یہ تمام اشارے اور کنائے جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے ایک مرکزی نقطے کی طرف کھنچ آئے ہیں:

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص:۱۲۹

۲۔ ایضاً، ص:۱۳۲

"نظم ذوق وشوق' میں تضاد عشق اور عقل کے مابین نہیں ہے، بلکہ زندگی کی طرف دو بنیادی رویوں، دو نقطۂ ہائے نظر اور دو ایسی اقدارِ حیات کے درمیان ہے، جو ایک دوسرے سے یہ مراحل دور ہیں۔"[1]

اسلوب صاحب نے کلامِ اقبال کا مطالعہ بڑی دقت نظری سے اور مروجہ طرز سے ذرا ہٹ کر کیا ہے۔ انھوں نے تجزیہ کے فنی لوازم کو برتا ہے لہٰذا ان کے تجزیے میں ایک انفرادیت نظر آتی ہے۔ نظم کے صوتی آہنگ پر بھی بھرپور تبصرہ ہے اور فنی پیکروں کا خلاصہ بھی موجود ہے۔ انھوں نے نظم کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے تجزیوں میں مشرق و مغرب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے جو دوسرے تجزیہ نگاروں کے یہاں عنقا ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی نے ذوق وشوق کا تجزیہ اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ اس میں انھوں نے تمام بندوں کی معنوی حیثیت پر روشنی ڈالنے کے بجائے نظم کے خاص پہلوؤں پر توجہ دی ہے۔ چوتھے بند کو جس کا پہلا شعر ہے:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

اس کو نقوی صاحب نے اقبال کی نعتیہ شاعری کے ذیل میں رکھا ہے اور جذبۂ عشق کو کلامِ اقبال کا اصل محرک اور نظم کی تخلیق کا سبب قرار دیا ہے۔ تجزیے کی ابتدا میں انھوں نے نظم کی ہیئت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ تجزیے کو نقوی صاحب نے دو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ فکرِ اقبال ۲۔ رعنائی بیان

پہلے عنوان کے تحت انھوں نے عشق، ہجر و وصال جیسے اقبال کے افکار پر گفتگو کی ہے، اور دوسرے عنوان کے تحت نظم میں موجود اقبال کی پیکر تراشی کی وضاحت کی ہے۔ محاسنِ شعری کے ذیل میں نقوی صاحب نے تجزیے میں ایجاز و اختصار، رمز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کی بھی وضاحت کی ہے۔ چوں کہ اس نظم میں پانچ بند ہیں اس لیے تجزیہ نگار نے اس نظم کو پانچ غزلوں کا مجموعہ کہا ہے۔

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۱۳۵

سید ابوالحسن علی الحسنی علی الندوی بھی اقبال شناسوں کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی اصل شناخت عربی ادب سے ہوتی ہے لیکن وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اقبال کو عربی ادب سے پہلی مرتبہ متعارف کرایا۔ موصوف، علامہ اقبال سے ذہنی قربت، فکری مناسبت اور مطالعۂ اقبال کے شایانِ شان صلاحیت واستعداد رکھنے والی عظیم شخصیت کے حامل تھے۔ کلامِ اقبال کے مطالعہ اور اقبال سے ذاتی طور پر قرب و فیضان کے نتیجے میں ندوی صاحب، علامہ اقبال کے علم کی گہرائی و گیرائی، فکری بلندی، پیغام کی عظمت و آفاقیت اور فن کے رموز و نکات سے بہت متاثر تھے۔ مولانا نے اپنی پوری زندگی علم و ادب کی آبیاری میں گزاری۔ ان کے تخلیقی و تنقیدی کارناموں کی طویل فہرست ہے۔ ان کی معروف تصنیف 'کاروانِ زندگی' ہے جس میں انھوں نے اپنے زندگی کے سفر کو انتہائی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔

انھوں نے اقبال سے متعلق عربی زبان میں لکھا، مصر میں انھوں نے دو مقالے عربی میں اقبال سے متعلق پڑھے جو 'شاعر الاسلام اقبال' کے نام سے منظرِ عام پر آئے۔ اس کے بعد ایک مکمل کتاب 'روائع اقبال' کے نام سے شائع ہوئی، جس کے متعدد ایڈیشن چھپے اور بعد میں یہ اردو میں 'نقوشِ اقبال' (مترجم مولوی شمس تبریز خاں) کے نام سے ترجمہ ہوئی، جس میں اقبال کی متعدد طویل نظموں کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے اقبال کے فکر و فن سے متعلق دیگر موضوعات پر بھی تفصیلی کلام کیا ہے۔

دوسری نظموں کے علاوہ اسی کتاب میں علی میاں نے ذوق و شوق کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے۔ نظم کی ابتدا پس منظر سے ہوتی ہے، جس میں ندوی صاحب نے نظم کے شانِ نزول اور سنین سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ چوں کہ پوری نظم پر عربی اثرات حاوی ہیں اسی لیے ندوی صاحب نظم کی توضیحات کے ضمن میں عرب شاعر کے اشعار پیش کرتے ہیں:

ولما نزلنا نزلا طلبه الندیٰ　　انیقاً و بستانا من النور حالیاً

اجد لنا طیب المکان و حسنه　　منی، فتمنینا، فکنت الا مانیا

''جب ہم شبنم سے شاداب مقام اور گل و غنچہ سے مہکے ہوئے باغ میں اترے تو حسنِ مقام نے ہمارے دل میں چند آرزوئیں پیدا کر دیں اور ان آرزوؤں کی جان تم ہی تھے۔''[1]

۱۔ نقوشِ اقبال۔ سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی (مترجم) مولوی شمس تبریز خاں (طبع دوم)، ۱۹۷۰ء، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ص: ۱۵۴

ندوی صاحب اپنی کتاب میں اقبال کی اسلام فہمی سے متعلق لکھتے ہیں:

''اسلام سے اقبال کا لگاؤ صرف فکری نہیں بلکہ جذباتی بھی ہے۔ فکر کی مے مینا گداز ان کے ہاں جذبہ کی آنچ سے دوآتشہ ہوگئی ہے۔ اقبال کو خالص عقلی سطح سے سمجھنے کی کوشش کرنا برگ گل کی کیمیاتی تشریح و تجزیہ کرنے کے مرادف کہا جاسکتا ہے۔ اقبال کے سوز وساز اور درد وگداز، ان کے دنوں کی تپش اور ان کی شبوں کی خلش کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ عقل کی غلامی سے آزاد دل کی رہنمائی میں ان کے احوال ومقامات کی سیر کی جائے۔''[1]

علی میاں ندوی کہتے ہیں کہ پہلے بند میں شاعر زمان ومکان کے حسین تصورات میں غرق ہے۔ صحراؤں میں خیمے کی ٹوٹی ہوئی طناب اور بجھی ہوئی آگ مشہور عربی قصائد کی فضا قائم کردیتی ہے۔ ذوق وشوق کے اس سفر میں اس مقام پر کتنے کارواں آئے اور گزر گئے اور ان کے چھوڑے ہوئے آثار ان کی یاد دلاتے ہیں۔ علی میاں ندوی نے نظم کے شانِ نزول اور پس منظر کی خوب صورت الفاظ میں عقدہ کشائی کی ہے۔ اس کے بعد وہ نظم کے نفسِ مضمون کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ نظم کی تخلیق کے اسباب وعوامل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

دوسرے بند کے متعلق علی میاں تحریر کرتے ہیں کہ شاعر، عالم اسلام کی حق پرستی سے دوری اور مقصدِ حیات سے بیزاری وبے رغبتی کا ذکر بڑے دردناک انداز میں کررہا ہے۔ شاعر کے نزدیک مسلم انحطاط اس درجے کو پہنچ چکا ہے کہ اب تقریباً زندگی کے ہر شعبے میں اسلاف کی روایات بالکل عنقا ہوچکی ہیں۔ شاعر کا دلی کرب اور سوز وگداز پوری نظم میں وقتاً فوقتاً اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ علی میاں کہتے ہیں کہ عالم اسلام میں بھی فکر ووجدان کا فقدان ہے، مسلمان اپنے عقیدۂ حسنہ کو پسِ پشت ڈال چکے ہیں اور آج کا مادّی نظام مردِ خدا کا انتظار کررہا ہے۔ دنیا کے کسی گوشے میں آج کوئی حضرت حسین کی طرح نظر نہیں آتا جو اپنے آپ کو خدا کی راہ میں وقف کردے اور اس تنزل کا سبب یہ ہے کہ لوگوں میں جذبۂ خودی بیدار نہیں ہوتا اور ان میں جذبۂ عشق کا فقدان ہے۔ اس کے بعد علی میاں صاحب اقبال کے تصورِ عشق کی جانب متوجہ

۱۔ نقوشِ اقبال۔ سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی (مترجم) مولوی شمس تبریز خاں (طبع دوم)، ص:۳

ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال نے حضرت حسین کی شخصیت کو ایک رمز کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ انحطاط محض عالمِ اسلام کے کسی ایک حصے تک محدود نہیں بلکہ عرب وعجم دونوں اس انحطاط کا شکار ہیں اور اس کا سبب انھوں نے جذبۂ عشق کے فقدان کو قرار دیا ہے۔ عشق کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ نگاہ، عقل اور دل تینوں کو ایک رشتے میں باندھتا ہے۔ محمود غزنوی اور امام حسین اپنے جذبۂ عشق کے سبب ہی زندۂ جاوید ہیں۔

جذبۂ عشق کے بیان کے بعد علی میاں ندوی تیسرے بند میں اقبال کے مردِ کامل یا مردِ مومن کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عالمِ اسلام کے حقیقت پسندانہ جائزے سے شاعر دل گرفتہ نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ دانش وروں اور درس گاہوں اور دینی تعلیم کے مرکزوں میں بھی نظر کی گہرائی و گیرائی عنقا ہے لیکن ان سب کے باوجود اقبال کو اپنے پیغام پر یقین کامل ہے۔

علی میاں کے نزدیک چوتھے بند میں اللہ سے خطاب ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''اس تخاطب سے خدا کی طرف گریز ہوتا ہے اور شاعر کے ذوق وشوق کا رُخ بارگہ اقدس کی جانب ہو جاتا ہے اور مقامِ عبدیت سے شاعر اپنے محبوب ومعبود سے اس طرح لب کشا ہوتا ہے کہ تیری تجلی کائنات کو محیط ہے اور دنیا تیری قدرت کے صحرائے بیکراں کا ایک ذرّہ اور وجود وزندگی، تیرے وجود لامحدود کے بحرِ بے پایاں کا ایک قطرہ ہے۔''[1]

علی میاں ندوی پانچویں یعنی آخری بند کے متعلق کہتے ہیں کہ اس میں اقبال کا کرب اُبھر کر سامنے آتا ہے اور وہ اپنی علمی فتوحات پر افسوس وندامت کا اظہار کرتے ہوئے علم کو نخیلِ بے رطب قرار دیتے ہیں۔ یعنی اقبال یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی طویل علمی تحقیقات عالمِ سعادت کا باب فتح نہ کر سکیں۔ نظم کے آخری پانچ اشعار میں اقبال نے اپنے نظریۂ عشق اور فلسفۂ فراق ووصال کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

علی میاں ندوی اسلامی فکر کے حامل تھے لہٰذا انھوں نے نظم کو عربی سیاق وسباق میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کے شعری محاسن کی وضاحت کی ہے۔ نظم میں مستعمل تشبیہات، استعارات،

۱۔ نقوشِ اقبال۔۔ ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ص: ۱۵۸

تلمیحات کی عمدگی سے وضاحت کی ہے۔ اقبال کے فکر وفن کو بہتر طور پر سمجھا اور بتایا ہے۔ اقبال پر بہت سے لوگوں نے کام کیا لیکن علی میاں ندوی کو اقبال شناسی میں اس وجہ سے انفرادیت حاصل ہے کیوں کہ انھوں نے اقبال سے متعلق عربی میں مدلل انداز میں لکھا۔ ان کی کتاب 'روائع اقبال' اقبالیاتی ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کا شمار بھی اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی شخصیت میں ایک ماہر نقاد، دانش ور، مقرر، صحافی اور ماہر تعلیم کی تمام خوبیاں یکجا ہیں۔ ان کا مطالعۂ اقبال بہت وسیع تھا، مشرق ومغرب کے معاشرہ ومعاشرت اور ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے اقبال کا مطالعہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ عبدالمغنی کی کتاب 'اقبال اور عالمی ادب' ان کا ایک گراں قدر علمی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے کلیم الدین احمد کی کتاب 'اقبال: ایک مطالعہ' کے جواب میں لکھی، جس میں انھوں نے اقبال پر لگے الزامات کی تردید مدلل انداز میں کی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس کے علاوہ بھی اقبال سے متعلق بہت کچھ لکھا جن میں اقبال کا نظامِ فن، اقبال کا تصورِ خودی، اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا اہم ہیں لیکن ان کی شہرت اقبال اور عالمی ادب کی وجہ سے زیادہ ہے۔

ادب وتنقید کے میدان میں عبدالمغنی نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس ضمن میں ان کی تصنیفات میں نقطۂ نظر، جادۂ اعتدال، معیار واقدار اور فروغ تنقید وغیرہ اہم ہیں۔ عبدالمغنی کی کتاب 'اقبال اور عالمی ادب' کے متعلق 'بدر اورنگ آبادی' اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں:

> ''عبدالمغنی نے اقبال کی شاعری کے بہت سارے گوشوں کو منور کرنے کے لیے جس عرق ریزی سے کام کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس کتاب نے تحقیق کے کئی دروازے وا کر دیے ہیں۔''[1]

اس اقتباس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں نہ صرف انھوں نے کلیم الدین احمد کے الزامات کی تردید کی ہے بلکہ اقبال سے متعلق مخفی گوشوں کو بھی منور

۱۔ پروفیسر عبدالمغنی حیات اور خدمات۔ مرتب: ڈاکٹر سید احمد قادری ''از مضمون عبدالمغنی اور اقبال شناسی، بدر اورنگ آبادی''، مکتبہ غوثیہ، گیا، بہار ۲۰۰۵ء، ص: ۷۷

کیا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک دوسری کتاب اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا میں اقبال کی نظموں اور غزلوں میں ان کے افکار کی وضاحت کی ہے۔ درج ذیل تجزیے سے مغنی صاحب کے ذریعہ نظم 'ذوق وشوق' کی بازآفرینی کا اظہار مقصود ہے۔

نظم کے ابتدائی اشعار میں مغنی صاحب فطرت نگاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 'ذوق وشوق' کا آغاز بھی بانگِ درا کی دوسری نظموں کی طرح فطرت کی سحرانگیزی سے ہوتا ہے، لیکن نظم 'ذوق وشوق' میں منظر نگاری کا مرقع دوسری نظموں سے زیادہ مفصل ہے۔

پہلے بند کے متعلق عبدالمغنی تحریر کرتے ہیں کہ اس کا یہ منظر اور فضا طہارت، خاموشی اور سکون سے معمور ہے۔ اقبال اس منظر میں گم ہوکر بہت دور نکل جاتے ہیں اور ان کی چشم تصور، سرخ اور نیلی بدلیوں کی رنگ برنگی قبائیں پہنے ہوئے کوہِ اضم تک پہنچ جاتی ہیں۔ صاف وشفاف ہوا اور دُھلے دُھلائے کھجوروں کے پتے اور نواحِ کاظمہ کی ریشم جیسی نزاریت انھیں ماضی کے روشن جزیروں میں پہنچا دیتی ہے۔

نظم کے نفسِ مضمون کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو بات 'شکوہ' میں اقبال نے اجتماعی طور پر کہی ہے، وہی بات ذوق وشوق میں انفرادی حیثیت سے بیان ہوئی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں تلمیحات، اشارات، کنایات کی بھرمار ہے جو کہ نظم 'شکوہ' میں نہیں ہیں۔ اس نظم میں شاعر مسلمانوں سے شکوہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ قافلے والوں کی چھوڑی ہوئی سلگتی لکڑیاں ان کے سوزِ دروں کی غماز بن گئی ہیں۔ یہ سب دیکھ کر وہ محبوب سے ملنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں لیکن وصال ان کے مقدر میں نہیں۔ حضرت جبریل کی آواز انھیں اپنے کانوں میں آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ تمہارا اصل مقام ہی یہی ہے کہ تم محبوب کے فراق میں تڑپتے رہو کیوں کہ وصال سے آرزوؤں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

عبدالمغنی کہتے ہیں کہ پہلے بند میں اقبال پر خود کلامی کی کیفیت طاری ہے وہ دیکھتے ہیں کہ عالم عربی بھی ایمان وعقیدے کی پختگی اور روح وجذبے کی برجستگی کھو چکا ہے۔ اس کا سبب اقبال جذبۂ عشق کے فقدان کو قرار دیتے ہیں۔

دوسرے بند میں عبدالمغنی اقبال کے تصورِ عشق کی وضاحت کرتے ہیں۔ 'عشق' اقبال کے نظامِ فکر کا بہت بنیادی حصہ ہے اور وہ اس کے ذریعے سے پوری ملت اسلامیہ کو دوبارہ ان کے شاندار ماضی کی

یاد دلا کر اور ان کو موجودہ زمانے میں دوسری قوموں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ عشق کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ نگاہ، عقل اور دل تینوں کو ایک رشتے میں باندھتا ہے اور کشاں کشاں منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ مسلمانوں میں جذبۂ عشق کا فقدان ہے ان کے سبب شریعت، تصوف اور دین داری کے تصورات بدل گئے ہیں۔ اقبال کے خیال میں زندگی کی اعلیٰ قدروں سے عشق کا رشتہ استوار کیا جانا چاہیے تب ہی یہ مردہ قوم ایک حیاتِ نو سے آشنا ہو سکتی ہے۔

تیسرے بند میں اقبال کی فکر نیا رخ اختیار کرتی ہے اور وہ عالمِ انسانیت ہی کے لیے غور و فکر میں ڈوب جاتے ہیں جس کے متعلق عبدالمغنی کہتے ہیں:

> ''نظم کی ہر ترکیب معنی خیز اور ہر تصویر خیال انگیز ہے جب کہ اس کے بنیادی تصور کا مربوط ارتقا ایک عضویاتی ترتیب سے ہوا ہے۔ یہ ایک نہایت ولولہ خیز اور فکر انگیز تخلیق ہے۔ اس میں روایت اور جدت کی ہم آہنگی، ذہن اور فن دونوں کے معاملے میں اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔''[1]

اس کے بعد شاعر اپنے انسانِ کامل یعنی مردِ مومن کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور اسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا وجود کائناتی وجود کی غایت اولیٰ ہے:

ع ''آئینۂ کائنات کا معنی دیریاب تو''

چوتھے بند میں اقبال کی فکر عروج پر جا پہنچتی ہے۔ اس بند کو نظم کا ماحصل بھی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس بند سے متعلق ناقدین اقبال میں اختلاف نظر آتا ہے۔ عبدالمغنی نے بھی طویل بیانیے کے ذریعے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آیا یہ اشعار حمدیہ ہیں یا نعتیہ۔ عبدالمغنی صاحب اس کے حمدیہ ہونے پر اتفاق کرتے ہیں اور اس کے متعلق کہتے ہیں کہ:

> ''پہلے بند میں ہی شاعر 'حسنِ ازل' کی بات کرتا ہے جو ظاہر ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد مختلف بندوں کے تمام اشارات خداوند تعالیٰ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ صدقِ خلیل ہو یا صبرِ حسینؓ، سب کا تعلق رضائے الٰہی کے

۱۔ اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا۔ عبدالمغنی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۹۱ء، ص: ۶۵

حصول کی سعی سے ہے۔ آگے چل کر سنجر و سلیم اور جنید و بایزید کی سیرتوں میں سوائے خدا کے کسی اور کے جلال و جمال کی نمود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب سے بڑھ کر حسبِ ذیل شعر کا مرجع اگر خدا کے سوا کوئی بھی ہو تو صریح شرک لازم آئے گا، اور مثال میں یہ شعر پیش کرتے ہیں:

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام

میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب''[1]

اس بند میں شاعر دوبارہ اپنے تصورِ عشق کی طرف پلٹتے ہیں۔ اگر میرا عشق مستحکم نہ ہو تو میری نماز بھی لذت سے بہرہ ور نہ ہو سکے گی کیوں کہ کوئی بھی عمل خواہ وہ نماز ہی کیوں نہ ہو عشق سے ہی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے ورنہ اس عمل کی لذت جاتی رہتی ہے۔

عبدالمغنی صاحب کہتے ہیں کہ فنی اعتبار سے نظم کی ایک بڑی خوبی اس کا اندازِ تغزل اور سوز و گداز ہے۔ نظم کے پانچویں بند کے آخری تین اشعار میں اقبال اپنے محبوب ترین موضوع فراق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں وصل اور فراق کے مابین موازنہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اقبال ہجر یعنی فراق کے قائل ہیں، ان کا فلسفہ یہ ہے کہ وصال کو اگر منزل قرار دے دیا جائے تو زندگی کا ارتقا رُک جائے گا۔ فراق ہی سب سے بڑی منزل ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ آخر میں عبدالمغنی مجموعی نظم پر اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''اقبال کی شعری تخلیقات میں ذوق و شوق کا فکری و فنی امتیاز یہی ہے کہ اس میں شاعر کے احساسات اور استعارات مرتکز ہو کر ایک نفیس ترین تنظیم کے ساتھ بروئے اظہار آئے ہیں۔ شاعر کے ذہن و روح کا سوز و گداز اس طرح ایک بہترین نمونۂ فن کے سوز و ساز میں ڈھل گیا ہے۔''[2]

۱۔ اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا۔ عبدالمغنی، ص:۶۶

۲۔ ایضاً۔ ص:۶۵

غرض یہ کہ عبدالمغنی نظم کی اصل خوبی اس کے سوز و گداز کو قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نظم میں شامل چوتھے بند کو حمدیہ قرار دیتے ہوئے اس کو دلائل سے واضح بھی کرتے ہیں۔ آخر میں نظم کے نفسِ مضمون سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ذوق وشوق'' حالات سے اقبال کی بے اطمینانی اور اصلاحِ احوال کے لیے ان کی بے چینی کا ایک اعلان ہے۔ یہی وہ ذوق وشوق ہے جو اقبال کی پوری شاعری اور زندگی کا محرک ہے۔''[1]

عہدِ حاضر کے عظیم ترین نقادوں اور دانش وروں میں شمس الرحمٰن فاروقی بہت بلند مقام اور اردو ادب کے مختلف میدانوں میں گوں ناگوں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کی شخصیت میں بہ یک وقت نقاد، شاعر، مدیر، خطیب اور دانش ور کی خوبیاں یکجا ہیں۔ انھوں نے 'بوطیقا' کا ترجمہ کیا، اس کے ساتھ ساتھ وہ بے لاگ تبصرہ نگار کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو وہاں بھی اپنا امتیاز برقرار رکھا۔ اس ضمن میں ان کے کلام کے مجموعہ 'گنج سوختہ'، 'سبز اندر سبز' اور 'چار سمت کا دریا' اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح ناول نگاری میں بھی اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے شعر، غیر شعر اور نثر، اس کے علاوہ 'عروض، آہنگ اور بیان' فکشن میں 'افسانے کی حمایت میں' لغت سازی میں 'درسِ بلاغت' اور اردو شعرا کے کلام اور فکر و فن خصوصاً میر تقی میرؔ سے متعلق 'شعر شور انگیز' اور 'تفہیم غالب' ان کی قابلِ قدر تصانیف ہیں۔ انھوں نے غالب پر خصوصاً اور اقبال پر ضمناً اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ وہ مشرقی اصولِ نقد اور شعریات سے بھی بھرپور واقفیت رکھتے ہیں اور مغربی ادب اور اس کے رجحانات سے بھی کماحقہ باخبر ہیں۔

کلاسیکی شعرا سے متعلق فاروقی صاحب کی علمیت اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ایک طرف 'شعر شور انگیز' سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے کلامِ میرؔ پر کی شرح مدلل اور تجزیاتی انداز میں چار جلدوں میں کی ہے، تو دوسری طرف ان کے یہاں غالب کی بلند و بالا اور پیچیدہ تر شعری کاوشوں اور تخلیقی ہنرمندیوں کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنے کا رجحان بھی نمایاں ہے جو کہ تفہیم غالب کی شکل میں اُبھر کر سامنے آیا۔ جدید اردو ادب میں کلاسیکیت کی جانب از سرِ نو رجحان بھی فاروقی صاحب کے

۱۔ اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا۔ عبدالمغنی، ص: ۶۷

سبب ہی ظہور پذیر ہوا۔ انھوں نے داستانی ادب کو بھی وسعت بخشی۔(۱) ساحری شاہی صاحبِ قرآنی، (۲) داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، اس ضمن میں کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ شعر، غیر شعر اور نثر میں انھوں نے ایک مضمون میں غالب کی غزل کا تجزیہ کیا ہے، تجزیے سے قبل تمہید میں تجزیے کے اصول کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''لفظی تجزیہ ایک طرح کی شرح نویسی ہے، اور نہیں بھی ہے شرح صحیح ترین معنی کی تلاش کرتی ہے اور صحیح ترین معنی سے اس کی مراد وہ معنی ہوتے ہیں جو شعر کی سطح سے اُبھرتے ہیں..... لفظی تجزیہ بھی شرح کی طرح شعر کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے..... لفظی تجزیہ تناؤ، طنز اور انسلاکات کی زمین میں پھیلتا پھولتا ہے۔''[۱]

انھوں نے اقبال پر باقاعدہ کوئی کتاب تصنیف نہیں کی لیکن اس کے باوجود اقبال فہمی میں ان کی منفرد شناخت ہے۔ اپنی کتاب شعر، غیر شعر اور نثر میں انھوں نے کیٹس، اقبال اور ایلیٹ سے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے، جس میں انھوں نے ان تینوں صاحبان کے درمیان مماثلت کے چند پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی دوسری تصنیف 'اثبات ونفی' میں اقبال کا لفظیاتی نظام، اقبال کا عروضی نظام اور اقبال کے حق میں ردعمل جیسے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے اور اسی تناظر میں انھوں نے اقبال کی نظم ذوق وشوق کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کی تجزیہ نگاری کا انداز دوسروں سے اس لحاظ سے بھی علیٰحدہ ہے کیوں کہ انھوں نے اقبال کے فکر وفن پر زیادہ توجہ نہ دے کر ان کے عروضی ولفظیاتی نظام پر روشنی ڈالی ہے، جس میں انھوں نے بحر اور اس کی اقسام سے متعلق بحث کی ہے اور اقبال کی استعمال کردہ بحور واوزان پر بھی اس طرح اظہار کیا ہے:

''اقبال نے 'وقفہ' کے علاوہ جو دوسرے عروضی وسائل استعمال کیے ہیں ان میں دو مصرعوں کو باہم پیوست کرنا، یعنی end Stoped کی جگہ run on مصرعہ لکھنا، مصرع کے آخر میں حرفِ ساکن، جو تقطیع میں نہیں آتا اس کے استعمال میں تنوع، مصرعوں کو صفحے پر اس طرح لکھنا کہ مختلف شکلیں پیدا ہو جائیں اور بحر کے بدل جانے کا

۱۔ شعر، غیر شعر اور نثر۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شب خون کتاب گھر، الہ آباد، (دوسری اشاعت)، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص: ۳۱۱۔۳۱۲

التباس ہو، چھوٹی بڑی نظموں میں چھوٹی بڑی بحروں کا تناسب وغیرہ کئی اور چیزیں بھی ہیں۔''[1]

فاروقی صاحب نے نظم 'ذوق وشوق' کو اسی لحاظ سے دیکھنے اور اس کے مطالعے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے تجزیے کا عنوان 'اقبال کا لفظیاتی نظام' (ذوق وشوق کے حوالے سے) کے نام سے قائم کیا ہے۔ تجزیے کی ابتدا اس مفروضے سے ہوتی ہے کہ اقبال بڑے شاعر ہیں یا نہیں؟ اس ضمن میں انھوں نے مختلف مکتبِ خیال کے لوگوں کے افکار کو واضح کیا ہے کہ ان کے نزدیک اقبال کس حیثیت سے بڑے شاعر ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی اقبال کی اسلام پسندی کو بنیادی اہمیت کا حامل بتاتا ہے تو کوئی ان کے فلسفۂ خودی کا پرستار ہے۔ کوئی ان کے عشقِ رسول کا گرویدہ ہے تو کوئی ان کے تصوف کا اور کوئی ان کی قوم پرستی میں ان کی بڑائی کے نشانات تلاش کرتا ہے۔

لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کی فکر سے زیادہ ان کے عروض وآہنگ پر توجہ صَرف کی ہے۔ اپنے ایک مضمون 'اقبال کا عروضی نظام' میں لکھتے ہیں کہ:

''اقبال کے کلام کی ایک نمایاں صفت اس کی خوش آہنگی ہے۔ اس خوش آہنگی میں کلام کے معنی کا بھی بڑا حصہ ہے، لیکن اس کا تعلق ان بحروں سے بھی ہے جو انھوں نے استعمال کی ہیں۔ یہ اس لیے کہ بحر بھی معنی کا ہی حصہ ہوتی ہے..... ہر بحر، نظم کی تعمیر میں مدد کرتی ہے۔''[2]

انھوں نے انھیں نظریات کے تحت اقبال کے عروضی نظام کا جائزہ لیا ہے۔ گویا فاروقی صاحب بقول آتش:

ع شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

کے قائل ہیں۔

۱۔ اثبات ونفی۔ شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص: ۴۷۔۴۸

۲۔ عروض، آہنگ اور بیان۔ شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، جولائی ۲۰۰۴ء، ص: ۲۸۵

تجزیے کی ابتدا میں انھوں نے لفظ کی صوتی وعروضی معنویت سے بحث کی ہے اور کہا ہے کہ آئی.اے.رچرڈز نے معنی کی چار اقسام بتائی ہیں یعنی مفہوم، محسوس، لہجہ اور ارادہ۔ اور ان میں سے بیش تر معنی شاعری میں موجود رہتے ہیں اور رچرڈز کے بیان کردہ معنی کی چار قسمیں بھی آہنگ کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اس کے بعد فاروقی صاحب اقبال کے لفظیاتی نظام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہر شاعر کا انداز منفرد ہوتا ہے اور وہ اپنے طور پر زبان کا استعمال کرتا ہے۔ فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ اردو کے چار عظیم ترین شعرا میر، غالب، انیس اور اقبال مناسبت لفظی کے قائل ہیں۔ اقبال کی شعری تلازمات کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

''اقبال کے یہاں مناسبتِ الفاظ تسلسل کا کام کرتی ہے کیوں کہ ان کے بہت سے الفاظ اگلے بلکہ بہت بعد میں آنے والے الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی رعایتِ لفظی منتشر اور بہ ظاہر بے ربط اشعار یا بندوں کو مربوط کر دیتی ہے۔''[1]

اس کے بعد انھوں نے نظم ذوق وشوق کے اصل متن کی طرف توجہ کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ''اقبال کا کلام رعایتِ لفظی سے مملو ہے۔ صنائع لفظی سے مراد وہ خوبیاں ہیں جو لفظوں کو خاص رعایتوں اور ہنرمندی کے ساتھ برتنے سے وجود میں آتی ہیں۔ بعض علما نے ان خوبیوں کو کلام کے حسن عارضی سے تعبیر کیا ہے۔''[2]

فاروقی صاحب نے پوری نظم میں صنائع وبدائع خواہ لفظی ہوں یا معنوی رعایات ومناسبات کی نشان دہی کی ہے۔ نظم کا پہلا بند جو کہ مناظر فطرت سے متعلق ہے اس پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے اس کے اہم نکات ورعایات کی نشان دہی کی ہے۔

چوں کہ پوری نظم شعری محاسن سے لبریز ہے۔ نظم کے تمہیدی نوٹ میں فاروقی صاحب نے اقبال کی فکر سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ نظم کی شعری تراکیب اور بندش مضمون پر بھی تفصیلی کلام ہے۔ پہلے بند سے متعلق وہ کہتے ہیں کہ پہلا بند عربی قصیدہ نگاروں کے انداز میں رسمی آغاز ہے:

۱۔ تنقید (نمبر)، مرتب قاضی افضال حسین، نظم ذوق وشوق، (مجموعۂ مقالات) شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص:۶۶

۲۔ درسِ بلاغت۔ شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، تیسرا ایڈیشن علی گڑھ، ص:۵۹

''قصیدہ نگار بیانیہ تسلسل کا خیال رکھتا ہے لیکن اقبال لفظی دروبست اور گزشتہ الفاظ کی بازگشت کا ہنر استعمال کرتے ہیں اور معنوی ربط ہلکا ہونے کے باوجود بند کے تمام اشعار کو رشتۂ سیمیں میں باندھ دیتے ہیں۔''[1]

فاروقی صاحب کے تجزیے کا انداز جداگانہ ہے۔ وہ پوری نظم کو لفظی دروبست قرار دیتے ہیں۔ نظم کا ہر مصرعہ استعارہ، کنایہ، استعارہ بلکنایہ، مجازِ مرسل اور مجازِ عقلی سے لبریز ہے۔ نظم کے محاسن شعری کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ نظم 'ذوق وشوق' اقبال کی فکری بلندی کی واضح نشان دہی کرتی ہے۔ فاروقی صاحب اپنے ایک مضمون عروض پر کچھ بنیادی بحث پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''شاعری کا مطالعہ عروض کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اشعار، الفاظ سے بنتے ہیں اور الفاظ مختلف طرح کی آوازوں کا مجموعہ ہیں۔''[2]

ہندوپاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی اقبالیات ایک موضوع کی حیثیت سے خاصی وسعت اختیار کر چکا ہے۔ ہمارے نقاد اور محقق حضرات نے اقبالیات پر قلم اٹھایا۔ پاکستانی ادب میں سب سے زیادہ اقبال پر لکھا گیا۔ ڈاکٹر صدیق جاوید کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ ان کی تصنیف 'بالِ جبریل' کا تنقیدی مطالعہ اقبالیاتی سرمایے میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال پر ان کی تحریریں ہمیشہ موضوع کی ندرت کی حامل ہوتی ہیں اور مطالعۂ اقبال کے کسی نئے پہلو کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کے پی ایچ.ڈی کے مقالے کا موضوع بھی اقبال سے تعلق رکھتا ہے۔ 'فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ' کے موضوع پر پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ.ڈی کی سند تفویض ہوئی جب کہ ان کی تصنیف بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ ان کا ایم.اے کا مقالہ ہے جو کہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ اقبال سے ان کی دلچسپی کا واضح ثبوت ہے۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے اقبال کے اردو کلام کے مخفی گوشوں کو منور کیا ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر جمیل جالبی صاحب کا یہ بیان درج ہے:

۱۔ درسِ بلاغت۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص:۶۸

۲۔ ایضاً، ص:۸۶

''صدیق جاوید صاحب غیر معمولی تنقیدی شعور کے مالک ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں وسیع مطالعے اور گہری غور وفکر کے بعد لکھتے ہیں۔اسی لیے ان کی تحریر میں نیا پن اور ان کی فکر میں ندرت ہوتی ہے.....صدیق جاوید صاحب کا اندازِ بیان سادہ، واضح اور غیر مبہم ہے۔ان کا زاویۂ نظر سچے موتیوں کی طرح صاف وشفاف ہے۔''[1]

ڈاکٹر صدیق جاوید نے اپنی اس کتاب میں علامہ اقبال کی غزلوں اور نظموں کے مبہم پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے کلامِ اقبال کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے اور ابواب کی تقسیم اس طرح کی ہے۔سب سے پہلے دیباچہ، پس نوشت اور پیش لفظ ہے اس کے بعد اصل باب کی درجہ بندی اس طرح کی ہے:

۱۔ اقبال کی شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر

۲۔ اقبال کی شاعری کے ادوار

۳۔ بالِ جبریل کی غزلیات (فنی اور فکری مطالعہ)

۴۔ بالِ جبریل کی نظموں کا فکری مطالعہ

۵۔ بالِ جبریل کی نظموں کا فنی مطالعہ

۶۔ بالِ جبریل کی رباعیات

دیباچے میں تحریر کرتے ہیں:

''علامہ اقبال اردو شاعری کی تاریخ میں واحد شخصیت ہیں جو صرف شاعر ہی نہیں بلکہ مفکر بھی ہیں۔اقبال ایک ایسے فلسفی شاعر ہیں جن کی شاعری میں فلسفے کا ایک مربوط نظام موجود ہے۔''[2]

اس کتاب میں انھوں نے 'بالِ جبریل کی نظموں کا فکری مطالعہ' کے نام سے ایک عنوان قائم کیا ہے جس میں نظم مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، ذوق وشوق، لینن خدا کے حضور میں، پیر ومرید، نپولین اور مسولینی،

۱۔ بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ۔ڈاکٹر صدیق جاوید، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:س

۲۔ ایضاً۔ص:۹

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں، کا عمومی جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ چند مختصر نظمیں مثلاً طارق کی دعا، لالۂ صحرا، محبت، پنجاب کے دہقان سے، پر بھی سرسری نظر ڈالی ہے۔ کتاب کے اگلے باب میں انھوں نے کلام اقبال کا فنی جائزہ پیش کیا ہے۔

جیسا کہ کہا گیا کہ فکری مطالعے کے تحت صدیق جاوید صاحب نے اقبال کی قدرے طویل اور مشہور نظموں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان میں ذوق وشوق بھی شامل ہے۔

نظم کی ابتدا میں انھوں نے پس منظر کے طور پر مختصراً اس دور کے حالات قلم بند کیے جب علامہ اقبال یورپ سے واپس آئے تھے۔ صدیق صاحب نے اس وقت اقبال کی ذہنی وقلبی حالت وکیفیت کی وضاحت کی ہے۔ اس وقت رسول اکرمؐ کے روضۂ اطہر کی زیارت کی خواہش میں اقبال کس قدر تڑپتے رہے، ان کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ علامہ اقبال کے اسی احساسِ محرومی اور اس کے محرک کے طور پر نظم ذوق وشوق وقوع پذیر ہوئی۔ اس کے متعلق خود علامہ اقبال نے کہا کہ اس کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے۔

نظم 'ذوق وشوق' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علامہ کے احساسِ محرومی کا اندازہ سعدی شیرازی کے اس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں　　تہی دست رفتن سوئے دوستاں

انھوں نے پوری نظم کی مختصراً مگر جامعیت کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ نظم کے تجزیاتی مطالعے کے تحت انھوں نے بند در بند نظم کی صراحت کی ہے۔ اقبال نے اپنی نظم کے پہلے بند میں فطرت کی تصویر کشی کی ہے، اس کو صدیق جاوید صاحب ساقی نامہ کی بہاریہ تشبیب کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ تصویر کشی سے ایک طرف نظم کی سماں بندی ہوتی ہے تو دوسری جانب یہ موضوع کو آگے بڑھانے میں بھی معاون و مددگار ہوتی ہے۔ مثلاً صدیق جاوید کہتے ہیں:

> ''ذوق وشوق میں صبح کا رنگین اور دل آویز منظر ایک طرف تو قاری کی توجہ جذب کر کے اس کا رشتہ مادّی دنیا سے منقطع کر دیتا ہے۔ دوسرے یہ منظر کشادہ فضا کا احساس پیدا کرتا ہے۔''[1]

۱۔ بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ۔ صدیق جاوید، ص:۱۸۶

فطرت نگاری کے پُر تاثیر ہونے پر مدلل اظہارِ خیال کیا ہے۔اس کے بعد انھوں نے دوسرے بند کی جانب توجہ دی ہے۔اس میں ملتِ اسلامیہ کی بے عملی اور بے کسی کا بیان ہے۔ چوں کہ اس بند کے آخر میں اقبال نے عشق کی کارفرمائیوں کا ذکر کیا ہے چنانچہ یہ بھی بیان کو عشق کی جانب موڑ دیتے ہیں۔ عشق کو انھوں نے اسلامی تلمیحات کے ذریعے واضح کیا ہے۔

اس کے بعد تیسرے بند کے متعلق لکھتے ہیں جس کا پہلا شعر یہ ہے:

آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

یہ اور اس بند کے تمام اشعار میں خدا کی طرف اشارہ ہے یا یہ نعتِ رسولؐ ہے، اس ضمن میں انھوں نے مختلف شارحین و مفسرین کے اقوال نقل کیے ہیں۔ان میں یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر کے اقوال اہم ہیں۔ بقول یوسف سلیم چشتی:

''اب شاعر نعت رسول اللہؐ شروع کرتا ہے اور حضور سے براہِ راست خطاب کرتا ہے۔''[1]

ان اقوال کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بلاشبہ اس بند کا پہلا شعر رسولِ اکرمؐ کی ذات کی طرف اشارہ ہے۔اسی قبیل کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''یہ بند عشق کی توصیف میں ہے۔اقبال نے اپنے کلام میں اکثر مقامات پر عشق کو ذوقِ عمل، یقین، ایمان اور دانشِ نورانی کے معنی میں استعمال کیا ہے اور یہ عشق کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے۔''[2]

چوتھے بند کے متعلق صدیق جاوید کہتے ہیں کہ اس میں نعتِ رسولؐ قلم بند ہوئی ہے۔اس بند میں شامل نعتیہ اشعار کے متعلق کہتے ہس کہ اردو اور فارسی میں اس پایہ کی کوئی دوسری نعت موجود نہیں ہے:

۱۔ بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ۔صدیق جاوید،ص:۱۸۸

۲۔ ایضاً۔ص:۱۸۸

''اتباعِ رسولؐ ہی خدا شناسی اور خدارسی کا ذریعہ ہے۔ ایک سچے مسلمان کے لیے رسول اکرمؐ کی ذاتِ مقدس مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے عشق رسولؐ کے وسیلے سے ہی یہ دنیا اور آخرت سنور سکتی ہے۔''[1]

پانچویں یعنی آخری بند میں فلسفۂ اقبال کے دو بنیادی عناصر کا توضیحی بیان ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے عشق اور عقل کا موازنہ کیا ہے اور عقل پر عشق کو فوقیت دی ہے اور اقبال کے تصورِ وصل و فراق پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے مدلل و منطقی گفتگو کی ہے اور اقبال کے فلسفۂ وصل و فراق کو بھی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً:

''اگر انسان عیشِ وصال کو منزل قرار دے لے تو زندگی کا تخلیقی ارتقا رک جائے گا۔ وصال اور فنا کا فلسفہ بدھ مت اور عیسائیت کے نزدیک مستحسن ہو تو ہو لیکن اسلام جو ایک حرکی فلسفۂ حیات کی تعلیم دیتا ہے زندگی کے سکونی تصور کو رد کر دیتا ہے۔''[2]

پوری نظم زمانی و مکانی پیکروں، استعارات، تشبیہات و تلمیحات سے مرکب ہے۔ فارسی اشعار کا استعمال برمحل ہے، جس سے بات میں زور پیدا ہو گیا ہے۔ تیسرے بند کے آخری فارسی شعر میں جو مضمون بیان ہوا ''اے محبوب کے عشق! تو میرے اس بے قرار دل کو کش مکش کی مہلت نہ دے اور اپنی پُر پیچ زلفوں میں ایک دو اور شکنوں کا اضافہ کر دے۔''

اسی طرح کا مضمون بالِ جبریل کی ایک غزل میں بیان ہوا ہے:

گیسوے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

نظم شروع ہوتی ہے صبح کے لطیف منظر سے اور عشق و مردِ مومن کے تصورات کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ عشق، وصال و فراق پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ عشق سے متعلق بھی بلیغ استعارات و اشارات کا بیان ہے۔

۱۔ بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ۔ صدیق جاوید، ص: ۱۹۰

۲۔ ایضاً۔ ص: ۱۹۱

البتہ چوتھے بند کے حمدیہ یا نعتیہ ہونے میں اختلاف ہے، بعض حضرات اسے حمد اور بعض کے نزدیک یہ نعتیہ اشعار ہیں۔ چوں کہ یہ نظم اس وقت کی یادگار ہے جب کہ اقبال روضۂ اطہر کی دید کی دیرینہ خواہش رکھتے تھے اس لیے یہ غالب گمان ہے کہ یہ اشعار رسولِ اکرمؐ کی تعریف میں ہیں لیکن اس میں مستعمل لفظیات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حمدِ خداوندی ہے مثلاً ''گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب'' شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام، تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے۔

اس کے علاوہ اقبال کا تصورِ عشق، فراق و وصال کی جس خوب صورتی سے عکاسی کی گئی ہے وہ کسی اور نظم میں نہیں ملتی۔ فنی لحاظ سے بھی ذوق و شوق اقبال کا بہترین شاہکار ہے۔ فکر و فن میں بھرپور ہم آہنگی ہے، اقبال موضوع کے لحاظ سے بحر کا انتخاب کرتے ہیں۔ بقول رفیع الدین ہاشمی:

> ''ذوق و شوق، ترکیب بند ہیئت کے پانچ بندوں پر مشتمل ہے اور بحر رجز مثمن مطوی مجنون میں ہے۔ بحر کے ارکان یہ ہیں: مفتعلن، مفاعلن، مفتعلن، مفاعلن۔''[1]

اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم کی بحر بڑی شگفتہ اور مترنم ہے۔ قلتِ الفاظ میں وسیع مفاہیم کی ادائیگی اقبال کا ہی خاصا ہے:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

...

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمالِ بے نقاب

غرض یہ کہ نظم 'ذوق و شوق' تمام فنی محاسن سے لبریز ہے۔ اقبال نے اس نظم کو فکر و فن کے اعتبار سے بلندی تک پہنچا دیا۔ خوب صورت تلمیحات سے بھی نظم کے وزن و وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ فکر و فن کی بلندی نے 'ذوق و شوق' کو ایک زندہ جاوید ادبی تخلیق کا مرتبہ دے دیا ہے۔

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں۔ رفیع الدین ہاشمی، ص:۱۶۱

''خضر راہ''

نظم ''خضر راہ'' ۱۹۲۲ء میں ڈرامائی انداز میں لکھی گئی اقبال کی اہم نظم ہے۔اس کا براہِ راست پس منظر وہ حالات ہیں جو پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر مسلمانوں کو بالخصوص اور تمام ایشیائی اقوام کو بالعموم پیش آرہے تھے۔بیش تر ممالک اس وقت بین الاقوامی سیاست کے منجدھار میں پھنسے ہوئے تھے اور اس دس بارہ سال کے عرصے میں خاص طور سے اسلامی ممالک اور اسلامی ہند میں جو حالات رونما ہوئے ان پر اقبال کی گہری نظر تھی اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو دوسروں سے توقعات وابستہ کرنے کے بجائے خود ہی کچھ کر کے دکھانا ہوگا۔خودی، عشق اور خود اعتمادی سے کام لینا ہوگا:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

لہٰذا اقبال نے پوری شاعری میں اپنے کلام کے ذریعے اپنی قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی قومی و اجتماعی زندگی کو درپیش خطرات سے آگاہ کیا ہے۔اس سلسلے میں بطور مثال بانگِ درا سے ان کی نظم 'خضر راہ' کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے اپنے سیاسی نظریات اور فلسفیانہ خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔خضرِ راہ ان کی اہم تخلیق ہے، جس میں ان کے قومی و سیاسی خیالات و نظریات بے نقاب نظر آتے ہیں۔اس نظم کے ہر ہر شعر سے اقبال کی سیاسی بصیرت، بلند نگاہی اور دردمندی و دل سوزی ٹپکی پڑتی ہے۔

خضرِ راہ ہیئت کے اعتبار سے ترکیب بند میں لکھی ہوئی ہے۔ترکیب بند کے آخری شعر میں قافیہ بدل کر شاعر نئے بند کا آغاز کرتا ہے۔اس نظم میں اقبال نے تشبیہات و استعارات اور تلمیحات سے بکثرت کام لیا ہے جس سے نظم کے ابتدائی بند کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔شاعر نے ابتدائی چار اشعار میں ان حالات کی تصویر کشی کی ہے جو اس وقت رونما ہوئے تھے۔حضرت خضر، اقبال کے یہاں ایک اسطوری کردار کا

درجہ رکھتے ہیں اور وہ مختلف سیاق وسباق میں ہمارے روبرو ہوتے ہیں۔ اقبال نے اس نظم میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے خضر کے کردار کا انتخاب کیا ہے۔ خضر دانش مند ہیں، دراز عمر ہیں، حوادث عالم پر ان کی نظر ہے اس لیے عصری حالات پر ان سے بہتر گفتگو کون کرسکتا ہے۔ خضر اور شاعر دونوں روبرو ہیں۔ سوالات شاعر کے ہیں اور جوابات خضر کے ہیں۔ اس طرح نظم ڈرامائی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس نظم میں اقبال نے حضرت خضر کو اپنے پیغام کا وسیلہ بنایا ہے۔

اقبال کو فطرت کی عکاسی میں مہارت حاصل ہے وہ کسی بھی منظر کی اس طرح تصویر کشی کردیتے ہیں کہ اس کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ شاعر نظم کا پس منظر فطرت نگاری کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔

نظم شاعر کے استفسار سے شروع ہوتی ہے اور وہ خضر پر سوالات کی بوچھار کردیتے ہیں۔ زندگی کا راز، سلطنت کی ماہیت، سرمایہ ومحنت کے مابین کش مکش کے وجوہ، ایشیا کے وجود قومی کے شیرازے کا انتشار، مسلمانوں کی خواری اور ذلت کے اسباب وغیرہ وغیرہ۔ اس کے فوراً بعد خضر کی زبان سے ان سوالات کا جواب ترتیب وار اور عناوین کے التزام کے ساتھ دیا گیا ہے۔

شاعر اور خضر دونوں کردار اس نظم میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس نظم کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے اقبال کی انقلابی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی تھی۔ وفورِ جذبات سے اقبال خود بھی بے قابو تھے اور جب اقبال نے یہ شعر پڑھا:

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تو بیس ہزار کا مجمع بے اختیار رو رہا تھا۔

مختلف ومتعدد اساتذۂ فکر وفن نے خضر راہ کو سمجھا ہے اور اس کے اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے، انھیں صاحبان میں ایک نام آل احمد سرور کا بھی ہے۔ انھوں نے اقبال پر تقریباً دو درجن مضامین، متفرق

انداز میں لکھے ہیں اور بیس مضامین کا مجموعہ 'دانش ور اقبال' کے نام سے شائع کیا ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کی شعر و شاعری کا جائزہ دقتِ نظر اور باریک بینی سے لیا ہے اور اپنے مخصوص اسلوب میں اس کے فکری و فنی محاسن واضح کیے ہیں۔ انھوں نے بالِ جبریل کی نظموں پر سیر حاصل اور فکر انگیز بحث کی ہے۔ ان نظموں میں تصویرِ درد، سرگزشتِ آدم، ذوق و شوق اور خضر راہ خصوصیت کی حامل ہیں۔

آل احمد سرور نے اپنی تصنیف 'دانش ور اقبال' میں 'خضر راہ: ایک مطالعہ' کے نام سے عنوان قائم کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''خضرِ راہ اردو شاعری کا عہد نامۂ جدید ہے۔''

انھوں نے بہت ہی آسان اور دل کش انداز میں اقبال کی اس اہم نظم خضر راہ کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے تمام تر توجہ اقبال کے فکر و فن پر دی ہے اور ان کی شاعری کو حکیمانہ شاعری قرار دیا ہے۔ سرور صاحب کہتے ہیں کہ اقبال نے اس نظم میں محاسنِ شعری کے ذیل میں اپنی دوسری اہم نظموں مثلاً شکوہ، شمع و شاعر، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، والدہ مرحومہ کی یاد میں سے استفادہ کیا ہے۔ نظم کی شانِ نزول کی صراحت میں سرور صاحب نے اس کے پس منظر اور سنین سے متعلق بھی اظہارِ خیال کیا ہے، اس کے بعد نظم پر مجموعی تبصرہ کیا ہے۔ منظر نگاری اور فطرت کی عکاسی کی ہے اور بند در بند مدلل پیرایۂ بیان میں نظم کی وضاحت کی ہے۔ تجزیے میں سرور صاحب اقبال کے فن کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> ''خضر راہ میں اقبال کا فن پہلی دفعہ اپنی بلندی پر نظر آتا ہے، یہ وہ بلندی ہے جس میں مستی، اندیشۂ ہائے افلاکی کے ساتھ زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا حیرت انگیز عزم موجود ہے۔ یہاں اردو شاعری میں پہلی دفعہ نظم اپنے خیال کی رو کے سہارے چلتی ہے۔ آرائش و زیبائش سے بے نیاز اور اسلوب کی وہ قطعیت یا ادعا کی وہ اثر پذیری پیدا کر لیتی ہے۔''[1]

۱۔ دانش ور اقبال۔ آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۴۲

سرور صاحب نے تجزیے میں پہلے حضرت خضرؑ کا تعارف کرایا ہے، پھر 'زندگی' سے متعلق بند کی صراحت میں جنگِ عظیم اور اس کے ردِ عمل کا ذکر کیا ہے۔ سرمایہ ومحنت کے ضمن میں دو باتوں کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) اوّل تو میری معلومات کے مطابق اردو شاعری میں اس نئے مسئلے کی طرف یہ پہلا بھرپور اشارہ ہے۔

(۲) خضر، جو قوموں کی تقدیر پر نظر رکھتے ہیں، سرمایہ داری کے خلاف ہیں اور مزدور کے حمایتی۔

نظم کی معنویت کو مزید واضح کرنے کے لیے دنیاے اسلام اور ابلیس کی مجلس شوریٰ کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرور صاحب نے اپنے اس تجزیے میں بہت آسان اور دل کش انداز میں مختصر تبصرہ تحریر فرما دیا ہے اور آخر میں نظم 'خضر راہ' کو اقبال کی دوسری اہم نظموں مثلاً: مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، جبریل وابلیس اور ذوق وشوق کا محرک قرار دیا ہے۔

اسلوب احمد انصاری، اقبال کے اہم اسکالر میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کی اہم نظموں اور غزلوں دونوں کا بہت سنجیدہ اور عالمانہ مطالعہ پیش کیا ہے۔ مطالعاتِ اقبال کے سلسلے میں ان کی متعدد اہم اور مشہور تصانیف ہیں جن میں انھوں نے اقبال کی فکر اور فن کو بہت عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے تجزیوں کے لیے انتخاب کردہ نظموں میں ایک اہم نظم 'خضر راہ' بھی ہے۔

اسلوب صاحب نے نظم کی ابتدا میں اس کے شانِ نزول اور پس منظر پر تبصرہ کرتے ہوئے ان محرکات کی وضاحت کی ہے جو اس نظم کی تخلیق کا سبب ہوئے۔ تجزیہ نگار نے فنی اعتبار سے اس پر بحث کرتے ہوئے اس نظم کی ہر دل عزیزی کا سبب اس کے موضوع یا موضوعات کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے محاسنِ شعری کی بھی وضاحت کی ہے۔ پہلے بند میں دریا کے منظر کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ وہ حضرت خضر کو اقبال کا اسطوری کردار قرار دیتے ہیں۔ سماعی وحرکی پیکروں کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ زندگی کے متعلق پُرتاثیر بیانات ہیں اور اس سلسلے میں طویل بیانیہ ہے۔ اس کے بعد اسلوب صاحب رموزِ مملکت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ سرمایہ ومحنت کے ذیل میں انقلابِ روس کے پس منظر کو بیان کیا ہے۔

اسلوب صاحب نے نظم میں مستعمل محاکات سے متعلق بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ نظم کا آخری بند دنیاے اسلام سے متعلق ہے۔ اسلوب صاحب اقبال کو پان اسلامزم کی تحریک سے متاثر خیال کرتے ہیں لہٰذا انھوں نے اقبال کی فکر کو جمال الدین افغانی کی فکر سے مربوط بتایا ہے۔ وہ پہلے 'سرمایہ ومحنت' سے چند اشعار نقل کرتے ہیں:

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

پھر ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان اشعار سے جذبے کی کشید اور اس کا صیقل نمایاں ہے۔ یہاں بلند آہنگی کی بجائے مہذب اور مدھم آواز کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ ان میں ایک دلآسائی ہے۔ ٹوٹتی ہوئی ہمتوں کو باندھنے کی ترغیب ہے۔ شکستہ اور بکھرے ہوئے بال و پر کو سمیٹنے کی دعوت ہے۔ اپنے دامنِ نگاہ کو وسعت دینے اور اپنے پیمانے کو آرزوؤں کی شراب سے پُر کرنے پر اصرار ہے۔ آفتاب تازہ کے ابھرنے کی بشارت ہے۔''[1]

علامہ اقبال مسلمانوں کو رنگ و نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش سے اجتناب کلی کی تلقین کرتے ہیں اور بقول اسلوب صاحب یہ دعوت دراصل اسلام کی بنیادی تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں:

پھر سیاست چھوڑ کر داخلِ حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اقبال کی نظر صرف مسلمانوں کے حالِ زار ہی پر نہیں، بلکہ ایشیائی اقوام کی پوری برادری پر پڑتی ہے۔ وہ ان کے اندر عزم و ہمت اور استقامت کے ایک نئے جذبے کو بیدار کرنا چاہتے ہیں:

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۸۰

''زندگی اقبال کے نزدیک مراد ہے، ایک ایسے مظہر کی جس کی وسعتوں اور گہرائیوں کو ادراک کی گرفت میں آسانی کے ساتھ لایا جاسکتا ہے۔ یہ وجود کے بھنور میں ایک بے باکانہ اور بے محابا جست کی مانند ہے۔ ظن وتخمین کے ذریعے اس کی حد بندی ممکن نہیں۔ سود وزیاں کے اندازے یہاں کام نہیں دیتے۔''[1]

اسلوب صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اقبال کی مختلف نظمیں مثلاً چاند اور تارے، دو ستارے، سرودِ انجم، حور وشاعر وغیرہ میں اقبال نے حرکت ہی کو زندگی کہا ہے۔ انھیں لطفِ خرام میں کچھ اور ہی مزہ آتا ہے۔ زندگی کے فلسفہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جہاں انھوں نے زندگی کو ''پیہم جاوداں، ہر دم جواں'' کہا ہے اور ساتھ ہی بندگی کی زندگی کو 'جوئے کم آب' سے تشبیہ دی ہے۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کے بھی مشہور ومعروف مصنّفین کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف وتالیفات سے اقبالیاتی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ چوں کہ آپ کا خاص دائرۂ کار اسلامیات ہے لہٰذا انھوں نے اقبال کو بھی اسی تناظر میں دیکھا، سمجھا اور سمجھایا ہے۔

نظم 'خضراہ' پر بھی رفیع الدین ہاشمی صاحب نے طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے اقبال کی تمام نظموں کے تجزیاتی مطالعے میں یکساں طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ پوری نظم کو انھوں نے ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلا عنوان ہے 'تعارف اور پس منظر' جس میں انھوں نے نظم کی شانِ نزول کی صراحت میں اس کے پس منظر اور سنین کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت اقبال نے نظم میں جو ترمیم واصلاح کی ہے، موصوف نے اس کی بھی وضاحت کردی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے نظم کا فکری جائزہ پیش کیا ہے، جس کے ذیل میں انھوں نے حضرت خضر کی شخصیت کا تعارف کرایا ہے اور ان سے متعلق دوسرے واقعات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس بیان میں انھوں نے محض تاریخی روایات پر اکتفا کرنے کے بجائے براہِ راست قرآن کریم سے اخذ واستفادہ کیا ہے۔

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری، ص:۷۲

آخر میں دیگر فنی محاسن کا عنوان قائم کر کے نادر تراکیب، تشبیہات، مرصع کاری، صنعتِ تلمیح، صنعتِ تجنیس محرف، صنعتِ ملمع، صنعتِ مرأۃ النظر، صنعتِ ترافق اور محاکات کی وضاحت کی ہے۔

انھوں نے نظم کا فنی تجزیہ کیا ہے، جس کے تحت انھوں نے ڈرامائی کیفیت، نظم کا دھیما لہجہ اور رنگِ تغزل کی وضاحت کی ہے۔ ہاشمی صاحب نے صحرانوردی اور گردشِ پیہم کا عنوان قائم کیا ہے اور اس ذیل میں انھوں نے صحرا پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اقبال کی صحرائیت پسندی کے ضمن میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے اس قول کو بھی نقل کیا ہے: ''اقبال دشتِ حجاز پر مٹا ہوا ہے۔''[1]

صحرانوردی کے بعد شاعر کا دوسرا سوال زندگی کی حقیقت سے ہے۔ اس عنوان کے تحت ہاشمی صاحب نے کائنات کی تخلیق سے متعلق بھی افکار و نظریات کی طرف توجہ کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مختلف نظریہ سازوں مثلاً: ارسطو، افلاطون، شوپن ہار کے اقوال نقل کیے ہیں۔ انھوں نے حیات و کائنات سے متعلق اسلامی نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں اقبال کی پیش کردہ قرآنی فکر کو انھوں نے تین پہلوؤں میں تقسیم کر کے ان کی مناسب وضاحت کی ہے:

(۱) انسانی شرف و فضیلت اور عظمت آدم

(۲) انسانی زندگی میں عمل و حرکت کی اہمیت اور اس کی قوت تعمیر و تسخیر (خودی)

(۳) زندگی کی ناپائیداری اور امتحان گاہ 'تصور آخرت''[2]

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال نے ملوکیت کو جادوگری، سامری، طلسم جیسے القاب سے نوازا ہے۔ اس سلسلے میں ہاشمی صاحب نے فراعنۂ مصر، تیمور، چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور قدیم شاہانِ روم کی مثالیں پیش کی ہیں:

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ص: ۱۰۸

۲۔ ایضاً۔ ص: ۱۱۱

اس شعر میں موجود تلمیح کی بھی وضاحت کی ہے اور اس ضمن میں حضرت موسیٰ و بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ ملوکیت کے بعد جمہوریت سے متعلق طویل بیان ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے پانچویں صدی عیسوی کے رومن امپائر کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ کلامِ اقبال سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال مغربی جمہوریت سے سخت نالاں تھے۔ ہاشمی صاحب نے اس کی نہ صرف تائید کی ہے بلکہ وہ اس کی وضاحت میں مزید دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد رفیع الدین ہاشمی صاحب سرمایہ ومحنت سے متعلق شاعر (اقبال) کے سوال کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں اور اس ضمن میں مزدور طبقہ کا جو استحصال ہو رہا ہے اس کے لیے اقبال کی تائید کرتے ہوئے وہ بھی سرمایہ داروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اس میں انھوں نے ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کی بھی مثال دی ہے۔ سرمایہ داری کے بعد 'عالمِ اسلام' کی طرف توجہ کرتے ہوئے انھوں نے عربوں اور ترکوں کی باہمی آویزش کے اسباب وعلل اور نتائج وعواقب کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مسلمانوں کی حالتِ زار پر اقبال کے تاسف، بے چینی اور اضطراب کا بھی ذکر کیا ہے۔

ہاشمی صاحب نے نظم کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے اور اس ضمن میں خضر کے کردار کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ نظم کی ڈرامائی کیفیت، اس کا دھیما لہجہ، رنگِ تغزل اور دیگر فنی محاسن کو بھی عمدگی سے زیرِ بحث لائے ہیں۔

ہاشمی صاحب نے نہ صرف اقبال کے فکر وفن کو ہم تک پہنچایا ہے بلکہ نظم کے پس منظر کا بھی بہت گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں تمام تاریخی واقعات کو فنی ہنرمندی سے واضح بھی کیا ہے۔ ہاشمی صاحب کے تجزیے کی ایک بڑی خوبی ان کا استدلالی طریقۂ کار ہے، وہ ہر بات کو واضح لفظوں میں اور اس کے اصلی پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔

عبدالمغنی کی کتاب 'اقبال اور عالمی ادب'، کلیم الدین احمد کی کتاب 'اقبال ایک مطالعہ' کا تقریباً جواب ہے۔ اس میں وہ ان تمام امور کو زیرِ بحث لائے ہیں، جن کو کلیم الدین احمد نے تنقید کی کسوٹی پر پرکھا تھا۔ چنانچہ خضرِ راہ کے ذریعے بھی انھوں نے کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا مدلل جائزہ لیا ہے۔

موصوف نے اس تجزیے میں تمام بندوں کی صراحت الگ الگ کی ہے۔ نظم کی ابتدا سے متعلق کہتے ہیں کہ نظم کا پہلا حصہ دو بندوں پر مشتمل ہے پہلا بند منظر نگاری سے شروع ہوتا ہے:

ع ساحلِ دریا پہ اک رات تھا محوِ نظر

اس کے بعد عبدالمغنی دوسرے بند کی طرف آتے ہیں جن میں حضرت خضر سے پوچھے گئے سوالات ہیں۔ اس میں حضرت خضر کے جوابات کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ انھوں نے نظم کی شانِ نزول، پس منظر اور سنین وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ خضر کے جوابات میں بھی انھوں نے کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

سرمایہ و محنت کے ضمن میں انھوں نے اقبال کے جوش و خروش کا ذکر کیا ہے۔ عبدالمغنی کہتے ہیں کہ ملک کے مغربی شعرا کی پوری شاعری کو ترازوئے تنقید کے ایک پلّے پر رکھ کر دوسرے پلّے پر اقبال کی شاعری رکھ دی جائے، جس پر ایک اعلیٰ نمونہ خضر راہ ہے تو دوسرا پلّہ پہلے پلّے سے بھاری نظر آئے گا۔"[1]

> "یہ شاعری ہے فکر و خیال کی شاعری، کوئی انشائے لطیف یا ورڈس ورتھ کی فطرت نگاری یا شیکسپیئر کی مکالمہ نویسی نہیں۔ اس شاعری میں سحر آفریں تصویریں، تلمیحیں، علامتیں، تشبیہیں اور استعارے ہیں۔ طرفگی ہے، نغمگی ہے، خیال انگیزی ہے، منظر نگاری ہے اور فلسفہ طرازی بھی، تمثیل بھی اور تفکر بھی اور اشعار میں ربط و تسلسل سے لے کر بندوں میں ارتقائے خیال تک سبھی کچھ موضوع اور اس کے مضمرات کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ مکمل و موثر ہے۔"[2]

علامہ اقبال کی شاعری کا ایک خوش گوار پہلو یہ بھی ہے کہ دقیق فلسفیانہ اور عالمانہ مسائل کو مکالموں کے ذریعے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی باتیں قارئین پر منکشف ہوتی چلی جاتی ہیں۔

۱۔ اقبال اور عالمی ادب۔ عبدالمغنی، کریسٹ پبلی کیشنز، گیا، بہار، ۱۹۸۲ء، ص: ۳۲۵۔۳۲۶

۲۔ ایضاً۔ ص: ۳۲۶

اقبال کی اس نظم کے چند اشعار پر عربی فضا آفرینی کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ بقول عبدالمغنی:

''دقیق سے دقیق اور ثقیل خیالات کے اظہار میں اقبال کا محاکاتی انداز، ان کے نغماتی لحن سے مل کر، ایک شاعرانہ طلسم ہر حال میں مرتب کر لیتا ہے۔ خضر راہ میں 'سلطنت' جیسے خالص سیاسی مضمون کا آغاز بھی تلمیحات و علامات کے ساتھ ہوتا ہے۔''[1]

عبدالمغنی یہ بھی کہتے ہیں کہ نظم خضر راہ کے ذریعے اقبال نے اپنا پیغام بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے، نظم کا اختتام بھی موثر کن ہے۔ تجزیہ کے آخر میں عبدالمغنی یہ شعر پیش کرتے ہیں:

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار

ہر زماں پیشِ نظر لما یخلف المیعاد دار

عبدالمغنی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس نظم میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ شعور کی پختگی اور فن کارانہ عمدگی موجود ہے۔ الفاظ و تراکیب کے انتخاب اور استعارہ و تشبیہ اور تلمیحات کے استعمال میں اقبال نے بھرپور فکر و تدبر اور فنی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے اور ہر اعتبار سے بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

خضرِ راہ کے تجزیے میں نورالحسن نقوی نے بھی فنی ہنرمندیوں کا ثبوت دیا ہے۔ اس نظم کو نقوی صاحب نے اقبال کی پہلی عظیم نظم اور شاہکار کہا ہے۔ تجزیے میں انھوں نے آل احمد سرور اور یوسف سلیم چشتی جیسے ناقدینِ فن کے اقوال سے بھی استفادہ کیا ہے۔ تجزیے کی ابتدا پس منظر کی وضاحت سے کی ہے، جس میں انھوں نے قسطنطنیہ، حجاز، ترکی اور بیت المقدس کا ذکر کر کے مسلمانوں کے تابناک ماضی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نظم کو نقوی صاحب نے متعدد ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ 'نظم کے پیغام' کے عنوان کے تحت انھوں نے حضرت خضر کے ذریعے نظم میں اقبال کے پیغام کی اس طرح سے وضاحت کی ہے: ''حرکت زندگی ہے اور سکون موت، اور کامیابی کا راز جہد و عمل میں پوشیدہ ہے۔''

۱۔ اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا۔ عبدالمغنی، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص: ۳۹

فکری وفنی اعتبار سے نقوی صاحب خضرِ راہ کو مکمل نظم قرار دیتے ہیں۔ ''نظم کی تکنیک'' کے عنوان میں لکھتے ہیں:

> ''اپنے افکار واحساسات کو کسی دوسرے کی زبان سے ادا کرنے کا طریقِ کار شاعری کی تیسری آواز کہلاتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں تیسری آواز سے بہت کام لیا ہے۔''[1]

نقوی صاحب نے شعری وسائل کی توضیح میں حسّی پیکر، استعارہ وتشبیہ، تلمیحات، الفاظ، تراکیب وغیرہ کی توضیح کی ہے۔ انھوں نے نظم کی بحر رمل مثمن محذوف، بتائی ہے۔ نظم کو نقوی صاحب نے اقبال کے فن کا معجزہ قرار دیا ہے۔

○

۱۔ اقبال شاعر ومفکر۔ نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۵۵

''مسجدِ قرطبہ''

نظم مسجدِ قرطبہ، خضرراہ کی طرح اقبال کی محبوب ہیئت، ترکیب بند میں ہے۔ یہ اس وقت کی تصنیف ہے جب اقبال تیسری گول میز کانفرنس سے واپس لوٹ رہے تھے۔ مسجدِ قرطبہ کا تعلق سرزمین ہسپانیہ سے ہے، چنانچہ جب اقبال نے اس مسجد کی زیارت کی تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی جو اس نظم کی تخلیق کا محرک ثابت ہوئی۔ اس مسجد سے اقبال کو اس وجہ سے بھی جذباتی عقیدت ہوگئی تھی کہ وہ ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کی امین اور حسین یادگار ہے۔ اس مسجد کے نقش و نگار میں اقبال کو اپنی قوم کی عظمت، اس کے تمدن اور شعور کی داستان پوشیدہ نظر آتی ہے۔ اس نظم کا دائرۂ تخیل بہت ہمہ گیر اور اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس نظم میں رمزیت، ایمائیت، رومانیت اور ایجاز بیانی کے ساتھ ساتھ اقبال کا نظریۂ فن، تصورِ عشق و مردِ مومن اور تصورِ زمان و مکان وغیرہ بہ یک وقت جمع ہوگئے ہیں، جسے علامہ نے بڑی خوبی اور عمدگی سے نبھایا ہے۔ نظم میں آٹھ بند ہیں اور ہر بند میں آٹھ آٹھ اشعار ہیں اور ہر بند نئے تصور کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔

اس نظم میں علامہ اقبال نے اہم موضوعات اور فکری عناصر کو خوب صورتی سے یکجا کر دیا ہے۔ نظم کی ابتدا میں اقبال نے وقت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے بند میں انھوں نے اپنے فلسفۂ عشق کی توضیح کی ہے۔ تیسرے بند میں اقبال مسجد سے مخاطب ہیں جب کہ چوتھے بند میں شاعر مسجد قرطبہ کے جلال و جمال کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پائیدار بنیاد اور اس کے بے شمار ستونوں کا ذکر کرتا ہے۔ پانچویں بند میں مردِ مومن کے اوصاف کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چھٹے بند میں شاعر مسجدِ قرطبہ کی تعریف کرتے ہوئے اسے اربابِ فن کا کعبہ اور حرم کا ہم رتبہ اور اسلام کی شان قرار دیتا ہے۔ ساتویں بند میں شاعر مسجد قرطبہ کی ویرانی اور اذان کی پُرسوز صداؤں سے محرومی پر اپنے دلی اضطراب کا ذکر کرتا ہے۔ آٹھویں اور آخری بند میں شاعر نے بھرپور رجائیت کا اظہار کیا ہے۔

نظم 'مسجدِ قرطبہ' صوتی لحاظ سے موسیقیت کی عمدہ مثال ہے۔ اس کے موضوع سے ہی اقبال کی قوتِ متخیلہ انھیں ماضی کی دور تک سیر کراتی ہے اور اسپین میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا پورا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے کر دیتی ہے۔

اقبال نے اپنی اس نظم مسجد قرطبہ میں زمانے کے دونوں درجات یعنی دورانِ محض اور سلسلہ وار وقت کی اپنے طور پر بڑے موثر انداز سے تشریح کی ہے:

سلسلہ روز و شب، نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب، اصلِ حیات و ممات
سلسلہ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

مسجد قرطبہ کے تنقیدی مطالعے میں متعدد ناقدین نے حصہ لیا جن میں پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر صدیق جاوید اور پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے تجزیوں اور ان کے تنقیدی ردِ عمل کو پیش کیا جائے گا۔

عبدالمغنی اپنی کتاب ''اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا'' میں کلامِ اقبال کے مختلف ادوار و مجموعوں کو زیر بحث لائے ہیں۔ مجموعۂ بالِ جبریل کے مطالعے کے تحت انھوں نے نظموں اور غزلوں کے فنی محاسن پر تبصرہ کیا ہے جس میں مسجدِ قرطبہ کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس نظم سے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اس میں جن تصورات کو مفکر اقبال نے پیش کیا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہیں:

(۱) وقت مسلسل متحرک ہے۔
(۲) عشق لافانی ہے۔
(۳) مسجد دین اور فن دونوں کی بہترین علامت ہے۔
(۴) تاریخ عالم میں ہسپانیہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
(۵) مردِ مومن ایک کائناتی قوت ہے۔
(۶) عصرِ حاضر ایک انقلابی موڑ پر ہے۔

انھوں نے مسجدِ قرطبہ کو بالِ جبریل کی چھوٹی چھوٹی نظموں کے احساسات واشارات کی توسیع قرار دیا ہے۔

عبدالمغنی صاحب کہتے ہیں کہ جن تصورات کو شاعر اقبال نے اس میں نظم کیا ہے، اس کی ابتدائی جھلک بانگِ درا کی دوسری بڑی نظموں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ صنف نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مسلسل ایک موضوع کو بیان کیا جاتا رہا ہے جب کہ اس کے برعکس اقبال کی نظموں کے ہر بند میں موضوع تبدیل ہوتا رہتا ہے لیکن موضوعی اعتبار سے نظم خلط ملط نہیں ہونے پاتی۔ نظم کے اشعار وموضوعات تمام بندوں کو ایک لڑی میں پروئے رکھتے ہیں۔ اس کے متعلق عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''یہ نظم اپنے موضوع 'مسجدِ قرطبہ' ہی کے مانند حسین وجمیل ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی کا باہمی تناسب اس کے عناصرِ تخلیق کی ہم آہنگی اور اس کے رنگ وآہنگ کی باہمی پیوستگی اسے ایک نغمہ موسیقی کی طرح سحر انگیز بناتی ہے..... مسجد قرطبہ کے اشعار، تخیلات، لسانیات اور صوتیات کا ایک طلسم قائم کرتے ہیں۔ اس جادو کا تجزیہ مشکل ہے۔''[1]

نظم کے تجزیاتی مطالعے میں عبدالمغنی نے مسجد قرطبہ کا موازنہ اقبال کی دیگر نظموں سے بھی کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہ سوار
حاملِ 'خلقِ عظیم' صاحبِ صدق ویقیں

اس میں موجود استعارات 'حاملِ خلقِ عظیم' اور 'صاحبِ صدق ویقیں' کو موصوف نے طلوعِ اسلام میں استعمال ہونے والے استعارات کے مترادف قرار دیا ہے:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

۱۔ اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا۔ عبدالمغنی، ص:۵۶

عبدالمغنی صاحب نے مسجد قرطبہ میں اقبال کے ذہنی وفنی ارتقا کو چند نکات کے ذریعہ اس طرح سے واضح کیا ہے:

(۱) فلسفیانہ افکار اور اجتماعی تصورات زیادہ نمایاں شکل میں موضوعِ شاعری بنتے نظر آتے ہیں۔

(۲) انہی افکار و تصورات میں ملتِ اسلامیہ کا حال و مستقبل بھی شامل ہے۔

(۳) سطحی نقطۂ نظر عالمی تناظر میں اور آفاقی زاویۂ نگاہ سے رونما ہوا ہے۔

(۴) فن کی لطافت و نفاست دقیق سے دقیق خیالات کو بھی زیادہ سے زیادہ رنگین، پُر لطف، پُر اثر اور سرور انگیز بنا دیتی ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''پوری نظم میں ارتقاے خیال اور نظم کے مختلف اجزا میں ہم آہنگی کی بیّن دلیل بنا دیتا ہے۔ اس دلیل سے عالمِ فانی میں بقاے دوام کا پہلو نکلتا ہے اور انسانیت ازلی و ابدی قدروں پر ایمان کی بدولت، جس کی تشریح و تفصیل بیچ کے بندوں میں پائی جاتی ہے۔ اپنی معراج کو پہنچ جاتی ہے۔''[۱]

تجزیے کے آخر میں عبدالمغنی صاحب نے انھیں وجوہات کی وجہ سے مسجد قرطبہ کو طلوعِ اسلام کی توسیع قرار دیا ہے۔ دونوں میں مومن کے آفاقی کردار کی توصیف و تعریف بھی ہے۔ مثلاً:

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

یہی خیال طلوعِ اسلام میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

چوں کہ نظم مسجدِ قرطبہ کا تعلق سرزمین ہسپانیہ سے ہے لہٰذا مشہور مفکر اسلام اور عالمی سطح کے ممتاز مسلم دانش ور سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی اس کو اپنے طور پر سمجھا ہے اور پیش کیا ہے۔

۱۔ اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا۔ عبدالمغنی، ص: ۶۰

انھوں نے تجزیے کی ابتدا پس منظر کی صراحت سے کی ہے۔ شانِ نزول کی وضاحت اور سنین کا بھی اہتمام کیا ہے۔ تجزیہ نگار نے مسجد قرطبہ میں شامل تاریخی نکات کی نشان دہی کی ہے۔ نظم کے سبب تالیف سے متعلق لکھتے ہیں:

''اقبال نے اس تاریخی اور تاریخ ساز مسجد کی ساخت میں بیکراں جذبات، پاکیزہ محبت کے احساسات، فنِ تعمیر کی عبقریت، اسلامی آرٹ کا اعجاز اور اس کی کرامت اس کی سادگی و پرکاری جمال کی رعنائی اور حسن کی یکتائی کا بڑی بصیرت سے معائنہ کیا۔ اس منظر عبرت اثر نے مومن شاعر کے نازک جذبات کے تار چھیڑ دیے۔''[1]

علی میاں کہتے ہیں کہ یہ مسجد مسلمانوں کی تہذیبی علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسجد کے در و دیوار میں اقبال کو مومن کے اخلاق حسنہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ مسجد کے جلال و جمال کو دیکھ کر اقبال پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کا وہ پُرشکوہ الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسجد سے وابستہ انھیں وہ اذانیں یاد آئیں جن سے فضا مسحور رہتی تھی۔ اذان جس خطابِ عام اور پیغام پر مشتمل ہوتی ہے اس کی مثال دنیا کے کسی فلسفہ و پیام اور مذہب والہام میں نہیں مل سکتی۔ مسجد کے صحن و محراب دیکھ کر اقبال پر جو اضطراب طاری ہوا وہی اس نظم کی تخلیق کا محرک ہے:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

علی میاں ندوی نے اقبال کے تصورِ عشق و مردِ مومن کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ ان بلیغ استعارات کے متعلق کہتے ہیں:

''محبت ہی سے تصویر کائنات میں رنگ و نور اور مرقع عالم میں فرح و سرور کی نمود ہے، محبت ہی وہ شراب طہور ہے جس سے سرشار ہو کر عارف سرمست اور عاشق نغمہ سرا ہو اُٹھتے ہیں، محبت کبھی منبر و محراب کی نقیب، کبھی حکیم نکتہ داں، کبھی قائد جنگ و جہاد اور کبھی فاتح اقوام و امم بن کر سامنے آتی ہے۔''[2]

۱۔ نقوشِ اقبال (ترجمہ 'روائع اقبال' مترجم: شمس تبریز)۔ علی میاں ندوی، ص: ۱۳۷۔۱۳۸

۲۔ ایضاً۔ ص: ۱۴۰

علی میاں ندوی نے فلسفۂ عشق ومحبت پر بھرپور نظر ڈالی ہے۔ تجزیہ نگار کو اس میں مردِ خدا کا عمل بے لوث دکھائی دیتا ہے۔ اس میں مومن کی خصوصیات نظر آتی ہیں، اس کے منارے اعلیٰ ظرفی اور بلند ہمتی کے غماز ہیں۔ انھوں نے اقبال کے تصورِ عشق پر بھی ایک عارفانہ نظر ڈالی ہے۔ مسجدِ قرطبہ کی تعمیر میں گویا اسی عشق کی کارفرمائی ہے۔

علی میاں ندوی کہتے ہیں کہ عشق کے بغیر اس کی حیثیت محض سطحی، مصنوعی اور رنگ وروغن سے بنے ڈھانچے کی سی ہوتی، لیکن جذبۂ عشق کی بدولت یہ آج بھی زندہ و پائندہ ہے کیوں کہ عشق ہی کے ذریعے پتھر کے مجسمہ اور زندہ انسان میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ علی میاں ندوی کہتے ہیں کہ مسجد اپنی شان وشوکت کے اعتبار سے مردِ مومن کی تمام خصوصیات سموئے ہوئے ہے۔ اپنے جلال و جمال، پختگی اور مضبوطی، وسعت ورفعت میں ہو بہ ہو مردِ خدا کا عکس ہے۔ علی میاں ندوی کا خیال ہے کہ یہ مسجد ملتِ اسلامیہ کے افکار وخیالات، اس کے عزائم اور معتقدات کی نمائندہ ہے۔ وہ مسجد قرطبہ کو مردِ مومن کے اوصاف سے مشابہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''دنیا میں مومن کے خواب کی تعبیر اور اس کی اولوالعزمیوں کی تشریح وتفسیر ہے اور خشت وسنگ اور تعمیری رنگ وآہنگ میں مومن کی روح کا ظہور تو اپنے وجود میں سرِّ مومن کا افشائے راز اور اس کے لیل ونہار کا سوز وگداز ہے۔''[1]

علی میاں ندوی کہتے ہیں کہ مردِ مومن کی آرزوئیں اگرچہ مختصر ہیں لیکن اس کے نصب العین اور مقاصد عظیم وجلیل ہیں۔ اس کے بعد وہ اسلامی دور کے اندلس میں پہنچ جاتے ہیں اور ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں، جنھوں نے عالم انسانیت کے لیے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ اس کے بعد دنیا میں ظہور پذیر ہونے والی تحریکات کا ذکر بھی والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔

علی میاں کے نزدیک مسجد قرطبہ اقبال کی شاہکار نظم ہے۔ عربی ادب جب ایک طویل عرصے تک اقبال کے ذکر سے خالی رہا تو موصوف ہی نے اس طرف توجہ کی اور عالمِ عرب کو علامہ اقبال سے روشناس کرانے کی پہل کی۔ انھوں نے اپنی کتاب روائع اقبال (ترجمہ، نقوش اقبال) میں مسجد قرطبہ،

۱۔ نقوشِ اقبال۔ ابوالحسن علی ندوی (مترجم شمس تبریز)، ص: ۱۴۵

ذوق وشوق، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، طارق کی دعا جیسی نظموں پر عمومی تبصرہ کیا ہے۔ نظم مسجدِ قرطبہ کو انھوں نے واضح انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس نظم کی فکری وفنی جہتوں پر ترتیب وار تذکرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ نظم کی ابتدا پس منظر سے ہوتی ہے۔ انھوں نے نظم کی وجہ تخلیق پر بھی روشنی ڈالی ہے اور نظم کے وجود میں آنے کے محرکات بھی بتائے ہیں۔ نظم میں موجود تلمیحات اور استعارات کا متاثر کن بیان ہے۔ پوری نظم کا مطالعہ بڑے مدلل، مفصل اور عالمانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ نظم کے تقریباً تمام بندوں کو زیر بحث لائے ہیں۔ خواہ وہ فلسفۂ عشق ہو یا مردِ مومن مسجد کی بہترین مرقع کشی کی ہے۔ اس کے بعد 'اذان' سے متعلق بھی گفتگو کی ہے۔ نظم بند در بند آگے بڑھتی ہے، تصورِ زماں ومکاں، مردِ مومن، عشق کا والہانہ تصور، مسجد قرطبہ کی تصویر کشی، تاریخ اسلام واندلس کی طرف اشارہ اور متعدد تحریکات کا ذکر سب کچھ یہاں موجود ہے۔

علی میاں ندوی کہتے ہیں کہ اس نظم میں علامہ اقبال نے اپنے تصورِ زماں کو بھی بڑے پُر جوش اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ لفظ ومعنی کی ہم آہنگی اس نظم کی خوبی ہے۔ تصویر کشی اور پیکر تراشی کے بھی اس نظم میں بہترین نمونے موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال نے لفظوں کے فن کارانہ استعمال، مخصوص تراکیب اور استعارات وتشبیہات سے مدد لی ہے:

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے مسجد قرطبہ کا تجزیہ اپنے مخصوص عالمانہ وناقدانہ نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ نظم ہسپانیہ میں لکھی گئی، نظم کی ابتدا، تعارف اور پس منظر سے ہوتی ہے۔ اقبال کو اس خطے سے خصوصی لگاؤ تھا، جس کے متعلق انھوں نے پوری نظم ہی لکھ دی ہے۔ نظم 'ہسپانیہ' میں کہتے ہیں:

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
(بال جبریل)

پس منظر کے ذیل میں انھوں نے نظم کی وجہ تخلیق پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس ضمن میں سنین کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے 'قرطبہ اور مسجد قرطبہ' کا عنوان قائم کر کے تاریخی شواہد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں انھوں نے عبدالرحمٰن الداخل اوّل کا اس کے بعد اس کے فرزند ہشام اوّل کی شجاعت کا تذکرہ کیا ہے۔ نظم کے فکری جائزے میں مسجد قرطبہ کے مباحث کو مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا ہے:

(۱) کائنات کا تکوینی نظام (۲) نظریۂ فن

(۳) نظریۂ عشق (۴) مسجد قرطبہ کا جلال و جمال

(۵) مردِ مومن (۶) مسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ

(۷) اندلس میں احیائے اسلام[۱]

تجزیہ نگار نے انھیں عنوانات کے تحت نظم کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ پہلے عنوان میں انھوں نے نظم کے پہلے بند کو لیا ہے اور اس کو مختلف پیرایۂ بیان کے ذریعے واضح کیا ہے۔ 'نظریۂ عشق' کے عنوان کے تحت انھوں نے جذبۂ عشق کی مختلف طریقوں سے ترجمانی کی ہے۔ اس نظم میں اقبال کے عشق میں معنوی اعتبار سے توسیع نظر آتی ہے، جس کا اظہار ہاشمی صاحب نے اس طرح کیا ہے:

(الف) عشق کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے ..... جیسے: خدا کا کلام

(ب) عشق غیر فانی ہے ..... جیسے: دم جبریل

(ج) عشق کائنات کی مقدس ترین چیز ہے ..... جیسے: خدا کا رسولؐ

(د) عشق کائنات کی سب سے پاکیزہ شے ہے ..... جیسے: دلِ مصطفیٰؐ

(ہ) عشق ہی کائنات میں مقتدر اور حکمراں ہے ..... جیسے: فقیہ حرم اور امیرِ جنود[۲]

چوتھے بند میں سلسلۂ خیال کو مسجد قرطبہ سے مربوط کیا ہے اور اس کے تحت 'مسجد قرطبہ کا جلال و جمال' کے نام سے عنوان قائم کیا ہے اور اس میں مسجد کی زیبائش اور رعنائی کا ذکر کیا ہے۔ تجزیے میں

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں۔ رفیع الدین ہاشمی، ص: ۱۷۰

۲۔ ایضاً۔ ص: ۱۷۳

ہاشمی صاحب نے اپنے ذاتی تجربات کو بھی نقل کیا ہے۔ مسجد کی زیارت سے متعلق اپنی دلی کیفیات کا یہ پُراثر بیان ہے۔ 'نظریۂ مردِ مومن' کے عنوان کے تحت انھوں نے مسجد قرطبہ کو مردِ مومن کے اوصاف سے ملایا ہے۔ کہتے ہیں کہ اقبال کا تصور مردِ مومن ایک خالصتاً اسلامی نظریہ ہے جس کی اساس قرآن وحدیث ہے۔ مردِ مومن کے اوصاف کے ہی ضمن میں انھوں نے 'مسلم ہسپانیہ کی عظمت وشکوہ' کے عنوان سے ایک بیانیہ لکھا ہے جس میں انھوں نے طارق بن زیاد کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ابن ابی عامر المنصور کا تذکرہ ہے۔ (ہسپانیہ میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کو عہدِ زرّیں کہا جاتا ہے) اس کے بعد انھوں نے نظم کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے۔ فنی تجزیے کے تحت انھوں نے نظم کو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً: ایجاز و بلاغت، تنوع وغیرہ۔ نظم میں متنوع خیالات پیش کیے گئے ہیں اس کو انھوں نے یوں ترتیب دیا ہے:

(الف) نظریات زمان ومکاں، عشق، فن اور مردِ کامل۔

(ب) مسجد قرطبہ کی عظمت ورفعت اور حسن و پاکیزگی۔

(ج) یورپ کے بعض فکری اور سیاسی انقلابات

(د) مسلم ہسپانیہ کی عظمت اور یورپ پر مسلم تمدن کے اثرات

(ہ) احیاے ملت اسلامیہ کے امکانات[1]

ہاشمی صاحب نے نظم پر فارسی اثرات کی بھی نشان دہی کی ہے، چوں کہ ہسپانیہ کی فضا اور ماحول عربی تھا، لہٰذا اس نظم کا مزاج عربی ہونا عام بات ہے۔ مسجد کے ستون کو دیکھ کر اقبال کو ہجوم نخیل یاد آتے ہیں اور اندلس کی ہواؤں میں بوئے یمن محسوس ہوتی ہے۔ 'کاس الکرام' کی ترکیب کے متعلق ہاشمی صاحب کہتے ہیں یہ عربی کے درج ذیل شعر سے ماخوذ ہے:

شر بنا و اَهرقنا علی الارض جرعةً

و لـلارض من کاس الکرام نصیب

نظم کے تجزیے میں ہاشمی صاحب نے تشبیہات واستعارات کی بہ حسن وخوبی صراحت کی ہے۔ صنائع وبدائع کا عنوان قائم کر کے محاسن شعری کی وضاحت کی ہے۔

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں۔ رفیع الدین ہاشمی، ص: ۱۸۸۔۱۸۹

نظم مسجدِ قرطبہ کو پروفیسر نورالحسن نقوی نے اقبال کی لافانی اور اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار قرار دیا ہے۔ تجزیے کی ابتدا میں انھوں نے پس منظر کی وضاحت میں ہسپانیہ کے مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ بیان کی ہے اور طارق بن زیاد کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مسجدِ قرطبہ کی تصویر کشی کی ہے۔ اپنے تجزیاتی طریقۂ کار کے مطابق انھوں نے نظم کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے عنوان میں ''نظم کا خلاصہ'' پیش کیا ہے، جس میں نقوی صاحب نے جذبۂ عشق اور مردِ مومن کے اوصاف کی وضاحت کی ہے۔ دوسرے عنوان میں ''اقبال کا فلسفہ'' کے تحت انھوں نے اقبال کے نظامِ فکر میں وقت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ تیسرے عنوان میں ''فلسفۂ عشق'' پر دلالت کی ہے جس میں انھوں نے عشق کو اقبال کے نزدیک ابدی و جاودانی یعنی کبھی نہ فنا ہونے والا جذبہ کہا ہے۔ مومن کے اوصاف کی صراحت میں نقوی صاحب نے فقر کو مردِ مومن کی اہم خصوصیت کہا ہے۔ رجائیت کو فکرِ اقبال کے بنیادی عناصر میں ایک اہم جز قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد نقوی صاحب نے نظم کا فنی تجزیہ کیا ہے اور نظم کو شعریت، رمزیت، ایمائیت، حقیقت و رومانیت کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ نظم کے فکری عنصر کی وضاحت اس طرح کی ہے:

> ''مسجدِ قرطبہ کی دلکشی کا اصل راز یہی ہے کہ یہاں فکر و فن کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔ اقبال کا نظریۂ عشق، تصورِ زماں، فلسفۂ جہد و عمل، مردِ مومن کے اوصاف، اسپین کی تاریخ، مسجدِ قرطبہ کی تفصیل۔ کیا ہے جو اس نظم میں موجود نہیں مگر اسے شاعر کے فن کا معجزہ کہیے کہ یہ ساری چیزیں نظم کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہیں اور اسے دنیا کی عظیم نظموں کے پہلو میں جگہ دلاتی ہیں۔''[1]

تجزیے کے آخر میں نقوی صاحب نظم کی بحر سے متعلق کہتے ہیں کہ یہ نظم بحرِ منسرح زحافی یعنی آٹھ رکنی ہے اور پیکر تراشی کی عمدہ مثال ہے اور اس نظم کو غزل و نظم دونوں کی خوبیوں سے معمور قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر صدیق جاوید نے اپنی تصنیف 'بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ' میں بال جبریل کی نظموں کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے تحت انھوں نے مسجد قرطبہ کی بھی وضاحت کی ہے۔ ان کی یہ کتاب

۱۔ اقبال شاعر و مفکر۔ نورالحسن نقوی، ص:۲۱۲

اقبالیات سے ان کی گہری دلچسپی کا ثبوت ہے۔ اقبال پر ان کی تحریریں ہمیشہ موضوع کی ندرت کی حامل ہوتی ہیں اور مطالعۂ اقبال کے کسی نئے پہلو کو اُجاگر کرتی ہیں۔

صدیق جاوید نے تجزیے کی تمہید میں مسجدِ قرطبہ کی فکری وفنی اہمیت پر عمومی گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد وہ نظم کے سبب تالیف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اقبال کے سفر انگلستان کی روداد پیش کی ہے اور اس زرّیں عہد کو یاد کیا ہے جب کہ ہسپانیہ مسلم دانش وروں کے زیر اثر علم وحکمت کا گہوارہ بن گیا۔ اس میں انھوں نے مسجد کی فن تعمیر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ صدیق صاحب کہتے ہیں کہ اب وہ مسجد اپنی شان وشوکت کے لحاظ سے تو برقرار نہیں ہے لیکن اس کے حوالے سے شاعر نے زندگی کے دقیق مسائل کو پیش کیا ہے۔

صدیق جاوید نے نظم کے آغاز میں اقبال کے تصورِ وقت کو بیان کیا ہے۔ زمان کے حرکیاتی تسلسل کو بیان کرنے کے بعد صدیق صاحب نے تقدیر اور عمل کے مابین تعلق کو واضح کیا ہے۔ اقبال کے فکری نظام میں عمل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ تصورِ زمان ومکاں کے بعد انھوں نے اقبال کے تصورِ عشق کو اہمیت دی ہے:

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

صدیق صاحب لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے اپنے بیش تر کلام میں عقل کی تنقیص کرتے ہوئے اس کا تقابل عشق سے کیا ہے اور عشق کو عقل پر فوقیت دی ہے۔ ان کے نزدیک منطقی استدلال اور ظن وتخمین عقل کا وصفِ خاص ہے اس کے برعکس عشق انسان کے اندر بصیرت اور قوت دونوں کا اضافہ کرتا ہے۔''[1]

صدیق صاحب نے اقبال کی ترکیب خونِ جگر پر توجہ مرکوز کی ہے۔ کہتے ہیں کہ خونِ جگر کی ترکیب اقبال کے تصورِ فن میں بنیادی اصطلاح کی حیثیت رکھتی ہے۔ تصورِ فن کے بعد انھوں نے اقبال کے

۱۔ بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ۔ صدیق جاوید، ص: ۱۷۱

مردِ کامل کا تصور بھی پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ مردِ کامل کی تکمیل خودی کے ذریعے ممکن ہے۔ صدیق صاحب نے تجزیے میں مسجد قرطبہ کی تعمیر میں مردانِ حق اور عربی شہ سواروں کے کارناموں کو بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے جرمنی کی تحریک اصلاحِ دیں، فرانس کے ہنگامہ خیز انقلاب اور 'ملتِ رومی نژاد' کا تذکرہ بھی پُرسوز انداز میں بیان کیا ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری اقبال کے تجزیہ نگاروں میں ایک کلیدی اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ معلوم ہے وہ انگریزی کے استاد اور مغربی ادبیات سے بہت متاثر ہیں اور مشرقیات کو بھی بہت قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ انھوں نے تفہیم اقبال کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ تجزیے کی ابتدا میں انھوں نے ٹی. ایس. ایلیٹ کے آخری شاہکار Four Quartets کو نظم مسجد قرطبہ کے ابتدائی بند کے مماثل قرار دیا ہے، زمان و مکان پر بھی عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔ اقبال کے تصورِ عشق کے متعلق کہتے ہیں:

> ''عشق فی الحقیقت ایک کیفیت سرمدی ہے، یہ اقبال کا نفس ناطقہ ہے۔ ایک شیشۂ برق ہے جو ایک لمحے میں روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور جس کا مقصد پایانِ کار اس تجربے تک بیان فراہم کرتا ہے جسے اقبال نے اپنے ادق فاضلانہ انگریزی خطبات میں Unitive Experience کے نام سے ممیّز کیا ہے۔''[1]

زماں و مکاں کے بعد اسلوب صاحب اقبال کے تصورِ وقت کی وضاحت کرتے ہیں جس کے تحت انھوں نے احادیث شریف کو بھی بطور مثال پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے مغربی نقادوں کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے اور دنیا کا تصور، عشق کے صحیح معنی متعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تجزیے میں انھوں نے حیاتیاتی استعاروں کے ساتھ لمسیاتی اور مرئی پیکروں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہجومِ نخیل کے شعری پیکر کو نخلِ ایمن یا وادیٔ ایمن کی معروف تلمیح سے ملاتے ہیں۔ 'ہاتھ ہے اللہ کا' کی ترکیب کو انھوں نے 'سورۂ الفتح' کی اس آیت 'یداللہ فوق ایدیہ' سے ماخوذ بتایا ہے۔ عقل سے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ کائنات کو مسخر کرنے میں عقل ایک موثر حربہ اور آلۂ کار ہے لیکن اس کے باوجود حقیقت کا عرفان عقل جزوی کی بجائے عشق اور وجدان ہی کے وسیلے سے ممکن ہے۔

۱۔ اندازے۔ اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص: ۶۴

مسجد قرطبہ کو اسلوب صاحب نے علامتی انداز میں لیا ہے، کیوں کہ اس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔ مردِ مومن کے اوصاف، عشق کا دوام سبھی چیزیں اس میں مضمر ہیں۔ مسجد قرطبہ کے ضمن میں انھوں نے جدید آئرستانی شاعر ڈبلیو. بی. اے ٹیس کی مشہور نظم Shiling to Byzantium میں شعری پیکر کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے ان کی قدرے مغرب زدگی کا بھی ثبوت ملتا ہے، انھوں نے نبی کریمؐ کے خلقِ عظیم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ان کے مشرق و مغرب کے اثرات کا خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔ وادیٔ ایمن اور اندلسیوں کی خصوصیات بتاتے ہوئے اپنی بات کو مزید مدلل بنانے کے لیے انھوں نے اے. ایٹس کی نظم سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ برطانوی شاعر ولیم بلیک کی نباتاتی زندگی یعنی Vegetative Existence کی معنی خیز ترکیب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس میں انھوں نے دیگر تحریکات کا بھی ذکر کیا ہے جن میں مارٹن لوتھر کی اصلاحِ دین کی تحریک، فرانس کے انقلاب اہم ہیں۔ چوں کہ اس نظم کے ذریعے اقبال مسلمانوں کو ان کے درخشاں ماضی کی یاد دلانا چاہتے تھے اس لیے اسلوب صاحب نے اس طرف خاص توجہ دی ہے۔ اقبال کی نظم کے اختتامیہ بند کے جواب میں ٹی. ایس. ایلیٹ کی نظم کا حوالہ پیش کیا ہے۔ غرض اسلوب صاحب نے اس نظم کا مطالعہ فکری و فنی اور اسلوبیاتی اعتبار سے بھی کیا ہے اور بعض انگریزی شعرا و مفکرین سے اس کا موازنہ کر کے عالمی ادبیات میں اس نظم کی اہمیت و عظمت اور عبقریت تسلیم کرانے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کے تجزیہ نگاروں میں اسلوب صاحب کا منفرد و ممتاز مقام ہے۔

پروفیسر سید محمد ہاشم نے مسجدِ قرطبہ کو اقبال کی اعلیٰ ترین نظموں میں ایک نظم قرار دیا ہے اور اس کے پس منظر کی وضاحت میں انھوں نے بیسویں صدی کی ابتدا میں ایشیائی مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہاشم صاحب نے مسجدِ قرطبہ کی صناعی میں اس کے کاریگروں کی پاک بینی اور علمیت پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ اس نظم میں اقبال کے پیش کردہ موضوعات کو انھوں نے اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ''مسجدِ قرطبہ میں انھوں نے سبھی بنیادی تصورات پوری جامعیت کے ساتھ پیش کیے ہیں، اس میں نہ صرف زمان و مکان، مردِ مومن اور خودی کے تصورات کے

ساتھ عشق، حسن، فن اور تاریخ کے نظریات موجود ہیں، بلکہ 'شکوہ' کا جذبہ 'خضرِ راہ' کی فکر اور 'طلوعِ اسلام' کا اضطراب بھی ملتا ہے۔''[1]

ہاشم صاحب تجزیے میں نظم کی ابتدائی فضا کو تخیلات سے لبریز خیال کرتے ہیں۔ پہلے بند میں شامل زمان و مکان کی حقیقت پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ تصورِ وقت کے سلسلے میں انھوں نے نیوٹن، ملا باقر، ابن خلدون، برگساں اور اقبال کے خیالات سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ انھیں بھرپور عالمانہ انداز سے پیش بھی کیا ہے۔ اقبال کے تصورِ زمان پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کے بعد ہاشم صاحب شاعر کے مردِ مومن کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اوصاف کو بھی انھوں نے اپنی فنی ہنرمندیوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ ہاشم صاحب مردِ کامل کو عشق کی خصوصیات سے متصف قرار دیتے ہوئے سلسلۂ کلام کو اقبال کے تصورِ عشق کی طرف موڑا ہے اور اس کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

''اقبال کے یہاں عشق کا جامع اور ہمہ گیر تصور ہے، یہ ایک شدید اور گہرا جذبہ ہے، جو حقیقت کے ادراک کی رسائی کا ایک مؤثر وسیلہ ہے، یہ ایک قوتِ حیات ہے، جو تمام صلاحیتوں کو پہچان کر راہ میں حائل سب دشواریوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ ذات کو علویت کے انتہائی مقامات تک پہنچانے، جو ہر وجود یعنی خودی کو چمکانے اور ارتفاع بخشنے کے لیے جس شے کی ضرورت ہے، وہ عشق ہے۔''[2]

تصورِ عشق کی مزید وضاحت کے لیے انھوں نے اقبال کی دوسری نظم ''عشق اور موت'' کو بھی بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ اقبال نے عشق کے استحکام کے لیے خونِ جگر کو ضروری قرار دیا ہے۔ تجزیہ نگار نے اقبال کے خونِ جگر کی جامع انداز میں صراحت کی ہے۔ ابتدائی پانچوں بندوں میں اقبال نے اپنے انھیں خیالات کو پیش کیا ہے۔ چھٹے بند کی وضاحت میں ہاشم صاحب نے اندلس کے عہدِ رفتہ اور ان مسلمانوں سے

۱۔ اقبال فکر و فن۔ ڈاکٹر سید محمد ہاشم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۴۷

۲۔ ایضاً۔ ص: ۱۵۲

متعلق تفصیلی کلام کیا ہے جنھوں نے اس مسجد کو تعمیر کیا تھا۔ ساتویں بند کے تحت عالمی انقلابات کے ضمن میں انھوں نے فرانس، جرمنی اور روم کے انقلابات کا ذکر کیا ہے۔

ہاشم صاحب نے نظم پر مجموعی اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں خطاب کا رنگ ولہجہ غالب ہے اور انھوں نے نظم میں استفہامیہ انداز کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مسجدِ قرطبہ کو ہاشم صاحب نے اقبال کی مقصدی شاعری کے ذیل میں رکھا ہے۔ شعری محاسن کی بھی تجزیہ نگار نے وضاحت کردی ہے۔

O

ساقی نامہ

'ساقی نامہ' کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ یہ بالِ جبریل کی سب سے مشہور و مقبول نظم ہے۔ اس میں اقبال نے اپنے نمائندہ افکار مثلاً زندگی، حرکت و عمل اور خودی کے موضوعات کو نسبتاً زیادہ پُرزور انداز میں پیش کیا ہے۔ 'ساقی نامہ' نظم کے ایک خاص مزاج اور لہجہ کی مظہر ہوتی ہے۔ اس کی ابتدا تو فارسی زبان و ادب سے ہوئی تھی، وہاں یہ صنف رندی و سرمستی اور اس کے متعلقات کے بیان پر مشتمل ہوتی تھی، اردو میں بھی بہت سے ساقی نامے لکھے گئے۔ مثنویوں میں بھی ان کی خاصی تعداد ملتی ہے اور اس کو اس کے تمام آداب کے ساتھ بہت اچھی طرح برتا گیا ہے۔ اقبال نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز میں اسے لکھا۔ ظاہر ہے اس میں اس ترقی یافتہ دور کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے اور اس عہد میں دنیا کی بدلتی ہوئی پُر پیچ صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے اس لحاظ سے اس نظم کی ہیئت اور اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور اقبال نے موضوعاتی اعتبار سے بجا طور پر ساقی نامہ کو وسعت بخشی۔ بالِ جبریل کی اس نظم کا پہلا بند واقعتاً قاری پر ایک عجیب و غریب کیفیت اور سرمستی کا رنگ طاری کر دیتا ہے اور قاری اقبال کے فکری دریا کی روانی میں بہتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً اس بند کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسنِ و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

ساقی نامہ فنی محاسن سے پُر اقبال کی ایک اہم نظم ہے۔اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے فلسفیانہ افکار کو سادہ اور آسان زبان میں پیش کر دیا ہے۔اس میں ساقی نامہ کی موضوعی مناسبت سے اقبال نے بھی مے کدہ و پیمانہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی شراب علامتی و استعاراتی رنگ سے معمور ہے۔وہ معرفت اور علم و دانش کی شراب ہے جو خودی کو بیدار کرتی ہے:

پلا دے مجھے وہ مے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات
وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات
شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

یوسف سلیم چشتی نے اقبال کی نظم ساقی نامہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اس میں موجود برجستگی اور روانی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اس میں غیر معمولی سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ساری نظم میں کہیں آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔اوّل سے آخر تک آمد ہی آمد ہے اس کو تنہائی میں غور سے پڑھا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نظم لکھتے وقت اقبال پر فیضانِ سماوی کا نزول ہو رہا تھا۔''[1]

نظم 'ساقی نامہ' سات بندوں پر مشتمل ہے۔پہلے بند میں اقبال نے اپنے عام طریقۂ کار کے مطابق فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔یہ منظر انتہائی دل کش و پُر کشش ہے جس کو پڑھ کر قاری فوراً نظم کے متن کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔یہ تصویر بہار کی آمد کی ہے جس میں ہر طرف مختلف قسم کے پھول کھلے ہوئے ہیں، پرندے چہچہا رہے ہیں اور رواں دواں نہر ہے اور یہ سب چیزیں اقبال کی فکر و تخیل اور فنی نادرہ قاری کی بھی بھرپور عکاسی کر رہی ہیں۔پہاڑوں سے گزرتی ہوئی اس استعاراتی نہر سے متعلق ساقی نامہ کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

۱۔ بالِ جبریل مع شرح۔مؤلفہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،نومبر ۱۹۸۳ء،ص:۶۴۶

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

نہر کی روانی محض ایک بیان نہیں ہے بلکہ دریا کے بہاؤ میں زندگی کی حقیقت پوشیدہ ہے جس طرح یہ نہر پُر پیچ راستوں سے ہو کر گزرتی رہی ہے۔ اقبال اسی طرح توانا اور مضبوط زندگی بننے کے لیے سختیوں اور پریشانیوں اور رُکاوٹوں کو ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سخت حالات سے نبرد آزما ہو کر ہی زندگی میں تابناکی آتی ہے۔ نہر کی اس روانی میں حرکت و عمل کا پیغام بھی پوشیدہ ہے۔ یعنی جوئے کہستاں، زندگی اور حرکت دونوں کا استعارہ ہے۔

نظم 'ہمالہ' میں بھی اقبال نے ندی کا ذکر مؤثر انداز میں کیا ہے:

آتی ہے ندی کوہِ فراز سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی

(نظم ہمالہ۔ بانگِ درا)

زیرِ تجزیہ نظم میں اقبال نے ندی کو 'زندگی' کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس ندی کے بہاؤ میں بھی بہت تیزی ہے۔ جس طرح انسان کی زندگی ہر وقت حرکت میں ہے خواہ اس کی راہ میں کتنی ہی رُکاوٹیں اور تکالیف ہوں، لیکن وہ دم بھر کو بھی نہیں رکتی۔ اسی طرح ندی کے بہاؤ میں بھی بہت روانگی ہے۔ یہ کبھی تو راستوں کے پتھروں سے ٹکرا جاتی ہے اور کبھی اپنے آپ کو بچا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کے ساتھ ہے کہ وہ مختلف قسم کی پریشانیوں سے نبرد آزما ہوتی ہے اور کبھی اس کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔

نظم کے دوسرے بند میں اس وقت کی پوری دنیا کے سیاسی حالات کا ذکر ہے۔ یورپ و ایشیا ہر جگہ انقلاب کی لہر آ چکی تھی، مسلم ممالک میں بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کے خلاف آواز اُٹھ رہی تھی،

ہندوستان میں بھی آزادی کی آواز تیز ہورہی تھی۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی پستی کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے دین کی بنیادی باتوں اور اصولوں کو چھوڑ کر بہت سی غیر اسلامی روایات کو اپنا لیا ہے اور وہ ان روایات کے غلام ہوکر رہ گئے ہیں، اگر چہ وہ کلمۂ توحید کی وجہ سے پُر جوش نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل سوز سے خالی ہوچکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جذبۂ عشق کو فراموش کردیا ہے۔ اقبال اسی بند کے آخری شعر میں مسلمانوں کی حالت کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

تیسرے بند میں اقبال ملتِ اسلامیہ کے لیے دعا گو ہیں۔ شاعر ساقیِ ازل یعنی خدا سے دعا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے خدا اُمتِ مسلماں کو 'دلِ مرتضیٰ' اور 'سوزِ صدیق' عطا کر یعنی ان میں آغازِ اسلام کا سا جوش و ولولہ پیدا کر اور ان کے دلوں میں جذبۂ عشق کو بیدار کردے تاکہ وہ حرکت و عمل پر آمادہ ہوجائیں یعنی اقبال مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک بڑا سبب جذبۂ عشق کے فقدان اور حرکت و عمل سے محرومی کو قرار دیتے ہیں۔

اس دعا کے بعد چوتھے اور پانچویں بند میں اقبال دوبارہ مسلمانوں کو زندگی کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کے یہاں 'زندگی' کا لفظ وسیع ترین معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ساقی نامہ میں یہ زندگی زیادہ توانا و تابناک ہوچکی ہے، اس میں ساری کائنات کی نیرنگیاں مضمر ہیں۔ ذوقِ پرواز کا نام زندگی ہے، اس دنیا کی ہر شے خواہ وہ بجلی و تارے ہوں، کانٹے ہوں یا ببول یا سونے اور چاندی، غرض یہ کہ ہر چیز میں پائیداری زندگی سے ہی ہے اور یہ زندگی ایک جگہ رُکی ہوئی نہیں ہے بلکہ ہر وقت حرکت میں ہے اور یہ بالآخر ایسی طاقت ور ہوجاتی ہے کہ خودی کی تخلیق کا سبب بن جاتی ہے، وہ خودی جو پوری کائنات کو مسخر کرلے، اسی زندگی میں مضمر ہے۔

آخر کے دو بندوں میں اقبال نے 'خودی' کی حقیقت و ماہیت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ خودی کو اقبال کے افکار میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ زندگی، عشق، خودی اور حرکت و عمل چاروں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وہ زندگی بے کار ہے جس میں یہ تینوں خصوصیت موجود نہ ہوں یعنی یہ کہ جس نے زندگی اور اس کے راز کو سمجھ لیا اس نے عقل و عشق، حرکت و سکون، سیاست غرض ہر چیز کو سمجھ لیا اور جس نے ان سب کو سمجھا اور

ان پر عمل کرلیا تو اس کی خودی بیدار ہوگئی۔ جس طرح تلوار بغیر دھار کے بیکار ہے، اسی طرح زندگی میں اگر خودی نہ ہو تو وہ بیکار ہے۔ شاعر نے خودی کا مسکن انسانی دل کو قرار دیا ہے:

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

شعری محاسن کے لحاظ سے بھی یہ ایک مکمل اور شان دار نظم ہے جس سے نظم میں تغزل پیدا ہوگیا ہے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی برمحل ہے۔ نظم میں حرکی پیکروں سے بھی کام لیا گیا ہے، مثلاً جگنو، پارہ، اور گرداب وغیرہ۔

'پروفیسر رفیع الدین ہاشمی' نظم کے تجزیے کی ابتدا تعارف اور پس منظر سے کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے ان اشعار کی بھی جو کہ بعد میں قلم زد کر دیے گئے تھے، نشان دہی کی ہے۔ نظم کے پس منظر میں ترکی کے 'مصطفیٰ کمال پاشا' کے دورِ حکومت کا بیان ہے اور نظم کے فکری جائزے میں ہاشمی صاحب نے اس ماحول و فضا کا نقشہ کھینچا ہے جس میں نظم کی تخلیق ہوئی۔ دوسرے بند میں نظم کیے گئے موضوعات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ موصوف نے نظم میں بیان کیے گئے مباحث کو درج ذیل عنوانات میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ عالمی منظر پر ایک نگاہ ۲۔ مسلم انحطاط کا مرثیہ
۳۔ احیاے ملت کے لیے ولولہ و عزم ۴۔ زندگی، کش مکشِ انقلاب
۴۔ خودی کی قوت اور اس کے امکانات ۶۔ پرورشِ خودی کی تلقین

ان عنوانات کے تحت بیان کردہ مباحث کو انھوں نے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں اس وقت کے حالات سے متعلق انھوں نے جو ضمنی تبصرے کیے ہیں وہ تاریخی ہونے کے ساتھ بہت حکیمانہ بھی ہیں۔ پہلے عنوان 'عالمی منظر پر ایک نگاہ' میں انھوں نے برطانوی امپیریلزم کے زوال، سرمایہ دارانہ نظام، مغرب کے علوم جدیدہ اور چینی قوم پر تبصرہ کیا ہے۔ 'خودی کی قوت اور اس کے امکانات' میں انھوں نے خودی کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے:

(۱) خودی میں ایٹم کی مانند طاقت و قوت کا زبردست اور لامحدود ذخیرہ پوشیدہ ہے۔
(۲) خودی ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے جس کے آغاز و انجام کی کوئی انتہا نہیں۔

(۳) پتھر ہو یا چاند، دنیا کی ہر شے میں خودی کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔

(۴) خودی کا مرکز و منبع انسانی دل ہے، یعنی یہ ایک طرح کی داخلی کیفیت کا نام ہے۔

خودی کی عظمت کے اعتراف کے بعد انھوں نے اس کی پرورش کی بھی تلقین کی ہے۔

ہاشمی صاحب نے نظم کے فنی تجزیہ میں اس کی بحر، بندوں اور اس کے ارکان پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ فارسی اور اردو ساقی ناموں کے تتبع میں اقبال نے اس نظم میں اسی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ ہاشمی صاحب کے نزدیک یہ نظم ایجاز و بلاغت سے معمور ہے اور اس کی مثال میں انھوں نے بہت سے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ یہاں صرف ایک شعر پیش کیا جاتا ہے:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

اپنے تجزیے میں نظم کی روانی و تسلسل کے ساتھ ساتھ ہاشمی صاحب نے جوشِ بیان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ 'فنی محاسن' کے ذیل میں تصویر کاری، نئی تراکیب، صنائع و بدائع (صنعتِ تجنیس)، صنعتِ تلمیح، صنعتِ مشاکلہ، صنعتِ عکس کی بھی نشان دہی کی ہے۔

آخر میں ہاشمی صاحب نے 'مجموعی قدر و قیمت' کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ فارسی میں ظہوری وغیرہ کا ساقی نامہ معنوی اعتبار سے بہت محدود ہے اور میر حسن اور نسیم کی اردو اور فارسی مثنویاں بھی بیانیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن جس شان سے اقبال نے یہ ساقی نامہ پیش کیا اس کی نظیر اردو اور فارسی میں کہیں نہیں ملتی۔

ہاشمی صاحب کا تجزیاتی انداز اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ وہ پہلے نظم کو مختلف عنوانات میں تقسیم کر دیتے ہیں، اس سے وہ واضح اور آسان ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس کے بعد نظم کا تجزیہ سمجھنا مزید سہل ہو جاتا ہے۔ تاریخی واقعات کا ذکر اور پس منظر کا بیان جس کثرت سے ان کے یہاں ہوتا ہے، دوسرے تجزیہ نگاروں کے یہاں نہیں ہے۔ جس طرح انھوں نے خودی کی خصوصیات بتائی ہیں اس سے اقبال کی فکر مزید مستحکم ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ فنی محاسن کی وضاحت سے انھوں نے نظم کو آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ غرض یہ کہ ہاشمی صاحب کا تجزیاتی طریقۂ کار بہت استدلالی ہونے کے ساتھ ساتھ عالمانہ بھی ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے اقبال کی نظم 'ساقی نامہ' کے تجزیے کی ابتدا میں فارسی ساقی نامے کی روایت پر روشنی ڈالی ہے اور اس نظم کو 'ایک نوع کی التجا' قرار دیا ہے۔ نظم کے آغاز کے متعلق کہتے ہیں کہ ''ساقی نامے کا آغاز عام طور پر بہار کی آمد کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔'' ابتدائی بند میں موجود تراکیب مثلاً 'رگِ سنگ' اور 'دامنِ کوہسار' کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اسی بند کے پہلے شعر میں بصارتی اور حرکی اور اگلے تین اشعار میں تمام تر حرکی پیکروں کی نشان دہی کی ہے۔ 'جوئے کہستاں' کی استعاراتی معنویت کو برگساں کے بے پناہ موج یعنی Immense Wave کے مشابہ بتایا ہے۔ دوسرے بند کے تیسرے شعر:

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

کے متعلق کہتے ہیں کہ اس میں ایک نقطۂ انحراف ہے اور اس کی وضاحت میں انھوں نے اقبال کی ایک دوسری نظم 'فرمانِ خدا (فرشتوں سے)' کے اشعار پیش کیے ہیں۔ تیسرے بند کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا آغاز ''شدتِ شوق کے فقدان کے احساس سے ہوتا ہے۔'' تیسرے بند کے پہلے شعر میں 'شرابِ کہن' کے رمزیاتی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اقبال کا مطمحِ نظر دلِ مرتضیٰ اور سوزِ صدیق کا حصول ہے۔ چوتھے بند کے پہلے شعر میں 'رمِ زندگی' کو جوشِ نمو اور تسلسل کا شعری پیکر قرار دیتے ہیں۔ اسلوب صاحب اقبال کے فلسفیانہ افکار کو 'لوکریشس' کی شاعری اور نطشے کی فکر سے ملاتے ہیں۔ تجزیے میں انھوں نے سائنٹفک طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ اقبال کے خیال کی وضاحت کے لیے غالب کی فکر کو بھی پیش کرتے ہیں۔ زندگی سے متعلق اقبال کے حرکی تصور کو جرمن مفکر لائبنیز کی فکر سے ملاتے ہیں۔ اس نظم میں اسلوب صاحب نے اقبال کے تصورِ خودی، عشق، زندگی، حرکی تصور، زمان و مکان پر بھی کلام کیا ہے۔ تجزیے کے آخر میں کہتے ہیں:

> ''اس پوری نظم میں اقبال کے بعض مخصوص تصورات جیسے خودی، عشق، وقت اور ابدیت کی حسیاتی شعری تجسیم انتہائی موثر انداز میں پیش کی گئی ہے..... زندگی کے حرکی تصور کی عکاسی روشن محاکات، رواں دواں اور سبک بحروں اور اندرونی موسیقی کی وساطت سے حیرت انگیز بے ساختگی کے ساتھ کی گئی ہے۔''[1]

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۴۵

اسلوب صاحب کا تجزیاتی طریقۂ کار تحقیقی و توضیحی ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں پس منظر کی وضاحت نہیں ہوتی لیکن انھوں نے اس نظم کو فنی اعتبار سے تجزیے کے اصولوں کی روشنی میں پرکھا ہے۔ اسلوب صاحب کا تعلق انگریزی ادبیات سے بہت گہرا ہے اس لیے ان کے یہاں مغربی مفکرین اور ان کے اقوال و اصول بہ کثرت ملتے ہیں۔ بسا اوقات انھوں نے اقبال کی فکر کو بھی مغربی مفکرین کے افکار سے ملایا ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی نے نظم 'ساقی نامہ' کے تجزیے کی ابتدا میں فارسی شاعری میں ساقی نامہ کی روایت پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اقبال نے اپنی نظم میں اس روایت سے انحراف کیا ہے اور ایک عظیم مقصد کے لیے اس صنف کا استعمال کیا ہے۔ نقوی صاحب نے نظم کی ہیئت پر بھی مدلل گفتگو کی ہے اور مختصراً نظم کے تمام بندوں پر اظہارِ خیال کیا ہے، اس کے بعد انھوں نے نظم میں بیان کردہ افکار کو عنوانات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ موصوف نے پہلا عنوان 'اقبال کا پیغام' کے نام سے قائم کیا ہے۔ جہد و عمل کے عنوان میں انھوں نے پہلے بند کی وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد 'زندگی' اور 'فلسفۂ خودی' سے متعلق اقبال کے خیالات کو پیش کیا ہے۔ خودی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''خودی ذاتِ لامحدود کو اپنے اندر جذب کر لینے کے لیے بے تاب رہتی ہے۔ خودی خلوت پسند ہے کہ تنہائی میں غور و فکر سے مسائل کو حل کر سکے۔ خودی وہ نقطۂ نوری ہے کہ مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے تو تاریکی میں بھی سب کچھ دیکھ سکتی ہے۔''[1]

تجزیے کے آخر میں نقوی صاحب نے 'خدا سے دعا' کے عنوان میں شاعر کے دلی جذبات کی عکاسی کی ہے اور بتایا ہے کہ بدحال قوم کی ترقی کے لیے شاعر کن امور کو ضروری خیال کرتا ہے اور انھیں اپنی قوم کے نوجوانوں میں عام کرنا چاہتا ہے۔ شعری محاسن کے ضمن میں نقوی صاحب نے تشبیہات و استعارات اور دیگر حرکی پیکروں کی نشان دہی اور نظم کے اسلوب پر مفید گفتگو کی ہے۔ ہیئت کے متعلق کہتے ہیں کہ اقبال نے یہ نظم بحر متقارب مثمن محذوف میں لکھی ہے اور یہی بحر 'میر حسن' نے بھی اپنی مثنوی میں استعمال کی ہے۔ نقوی صاحب نے نظم کی صراحت میں فارسی 'ساقی نامہ' کی روایت پر روشنی

۱۔ اقبال: شاعر و مفکر۔ نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص: ۲۱۸

ڈالی ہے اور نظم میں بیان کیے گئے اقبال کے تمام افکار کو ذیلی عنوانات کے ذریعے واضح کیا ہے۔ نظم کی ہیئت پر بھی مؤثر گفتگو کی ہے، چونکہ نقوی صاحب کا طریقۂ کار عالمانہ ہے اس لیے انھوں نے نہ صرف نظم کی تشریح کی ہے بلکہ اس میں پوشیدہ اقبال کے پیغام کو بھی پورے طور پر واضح کر دیا ہے۔ فلسفۂ خودی، عشق اور زندگی کے بارے میں مدلل گفتگو کی ہے، فنی و شعری محاسن کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ نقوی صاحب کا تجزیہ فکر و فن دونوں کی وضاحت کے اعتبار سے مکمل ہے۔

'پروفیسر عبدالمغنی' نے اپنی کتاب 'اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا' میں نظم 'ساقی نامہ' پر مختصراً اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ اس کو غنائیہ مثنوی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نظم میں تنظیم سے زیادہ تغزل کا انداز ہے۔ نہر کے بہاؤ کے اشعار سے متعلق کہتے ہیں کہ یہ اقبال کی فنی مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ عبدالمغنی صاحب نظم میں استعمال کردہ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی بھی نشان دہی کرتے ہیں۔ تجزیہ نگار نے نظم میں پیش کردہ اقبال کے افکار و تصورات کی عمدگی سے وضاحت کی ہے۔ چوتھے بند میں کہتے ہیں کہ اس میں زندگی کی تصویر ہے۔ پانچویں بند میں تصویر مسلسل حرکت کی ہے جب کہ چھٹے بند میں خودی کی جلوہ آرائیاں ہیں۔ نظم کے آخر میں عبدالمغنی کہتے ہیں کہ ساقی نامہ بلاشبہ 'مسجدِ قرطبہ' اور 'ذوق و شوق' کی طرح اقبال کے ذہنی و فنی ارتقا کا اگلا مرحلہ ہے۔

عبدالمغنی صاحب نے نظم پر سرسری اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے نظم کو سہلِ ممتنع کا شاہکار کہا ہے اگرچہ نظم روانی میں کہی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں اقبال کے تمام افکار موجود ہیں مثلاً زندگی، خودی، عشق اور جہد و عمل۔ نہر کی روانی کا ذکر اگرچہ اقبال نے آسان لفظوں میں کیا ہے، لیکن معنویت کے اعتبار سے ان میں بہت گہرائی ہے، جس کی وضاحت موصوف نے نہیں کی ہے۔

'محمد منصور عالم' نے نظم کے تجزیاتی مطالعے میں بتایا ہے کہ 'ساقی نامہ' لکھنے کی روایت یہی ہے کہ ''بہار کا ذکر ہو، حسین مناظر پیش کیے جائیں پھر ان سے تحریک پا کر ساقی سے مخاطبت ہو اور طلبِ مے کے پردے میں اپنے خاص مقاصد بیان کر دیے جائیں۔''

محمد منصور عالم صاحب نے اقبال کے فارسی کے شعری مجموعے 'پیامِ مشرق' میں شامل ساقی نامہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس نظم کے مطالب و مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم کے دوسرے بند کے شعر

ع 'ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے'

میں کہتے ہیں کہ یہ محض ایک مصرعہ نہیں، بہترین ادبی بیان ہے۔ اس میں شاعر کے تخلیقی وفور اور روانی طبع کی طرف بھی اشارہ ہے۔ انھوں نے نظم کی خوب صورت ہیئت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور نظم کی تخلیق کا منشا بھی بیان کیا ہے۔ تیسرے بند کو دعائیہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس نظم کے ذریعے سے اقبال کے فلسفۂ زندگی، خودی، حرکت و عمل، تسلسلِ وقت اور تنوع حیات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ چھٹے بند میں 'زمانے' کے اُلٹ پھیر، موجِ نفس کے استعاراتی نظام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ خودی کے حصول کے ذرائع کے متعلق کہتے ہیں:

''(۱) باوقار عزت والا رزق (۲) چاپلوسی و خوشامد سے اجتناب (۳) خدا کی کارسازی پر یقین (۴) دنیا سے بے نیازی (۵) فکر و عمل کا ذوق۔''[۱]

منصور صاحب کا تجزیاتی طریقۂ کار سادہ اور سلیس ہے، زبان بھی سادگی سے بھرپور ہے۔ نظم کی وضاحت میں براہِ راست اس پر تبصرہ کرنے کے بجائے انھوں نے ساقی نامہ کی تاریخی حیثیت پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور دلیل کے طور پر پیامِ مشرق میں شامل فارسی نظم 'ساقی نامہ' کو پیش کیا ہے۔ خودی کی ماہیت کے ذیل میں اس کے ذرائع بھی بتائے ہیں، حالاں کہ انھوں نے نظم کی معنویت پر تو روشنی ڈالی ہے لیکن ان کے اس تجزیے سے اقبال کے وہ افکار پوری طرح سامنے نہیں آپاتے جو وہ اس نظم کے ذریعے سے دینا چاہتے ہیں۔

'ملک حسن اختر' نے اپنی کتاب اطرافِ اقبال میں 'ساقی نامہ'، 'مسجدِ قرطبہ' اور 'ذوق و شوق' کا مطالعہ کیا ہے۔ موضوعی اعتبار سے ملک حسن اختر نے ساقی نامہ کو مسجدِ قرطبہ کے مقابلے برتر ثابت کیا ہے۔ نظم کی ہیئت متعین کرنے کے بعد افکارِ اقبال یعنی زندگی اور خودی کے فلسفیانہ حقائق کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ ملک صاحب نے نظم کی شعریت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ محاسنِ شعری کے ضمن میں تشبیہات و استعارات کی

۱۔ فروغِ اقبال۔ محمد منصور عالم، ممتاز احمد پرنٹ آرٹس، بودھ گیا، جنوری ۲۰۰۸ء، ص: ۲۸۴

وضاحت کے ساتھ اقبال کے اسلوب کی انفرادیت پر گفتگو کی ہے۔ نظم کی وجہ تسمیہ کے بیان میں کہتے ہیں کہ ''اس کا نام 'ساقی نامہ' اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں ساقیٔ ازل یعنی خدا سے خطاب کیا گیا ہے۔'' اس کے بعد انھوں نے بند در بند نظم کی وضاحت کی ہے۔ چوتھے اور پانچویں بند کی تشریح میں انھوں نے زندگی کی حقیقت اور اس میں پوشیدہ قوتِ پنہاں کو دلائل سے بیان کیا ہے۔ فلسفۂ خودی کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''اپنے دل کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ انسان خودی کا عرفان حاصل کر گیا اور خودی کے عرفان سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے اسی لیے علامہ اقبال نے اپنے آپ کو پہچاننے پر اتنا زور دیا ہے۔''[1]

ملک حسن اختر صاحب خودی کے متعلق طویل بیانیے پر ہی اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ محاسنِ شعری کے ضمن میں انھوں نے صنائع لفظی و معنوی دونوں کی وضاحت کی ہے۔

'ساقی نامہ' کے تجزیہ نگاروں میں جو نام زیادہ مشہور ہیں ان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کلامِ اقبال اور اس کے مطالعے کو عربی میں پیش کیا۔ انھوں نے اپنی عربی کتاب 'روائع اقبال' جو کہ نقوشِ اقبال کے نام سے اردو میں ترجمہ ہوئی، میں نظم 'ساقی نامہ' پر مدلل گفتگو کی ہے۔ اپنے تجزیاتی مطالعے کی ابتدا میں انھوں نے طویل نظم کی حیثیت سے اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور اسے مثنوی کی طرح دل کش و مؤثر قرار دیتے ہوئے میر حسن اور نسیم کی مثنویوں سے مؤثر وار کہا ہے۔ موصوف نے نظم کے ہر شعر کی تشریح کی ہے۔ صنائع و بدائع کی بھی وضاحت کی ہے۔ پہلے بند میں دریا کی روانی کے ذکر کو زندگی کے فلسفے سے ملایا ہے۔ یورپ اور مغربی سیاست کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ ندوی صاحب نے نظم کی تخلیق کے محرکات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور نظم کے فکری نکات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ چوں کہ علی میاں ندوی کی عالمانہ حیثیت ہے اس لیے انھوں نے نظم کی تشریح بھی کی ہے، تاکہ عام قاری بھی نظم کو صحیح طریقے سے سمجھ سکے۔ اقبال کی فکر کو بھی اس کے ذریعے سمجھایا ہے اور نظم کے مرکزی خیال پر بھی جامع گفتگو کی ہے۔

OOO

۱۔ اطرافِ اقبال۔ ملک حسن اختر، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئیوالان، دہلی، ص: ۳۵۷

شعاعِ اُمید

اقبال کی ایک بہت مختصر لیکن فکر انگیز نظم 'شعاعِ اُمید' ان کے تیسرے مجموعۂ کلام 'ضربِ کلیم' میں شامل ہے۔ اس مجموعے کو انھوں نے 'اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف' قرار دیا ہے۔ دوسرے مجموعوں کے برخلاف ضربِ کلیم کو اقبال نے باقاعدہ طور پر مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے مثلاً اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، ادبیات، عورت، فنونِ لطیفہ، سیاسیاتِ مشرق و مغرب، محراب گل افغان کے افکار وغیرہ۔ ان کی یہ نظم 'شعاعِ امید' ادبیات و فنونِ لطیفہ کے تحت آتی ہے۔ اس باب میں علامہ اقبال نے ادب اور فنونِ لطیفہ پر اسلامی زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے اور مسلمانوں کو مغربی نظریات اور خیالات کی خرابیوں اور گمراہیوں سے آگاہ کیا ہے۔ بقول یوسف سلیم چشتی:

> ''اس دل پذیر تمثیلی نظم میں اقبال نے ہندوستان کے باشندوں کو رجائیت کی تعلیم دی ہے اور نصیحت کی ہے کہ مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انشاء اللہ ضرور تاریکی دور ہوگی، نا اُمید ہو جانا سب سے بڑا گناہ ہے کیوں کہ اس کے بعد ترقی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔''[1]

نظم 'شعاعِ اُمید' تین بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے اور دوسرے بند میں چار چار اشعار اور تیسرے اور آخری بند میں نو اشعار ہیں۔ پہلے بند میں سورج اپنی کرنوں سے مخاطب ہے۔ دوسرے بند میں سورج کی شعاعیں مقصد کی تکمیل میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتی ہیں۔ آخری بند کا مرکز و محور امید کی ایک کرن ہے۔

اقبال کی گزشتہ نظموں کی طرح اس نظم کو بھی بہت سے تجزیہ نگاروں نے اپنے اصولوں کی روشنی میں پرکھا ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے اپنی کتاب 'اقبال: شاعر و مفکر' میں اقبال کی متعدد نظموں کے تجزیے کیے ہیں۔ 'شعاعِ امید' بھی ان میں سے ایک ہے جس کا انھوں نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس مطالعے

۱۔ شرح ضربِ کلیم۔ یوسف سلیم چشتی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص: ۲۳۵

سے بجا طور پر ان کے تنقیدی رویے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ابتدا میں نقوی صاحب نے اقبال کے فن سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے نظم کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد بند در بند نظم کی صراحت کی ہے اور آخر میں پوری نظم پر عمومی تبصرہ کیا ہے۔

نقوی صاحب 'شعاعِ امید' کو اقبال کی چھوٹی سی دل آویز نظم قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس کی دل کشی کا راز یہ ہے کہ رمزیت و اشاریت، احساس کی شدت، تخیل کی بلند پروازی، پیرایے بیان کی دل آویزی کو شاعر نے انتہائی سلیقے سے استعمال کیا ہے۔'' نقوی صاحب نے نظم کی ہیئت بھی متعین کی ہے۔ چوں کہ اس نظم کا پیرایۂ بیان تمثیلی ہے اس کے متعلق نقوی صاحب کہتے ہیں کہ ''اس میں تجسیم کا عمل شروع سے آخر تک کارفرما رہتا ہے اور یہ اقبال کا پسندیدہ طریقِ کار ہے۔'' محاسنِ شعری کے ضمن میں نقوی صاحب نے استعارہ، تشبیہ، کنایہ وغیرہ کی بھی صراحت کی ہے۔ نظم کے اس شعر:

نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثل صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

میں نقوی صاحب نے 'ریت کے ذرّوں' اور 'گل و لالہ' میں ایک نوع کے تضاد کی وضاحت کی ہے۔ تیسرے اور آخری بند کو نظم کا حاصل قرار دیتے ہوئے اسے نظم میں مرکزی حیثیت کا حامل کہتے ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی نے بھی اقبال کی اس مختصر نظم کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے نظم 'شعاعِ امید' کو ضربِ کلیم کی تمام نظموں پر فوقیت دی ہے۔ نظم کے تمثیلی پیرایے کو عبدالمغنی صاحب نے اقبال کی دوسری نظموں کی مدد سے سمجھایا ہے۔ انھوں نے نظم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں کرنوں سے سورج کا خطاب ہے، جو عصرِ حاضر کی بڑھتی ہوئی تاریکی پر روشنی ڈالتا ہے۔ دوسرے حصے میں کرنوں پر اس خطاب کا اثر دکھایا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں ایک شعاعِ آفتاب کا یہ کلام ہے کہ وہ واپس نہیں جائے گی۔ عبدالمغنی صاحب اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''شعاعِ امید'' اقبال کی شاعری اور اس کے امید افزا پیغام کی علامت ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ آفتاب کا استعارہ بھی اقبال کا محبوب موضوع ہے جس کی طرف اقبال نے نظم 'ذوق و شوق' میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

ع ''تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے''

نظم کے آخری بند کے متعلق عبدالمغنی صاحب کہتے ہیں:

''ان اشعار میں بانگِ درا کی تصویر درد کی وطن دوستی، شمع اور شاعر کی ملت پروری، طلوعِ اسلام کی مشرقیت، خضرِ راہ کی آفاقیت اور بالِ جبریل کی مسجدِ قرطبہ کی ایمان پروری، ذوق وشوق کا جذبہ وولولہ اور ساقی نامہ کی خودی کے احساسات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔''[1]

پروفیسر عبدالمغنی نے نظم کے تجزیے میں طوالت کے بجائے اختصار سے کام لیا ہے اور اقبال نے نظم کے ذریعے جو پیغام دیا ہے اس کی بھی وضاحت عبدالمغنی صاحب نے نہیں کی ہے۔ محض محاسنِ شعری اور نظم کے مفہوم پر ہی روشنی ڈالی ہے۔

کلیم الدین احمد اردو کے اہم نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر انگریزی ادب کے استاد ہونے کے سبب اس زبان کی ادبیات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، عملی تنقید اور اردو زبان وفنِ داستان گوئی پر اور دوسری سبھی کتابیں اردو تنقید سے ان کی گہری واقفیت اور مہارت کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے علمی وادبی حلقوں میں وہ انتہا پسند نقاد کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ انھوں نے غزل کو 'نیم وحشی صنفِ سخن' کہا تھا اور اپنے دور تک کی اردو تنقید کو ''محبوب کی موہوم کمر اور اقلیدس کا خیالی نقطہ'' کہہ کر اس کے وجود کو محض فرضی قرار دیا۔ اردو کی بہت سی شاعری کو مغربی معیاروں پر جانچتے ہوئے بے وقعت اور بے حیثیت قرار دیا۔ ظاہر ہے، کلیم صاحب کے اس انقلابی اور جارحیت آمیز نظریے نے اردو شاعری اور تنقید دونوں جگہ ہلچل مچادی۔ ان کی سخت مخالفت ہوئی لیکن ان سب کے باوجود ان کے وسعتِ مطالعہ اور تنقیدی صلاحیت کا ہمیشہ اعتراف کیا گیا۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ سخن ہائے گفتنی، تجزیۂ نفس اور ادبی تنقید وغیرہ بھی کلیم الدین احمد کی اہم کتابیں ہیں۔

'اقبال ایک مطالعہ' کلیم الدین احمد کی اقبالیات سے متعلق اہم کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے اقبال کی بہت سی نظموں کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مسجدِ قرطبہ، خضرِ راہ، ذوق وشوق، طلوعِ اسلام، لالۂ صحرا، ایک آرزو اور علم وعشق جیسی نظمیں شامل ہیں۔

۱۔ اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا۔ عبدالمغنی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلّی، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۰۹

کلیم الدین احمد نے عمومی طور پر اقبال کے تمام کلام، بالخصوص پیامی شاعری پر نکتہ چینی کی ہے، لیکن شعاعِ امید کے پیامی نظم ہونے کے باوجود اس کے بارے میں ان کی رائے مثبت ہے۔ اگرچہ اس کے متعلق بھی کلیم الدین صاحب کہتے ہیں کہ اس میں خیالات عمیق، بلند اور وسیع نہیں ہیں لیکن ان ہی کا یہ بیان بھی ہے کہ اس نظم میں اقبال نے ایک تخیلی تجربہ کو شاعرانہ انداز میں، لیکن بہت سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے متعلق کلیم صاحب کے مذکورہ اقتباس کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

> ''کیسی حسین و پاکیزہ نظم ہے! یہاں ارتقائے خیال ہے، اشعار میں ربط و تسلسل ہے، خیالات میں ابتدا، عروج اور پھر انتہا بھی ہے۔ یہ صحیح معنوں میں نظم ہے۔ غزل نے نظم کا بھیس نہیں بدلا ہے، خیالات میں بلندی اور گہرائی نہ سہی، جذبات میں ظاہری جوش و خروش اور لفظوں اور بندوں میں شان و شوکت نہ سہی لیکن یہاں خیالات میں تخیل کا رنگ ہے۔ طرزِ ادا سادہ اور پاکیزہ ہے۔''[1]

کلیم الدین احمد نے اس نظم کے ابتدائی دو بندوں کے متعلق لکھا ہے کہ اقبال اپنی بات، بالواسطہ یعنی طویل استعارے کی مدد سے کہتے ہیں، جس سے اقبال کی شخصیت پس پردہ رہتی ہے اور اس نظم میں شاعر نے سورج اور اس کی شعاعوں کو کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے سورج کی مستقل مزاجی کو آتش کے اس شعر کے ذریعے بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے:

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

پہلے بند میں سورج اور شعاعوں کے مابین مکالمات کی وضاحت ہے اور تجزیے کے دوسرے حصے میں دوسرے بند یعنی شعاعوں کا جواب ہے۔ آخر میں کلیم الدین احمد نے اس نظم کی فنی ہنرمندی اور براہِ راست پیام و خطابت سے پرہیز کرنے کو اقبال اور اس نظم کی خوبی قرار دیا ہے اور جن نظموں میں اقبال نے تبلیغ و پیامبری کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کی ہے اس پر طنز کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ یہ نظم خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام کے نثری خطیبانہ انداز سے بہت دور ہے۔ کلیم الدین احمد نے نظم کے اس مختصر جائزے

۱۔ اقبال: ایک مطالعہ۔ کلیم الدین احمد، کریسنٹ کوآپریٹو پبلشنگ سوسائٹی، گیا، جولائی ۱۹۷۹ء، ص: ۳۱۷

میں اقبال کے پیغام کی وضاحت کے بجائے نظم کی تشریح وتوضیح پر اکتفا کیا ہے۔ چوں کہ یہ جائزہ بہت مختصر ہے اس لیے اس سے نظم کی معنویت پوری طرح واضح نہیں ہو پاتی۔ اسی جائزے میں حسبِ دستور بعض جگہ ان کا لہجہ طنزیہ ہو جاتا ہے مثلاً دوسرے بند میں 'مثالِ نگہ حور' کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''کرن تو آپ نے دیکھی ہے، لیکن نگہ حور نہیں دیکھی ہے جو جوہرِ سیماب کی طرح آرام سے فارغ ہے۔''[1]

پروفیسر سید محمد ہاشم کا شمار بھی اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اقبال کی متعدد نظموں کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ شعاعِ امید کے مطالعے میں موصوف نے اس نظم کے فکری وفنی دونوں پہلوؤں پر واضح روشنی ڈالی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے ضربِ کلیم کی اہمیت وافادیت کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں اس شعری مجموعے کے امتیازات واضح کیے ہیں۔ ان کے مطابق اس مجموعے میں فن کے مقابلے میں فکر کا غلبہ ہے اور یہاں اقبال کا فن، فکر میں ڈھل گیا ہے۔ اس نظم کے سلسلے میں ہاشم صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اس میں عمومی طور پر ہندوستانیوں کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو ان کا شان دار ماضی یاد دلا کر اسی کے مطابق محنتِ مسلسل اور عملِ پیہم کرنے اور خوابِ غفلت سے جاگنے کا سبق دیا ہے۔''[2]

ہاشم صاحب کہتے ہیں کہ یہ ڈرامائی تکنیک میں لکھی ہوئی نظم ہے۔ انھوں نے نظم کی ہیئت کی بھی وضاحت کی ہے۔ ابتدائی دو بندوں میں زمانے کے اور دنیا کے بے عمل انسانوں کی پسپائی کا تذکرہ کیا ہے۔ تیسرے بند کو وہ تخلیقِ نظم کا اصل سبب اور حرکت وعمل کی بہترین مثال قرار دیتے ہیں۔ نظم کے آخری شعر یعنی:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

۱۔ اقبال: ایک مطالعہ، کلیم الدین احمد، ص: ۳۱۹

۲۔ اقبال: فکر وفن۔ سید محمد ہاشم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۹ء، ص: ۲۴۶

کو نظم کا اصل مقصد بتاتے ہوئے انھوں نے اقبال کی فن کارانہ عظمت کی بھی مدلل وضاحت کی ہے۔ آخری بند کے متعلق ہاشم صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اس میں ہندوستان کے شان دار ماضی اور یہاں کی علمی فضا کا بہت بلند الفاظ اور مبالغہ آمیز لہجے میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ تجزیے کے اختتام میں تجزیہ نگار نے اقبال کی استعاراتی زبان واسلوب اور نظم میں پیش کردہ ہنرمندیوں کی بھی تحسین کی ہے اور اس نظم کے تجزیوں میں زیرِ نظر تجزیہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعاعِ امید کا شمار اگرچہ اقبال کی مختصر نظموں میں ہوتا ہے لیکن فکری اور معنوی اعتبار سے اسے اقبال کی بہت سی نظموں پر بہر حال فوقیت حاصل ہے اور اسی سے اقبال کے فکر وفن کے بہت سے تاریک گوشے منور ہوتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری، نظم 'شعاعِ امید' کو اقبال کے مجموعۂ ضربِ کلیم کے عنوان 'اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف' کے برعکس قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ''یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبال نے ایک بنیادی استعارے کی مدد سے ایک خالص موضوعی تجربے کے ابلاغ کی کوشش کی ہے۔'' اسلوب صاحب اقبال کے تمثیلی انداز کو مولانا روم اور جرمن فلسفی لیبنیز (Leibniz) کے مشابہ قرار دیتے ہوئے بانگِ درا کی نظم 'شعاعِ آفتاب' کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

صبح جب میری نگہ سودائی نظارہ تھی
آسمان پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی

اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ ان دونوں نظموں میں اقبال نے 'شعاع' یعنی 'کرن' کے لیے آوارہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دوسرے بند کے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس کے اشعار میں اجالا، سیہ پوش، زیست اور موت کی دو متضاد کیفیات کا بیان ہے۔ موصوف اس نظم میں اقبال کے خیالات کو نظم 'لینن خدا کے حضور میں' میں پیش کیے گئے خیالات کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے یوروپین تہذیب کا بھی ذکر کیا ہے۔ بقول اسلوب صاحب: ''اقبال نے اس نظم کے ذریعے مشرق ومغرب کے تفاوت وتصادم کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔'' چوں کہ اس نظم میں سورج اور کرن علامتی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، اس لیے اسلوب صاحب شعاع کو 'سراپا اضطراب' قرار دیتے ہیں۔

آخری بند میں 'شوخ کرن' کے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ یہ شاعر یعنی اقبال ہی کی مضطرب اور آتش زیر پا فطرت کا ایک شعری رمز ہے، اور خاک سے مراد خاک پاکِ ہند ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ ''اس بند میں اقبال نے سرزمین ہند کے چپّے چپّے سے جس والہانہ دلچسپی اور شیفتگی کا اظہار کیا ہے وہ ان کی حب الوطنی اور وسیع المشربی پر محکم دلیل ہے۔'' اسلوب صاحب اس نظم کی خاصیت اقبال کے جذبۂ حب الوطنی کو قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے نظم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں 'انتشار'، دوسرا 'ترخیم' اور تیسرے میں پھر 'انتشار' کی طرف مراجعت ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ یہ نظم اقبال کے تصورِ مغرب و مشرق کے متعلق ذہنی خلفشار کو بھی واضح کرتی ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ ''یہ نظم اقبال کے اس خواب کا تمثیلی اظہار ہے جو وہ ہندوستان کے لیے خیر و برکت کا دور وجود میں آنے کے سلسلے میں اپنی زندگی میں ہی شب و روز دیکھتے رہے۔'' یہ نظم ان کے نزدیک رمزی اظہاریت اور بیان کی شاعری ہے۔

محمد افروز عالم نے 'شعاعِ امید' کی توضیح ناقدانہ انداز میں کی ہے۔ تجزیے میں انھوں نے شعری لب و لہجہ اختیار کیا ہے:

> ''یہ (نظم) تصورات کو تصویروں میں ڈھالتی ہے۔ اس کا متن برف کی مانند ہے جو پگھلنے پر موج سیلاب بن کر روے زمین کے نشیب و فراز میں پھیل جاتی ہے۔ شعاعِ امید بہ یک وقت طول و عرض اور بلندی و پستی کی سیر کراتی ہے۔''[1]

محمد افروز عالم نے نظم کی ہیئت پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ لفظ 'سورج' کی معنویت کو بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نظم کی وضاحت بند در بند کی ہے۔ آخری بند میں 'شوخ کرن' کے سلسلے میں ابوالکلام آزاد کی 'چڑیا چڑے کی کہانی' میں شامل ایک پرندے کی جرأت مندانہ پیش قدمی کو بیان کیا ہے اور وہ اس 'شوخ کرن' کو اسی پرندے کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ کرن کے پختہ عزائم کے سلسلے میں Feminist Movement کا تذکرہ کیا ہے۔ محمد افروز عالم کہتے ہیں کہ اس نظم میں پیغامِ حرکت و عمل کو مرکزیت حاصل ہے۔ شعاع اور سورج دونوں استعاراتی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ انھوں نے حرکی و بصری پیکروں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ نظم کی ڈرامائی کیفیت کو بھی بیان کیا ہے۔

۱۔ بحوالہ نظموں کے تجزیے (مجموعۂ مقالات)۔ ترتیب قاضی افضال حسین، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء، ص: ۹۹

آل احمد سرور نے اپنی کتاب 'دانش ور اقبال' میں 'ہمالہ سے شعاعِ امید' تک کے عنوان سے اقبال کی دو اہم نظموں کا انتخاب کیا ہے جس میں انھوں نے نظم 'ہمالہ' اور 'شعاعِ امید' کے مابین اقبال کے ذہنی ارتباط پر روشنی ڈالی ہے۔ نظم کی ابتدا میں وہ کہتے ہیں کہ:

''مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ اور ذوق وشوق میں براہِ راست اظہار ہے۔ شعاعِ امید میں بالواسطہ اظہار ملتا ہے۔ نظم کی صناعی اقبال کے فن کی پختگی کو ظاہر کرتی ہے اور ان کی فکر کی برگزیدگی اور آفاقیت کو بھی یہاں شاعر سامنے نہیں آتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، نظم کے کرداروں کے ذریعہ سے کہتا ہے۔ ایک طویل استعارے کے ذریعہ سے کہتا ہے۔''[1]

سرور صاحب نے شعاعِ امید کو استعاراتی نظم قرار دیا ہے جس میں شاعر بالواسطہ اظہارِ خیال نہیں کرتا بلکہ نظم کے کرداروں کے ذریعے سے کہتا ہے، چوں کہ نظم تین بندوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ پہلے حصے میں سورج اور شعاعوں کے مابین مکالماتی گفتگو کو اپنے عالمانہ انداز میں واضح کیا ہے۔ دوسرے حصے میں سرور صاحب نے شعاعوں کے جواب کی وضاحت کی ہے۔ اس حصے میں سرور صاحب نے شعاعوں کے ذریعے اقبال کے تصورِ مغرب اور مشرق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اگرچہ اقبال، مغرب اور مشرق دونوں کا مثبت تصور رکھتے ہیں، اس لیے سرور صاحب اپنے تجزیے میں کہتے ہیں کہ مغرب میں صنعتی سرگرمیوں کی وجہ سے ہمیشہ دھواں پھیلا رہتا ہے اس لیے وہاں دن میں بھی رات محسوس ہوتی ہے، جب کہ مشرق میں نہ علمی سرگرمی ہے اور نہ ذہنی بیداری۔ اس ضمن میں سرور صاحب نے اقبال کے ان دونوں تصورات یعنی مشرق و مغرب کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ سرور صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ ابتدائی دونوں بندوں میں شاعر کا لہجہ دھیما اور انداز بیانیہ ہے، اس کے بعد یعنی آخری بند میں جذبے میں شدت اور آواز میں گونج محسوس ہوتی ہے۔ چوں کہ یہی اس نظم کا اصل حصہ ہے، اس لیے شاعر نے اسے زیادہ پُرزور انداز میں بیان کیا ہے اور شوخ کرن کو 'نگہ حور' کی مانند قرار دیا ہے۔ کرن کی مصوری سے سرور صاحب نے اقبال کی جمالیاتی کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آخر میں انھوں نے ہندوستانیت کے جذبے کے اظہار کے جواز میں اقبال کی ہم نوائی کی ہے اور اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

۱۔ دانش ور اقبال۔ آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۴ء، ص: ۲۶۰

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرور صاحب نے اس نظم کا باقاعدہ تجزیہ کرنے کے بجائے اس کی معنویت اور اس میں پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے اگرچہ ان کا یہ جائزہ بہت مختصر لیکن اس نظم کے متعلق اقبال کے فکر و فن کو اجاگر کرنے میں رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے مکالماتی انداز پر گفتگو کرتے ہوئے خود بھی نظم کے آخری تین اشعار سے متعلق استفہام کی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ یہ اشعار شاعر کی زبان سے ہیں یا کرن کی؟ اس بیانیہ میں سرور صاحب نے 'ہمالہ' جو کہ اقبال کے ابتدائی کلام کا حصہ ہے اور شعاعِ امید جو کہ آخری دور میں لکھی گئی دونوں میں فکری ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

○○○

جبریل وابلیس

جبریل وابلیس اقبال کی مکالماتی نظموں میں انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ پوری ڈرامائی نظم ہے جو مکالمے سے شروع ہوتی ہے، اسی سے ارتقا ہوتا ہے اور یہ مکالمے پر ہی ختم بھی ہوتی ہے۔ ابلیس، اقبال کے یہاں ایک علامتی پیکر ہے جو کہ کسی قدر گوئٹے اور ملٹن کے شیطان سے مماثلت رکھتا ہے۔ اپنے شعری مجموعے 'جاوید نامہ' میں اقبال نے ابلیس کو 'خواجہ اہلِ فراق' کے لقب سے یاد کیا ہے اور اپنے فلسفۂ جہد وعمل کی وضاحت میں اس کردار سے بہت کام لیا ہے۔

نظم کی ڈرامائی کیفیت نے اس میں ایک خاص قسم کی کشش پیدا کردی ہے۔ اگرچہ نظم کی پرِ پرواز تخیلات سے منسلک ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو کہیں نہ کہیں یہ ذہنی حقیقتوں سے بھی وابستہ رہتی ہے اس لیے یہ قاری پر دیرپا اثر مرتب کرتی ہے۔ عام مذہبی تصورات کے مطابق ابلیس کو محض شر کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے جس کا کام انسان کو راہِ راست سے بھٹکا کر گناہ اور بدی کے راستوں پر ڈالنا ہے۔ اقبال اس کی بنیادی شرانگیزی اور اس کے تخریبی عمل سے باخبر بھی ہیں اور اس کے مخالف بھی، مگر اس کی جرأت، جدوجہد اور قوتِ عمل کے مداح بھی ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ابلیس کی اس خصوصیت کے پیشِ نظر اسے حرکت وعمل کا نمائندہ قرار دیا ہے اور اسے مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ اقبال کے تصورِ ابلیس پر غور کرتے ہوئے محمد منصور عالم بھی ابلیس کی قوتِ عمل کے نظریے سے متفق ومتاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''ابلیس اگر یہ کہتا ہے کہ انسانوں میں آگے بڑھنے کا حوصلہ اسی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اسی نے ان کو Ambitious بنایا ہے، تو غلط کیا کہتا ہے؟ وہ انکار کرکے آدم کا مقابل نہ بنتا تو ابن آدم کی فاعلانہ صلاحیتیں نہ اُبھرتیں۔ رزم حق وباطل میں بندۂ مولا صفات جو فولادی قوت دکھاتا ہے، وہ شیطان کی قوتِ فعلیت کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔''[1]

جبریل وابلیس کو مختلف تجزیہ نگاروں نے مختلف انداز سے فن کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ فروغ اقبال۔ محمد منصور عالم، ممتاز احمد پرنٹ آرٹس، بودھ گیا، بہار، جنوری ۲۰۰۸ء، ص: ۲۲۵

وارث علوی اردو کے ممتاز نقاد ہیں، ان کا مطالعہ بہت وسیع، تنقیدی معیار بہت بلند اور اسلوب بیان بہت واضح و پُرکشش ہے۔ اس نظم کے مطالعے میں انھوں نے مفکرانہ لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کی نظم 'جبریل وابلیس' کی مثال عالمی ادب میں مشکل سے ملے گی۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ''اگرچہ ابلیس کا تصور مغربی ادب میں گوئٹے، ورلن اور برنارڈ شا وغیرہ نے استعمال کیا، لیکن اقبال نے جو کچھ ابلیس کے متعلق اس نظم میں کہا ہے وہ اس سے کہیں گہرا ہے۔'' وارث علوی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے نکات کو واضح کرنے کے لیے مشرق ومغرب کی حدوں کا اس طرح ادغام کرتے ہیں کہ اس میں کسی غیر فطری صورت واقعہ کی تشکیل نہیں ہو پاتی اور یہ ایک بڑا اہم کام ہے۔

وارث علوی نے اقبال کی نظم 'جبریل وابلیس' کو گوئٹے، ورلن اور برنارڈ شا کے اسی نوع کے ڈراموں اور تخلیقات سے افضل بتایا ہے اور نظم کے ڈکشن کو تلمیحی لفظیات اور استعارات پر مشتمل قرار دیا ہے۔ ابلیسی سرشت کے رمزیہ بیان کی وضاحت میں انھوں نے ۱۶۴۲ء کے 'شاہ انگلستان' کے خلاف 'کرام ویل' کی بغاوت اور شکست کو بیان کیا ہے اور ملٹن کی نظم 'فردوس گم گشتہ' کا حوالہ دیتے ہوئے ابلیس کے کردار کو مفصل بیان کیا ہے۔ وارث علوی نے صدیوں پر پھیلے ہوئے اساطیر، عظیم مذاہب کے عقائد، اسرارِ کائنات اور رموزِ حیات کو انتہائی بصیرت سے یک جا کر دیا ہے۔ وارث علوی نے استعارات میں تلمیحی اشاریت کے بارے میں وضاحت اور دلائل سے اپنی بات پیش کی ہے مثلاً کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر مرا سبو، میرے فتنے جامۂ عقل وخرد کا تار و پو، قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو وغیرہ۔ نظم کے متعلق علوی صاحب نے یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''پوری نظم فلسفے سے معمور ہے لیکن تجریدی فکر کا کہیں شائبہ نہیں، جو بھی تفکر ہے کلیدی مذہبی اشاروں کے بطن میں ہے جو ہمارے تہذیبی حافظے کا جزو ہیں، اس لیے خیال محسوس تجربے میں ڈھل کر آتا ہے۔ استعارے تزئینِ کلام کے ساتھ ساتھ اظہارِ خیال کا کام بھی کرتے ہیں اور چوں کہ خیال واقعے میں اور واقعہ اسطور میں نصب

ہوتا ہے تو پیچ در پیچ معنی کے دائرے دور تک پھیلنے کے باوجود الجھاؤ اشکال اور
ناترسیلی کا شکار نہیں ہوتے۔''[1]

پروفیسر نورالحسن نقوی اپنی کتاب 'اقبال: شاعر و مفکر' میں جبریل و ابلیس کے تجزیاتی مطالعے میں کہتے ہیں کہ ''جبریل و ابلیس کے درمیان یہ ایک ایسا مکالمہ ہے، جس کے ذریعے شاعر نے فلسفۂ عشق اور فلسفۂ جہد و عمل کو بہت کامیابی کے ساتھ اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

تجزیے کی ابتدا میں نقوی صاحب نے جبریل اور ابلیس دونوں شخصیتوں کا مختصراً تعارف کرایا ہے۔ ابلیس کی خصوصیات کا بھی بہ طورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔ شعری محاسن کا عنوان قائم کر کے نظم کی ڈرامائی کیفیت کا بیان ہے:

''یہ نظم مکمل مگر بے حد مختصر ڈراما ہے جس میں شاعر اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں
کرتا، سب کرداروں کی زبان سے کہلایا جاتا ہے۔''[2]

نقوی صاحب نے لفظیات و فقروں کے مجازی معنی کی وضاحت رمز و کنایہ کے عنوان کے تحت کر دی ہے، مثلاً کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟ نقوی صاحب کہتے ہیں کہ یہاں چاک، دامن اور رفو حقیقی معنی کے بجائے کنایتاً استعمال ہوئے ہیں۔ نقوی صاحب کا اندازِ بیان سادہ اور سلیس ہے۔

پروفیسر سید محمد ہاشم صاحب نے اپنی کتاب 'اقبال: فکر و فن' میں اقبال کی دیگر طویل نظموں کے علاوہ 'جبریل و ابلیس' جیسی مختصر مکالماتی نظم کا بھی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ہاشم صاحب نے اس نظم اور مجموعۂ کلام 'بالِ جبریل' کے عنوانات میں یکسانیت کو اقبال کی فنی پختگی اور ارتباطِ ذہنی کی دلیل بتایا ہے۔ اس نظم کی تمام خوبیوں کے اظہار کے باوجود انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اقبال کے فارسی مجموعوں یعنی پیامِ مشرق اور جاوید نامہ میں پیش کی گئی شخصیت مکالمۂ جبریل و ابلیس کے مقابلے میں زیادہ توانا،

۱۔ بورژوازی۔ بورژوازی۔ وارث علوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۹ء، ص: ۱۲۷

۲۔ اقبال: شاعر و مفکر۔ نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۹۷

طاقت ور اور مؤثر ہے۔ اس نظم کی وضاحت میں موصوف نے اقبال کی ایک دوسری نظم 'تسخیر فطرت' کا تذکرہ کرتے ہوئے دونوں نظموں میں یکسانیت و مماثلت بھی تلاش کی ہے۔ اسی طرح موصوف نے ان کی فارسی نظم 'اغوائے آدم' سے استفادہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 'جبریل و ابلیس' کا کچھ حصہ 'اغوائے آدم' اور تسخیر فطرت کے انکارِ ابلیس سے ماخوذ ہے۔ ہاشم صاحب نے حضرت جبریل علیہ السلام کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ابلیس کے انکارِ سجدہ اور راندہ درگاہ کیے جانے کے احوال کو بھی تاریخی حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جبریل و ابلیس دونوں کی گفتگو سے ان کی سطح و معیار، ان کی فکر و مزاج اور بالخصوص ابلیس کی بے باکی اور اس کے عزائم کا مدلل طریقے سے بیان کیا ہے اور نظم میں موجود شعری محاسن کے ضمن میں کنایوں، تلمیحی اشاروں، استعاروں، سمعی و بصری پیکر اور فارسی ترکیبوں کی بھی نشان دہی کی ہے مثلاً مشتِ خاک، ذوقِ نمو، جامۂ عقل و خرد کا تار و پو وغیرہ، چوں کہ نظم میں ابلیس کے کردار کو بھی حرکت و عمل کی علامت کے طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ اس کے متعلق ہاشم صاحب نے یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''زندگی سوز و ساز بہ سکونِ دوام' محض ابلیس کا عمل نہیں بلکہ اقبال کی نگاہ انتخاب کا کرشمہ ہے جنھوں نے حرکت و عمل اور قوت کی علامت کے طور پر ابلیس کو منتخب کیا۔ اس کے اندر کائنات میں پھیلنے اور اسے مسخر کرنے کا ذوق و جذبہ موجود ہے جو دراصل انسان کی خصوصیت تھی، اس لیے وہ (اقبال) انسان کو بار بار وہی پُرسوز و پُردرد زندگی یاد دلاتے ہیں تاکہ وہ دیگر قوتوں کو مسخر کر سکے۔''[1]

بہر حال ہاشم صاحب کے تجزیے سے ایک طرف اقبال کی فنی ہنرمندیوں کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری جانب اقبال کا پیغام حرکت و عمل بھی مزید واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

○○○

۱۔ اقبال: فکر و فن۔ سید محمد ہاشم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۳۹

باب چہارم

''اقبال کی اہم اردو اور فارسی غزلوں کے تجزیوں کا تنقیدی مطالعہ''

☆ اردو غزلوں کے تجزیے

☆ فارسی غزلوں کے تجزیے

علامہ اقبال نے اپنے افکار ونظریات کو نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی بہت حسن وخوبی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے دوسرے شعرا کی طرح اپنی شاعری کا آغاز غزل ہی سے کیا تھا۔ اس زمانے میں غزل میں داغؔ، امیرؔ، حالیؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی کی شاعری کا چرچا عام تھا۔ ابتدائی دور میں غزل کے لیے اقبال نے بھی وہی روایتی اسلوب اختیار کیا جو نوجوان شعرا کا عام مزاج ہوتا تھا۔ انھوں نے داغؔ کو اپنا استاد بنایا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ انہی کے طرز پر مشقِ سخن کرنے لگے، لیکن اقبال ایک اُبھرتے ہوئے مفکر تھے اور داغؔ کا مزاج ان سے یکسر مختلف تھا اس لیے وہ بہت دن تک داغؔ کی پیروی نہ کر سکے اور جلد ہی ان اثرات کو چھوڑ کر اپنے اصل رنگِ سخن کی طرف مائل ہوئے۔ اسی لیے ان کے ابتدائی دور کی غزلوں میں داغؔ کے اثرات کے علاوہ تصوف اور دیگر فلسفیانہ مضامین بھی نظر آنے لگے۔ البتہ داغؔ کے اسلوب اور لہجہ کا اثر ان سے زندگی بھر نہ چھوٹ سکا، یہ امر بھی مسلّم ہے کہ داغؔ کی استادی کا اعتراف انھوں نے بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے اور ان کے انتقال کے بعد مرثیۂ داغؔ لکھ کر ان کی شاگردی کا حق ادا کیا۔

اقبال نے اپنی غزل کے توسط سے اردو شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا۔ جو اسالیب اور موضوعات اپنی شاعری اور غزل میں اقبال نے استعمال کیے وہ ان سے پہلے کی اردو شاعری میں بہت کم نظر آتے ہیں اور بعد کے شعرا نے ان میں سے بہت سی چیزیں اقبال ہی سے لی ہیں۔ یوسف حسین خاں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''اقبال کی غزل کی خصوصیت اس کا جوشِ بیان اور رمزیت ہے۔ اس کے الفاظ میں بلا کی ایمائی قوت پوشیدہ ہے وہ حسنِ ادا کے جادو سے انسانی ذہن کو مسحور کر دیتا ہے.....
> اقبال کے تغزل میں رمز و کنایہ بے جان نہیں ہوتے۔ وہ ان کے ذریعے نئے نئے مضمون بڑی خوبی سے پیدا کرتا اور سامع کی بھولی بسری یادوں کو تازہ کر دیتا ہے۔ اس کے یہاں پرانے لفظ نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔ زلف، گیسو، مے وخانہ، شعاع وشبنم

اور شمع و پروانہ.....اقبال نے انہی لفظوں میں اپنے نفسِ گرم سے نئی جان ڈال دی۔
اس کے یہاں یہی لفظ حرکت اور عمل کا صور پھونکتے ہیں۔''[1]

علامہ اقبال غزل میں استعاروں اور کنایوں کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے لہٰذا انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری کے لیے ایسے استعاروں اور کنایوں کا انتخاب کیا ہے جو ان کے تصورات اور ان کی گہری فکر سے معنوی مناسبت رکھتے ہیں۔ بقول آل احمد سرور:

''ان کی غزل کا آہنگ شیریں بھی ہے اور رقصاں بھی، تلمیحات، تراکیب، استعارات، تشبیہات کی کثرت کے باوجود ہیرے کی طرح ترشے ہوئے خیال اور فن پر بھرپور قدرت کی وجہ سے ان کی غزلوں کے الفاظ میں زبان پر وہ فتح اور اقلیم معنی پر وہ اقتدار ملتا ہے جو بڑی شاعری کی پہچان ہے۔ اقبال کی غزلوں کا زندگی کے مختلف موقعوں پر مسلسل استعمال ان کی غزل کی زبان کی خوبی کی وہ بین دلیل ہے جس کے بعد کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں۔''[2]

اقبال نئی تراکیب و تشبیہات کے علاوہ محاکات و تلمیحات سے بھی بہت کام لیتے ہیں۔ محاکات کے لیے جس بلندیٔ تخیل کی ضرورت ہے اس سے وہ بدرجۂ اتم بہرہ ور ہیں اور جس خوبی سے باطنی واردات کو خارجی پیکر عطا کرتے ہیں اس سے محاکات کا پورا پورا حق ادا ہو جاتا ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری:

''غزل کی شاعری میں محاکات، اشاروں اور علامات کو مفہوم کی خارجی تجسیم کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ بعض اوقات تنہا ایک ہی علامت یا بنیادی استعارہ اس سلسلے میں شاعر کی معاونت کرتا ہے، کبھی ایک سے زیادہ اشاروں اور محاکات کی تخلیق کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان کے مابین ایک طرح کا تامل اور باہمی رشتہ پایا جاتا ہے اور یہ سب مل جل کر ایک طرح کا Contextual Frame Work مہیا کرتے ہیں۔''[3]

۱۔ روحِ اقبال۔ یوسف حسین خاں، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص:۱۱۱

۲۔ دانشور اقبال۔ آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء، ص:۲۳۹

۳۔ غزل تنقید (حصہ اوّل)۔ اسلوب احمد انصاری (افتتاحیہ)، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، نومبر ۲۰۰۲ء، ص:۲۲

اقبال کی غزل کا ایک انفرادی لب ولہجہ اور رنگ وآہنگ ہے جس کی اردو غزل میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنے فلسفیانہ افکار وتصورات کو غزل کی عظیم روایات کے سہارے اسی خوبی سے نمایاں کیا ہے کہ خود غزل کو ایک نیا اسلوب، ایک نیا رنگ ڈھنگ اور ایک نیا لب ولہجہ میسر آ گیا ہے۔ اسلوب صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ان کے یہاں حافظؔ اور رومیؔ دونوں کی روحوں کا سنجوگ ملتا ہے اور غالبؔ ہی کی طرح ان پر بیدلؔ کے سایے بھی منڈلاتے رہتے ہیں اور عصریت کا وہ شعور بھی جس سے کوئی ممتاز اور حساس شاعر بے نیاز اور مستغنی نہیں رہ سکتا۔''[1]

انھوں نے روایتی ہیئت میں رہتے ہوئے اردو غزل کو انقلابی رجحان عطا کیا۔ بانگِ درا کی متعدد غزلیں اور بالِ جبریل کی تقریباً نصف حصہ غزلیں ایسی ہیں جن میں ان کے افکار ونظریات کی پیش کش کے ساتھ ساتھ زبان، طرزِ اظہار اور فنی ہنرمندیوں کے سبب ان کی تشریح وتجزیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں کی طرح غزلوں کے تجزیے بھی خاصی تعداد میں ہوئے ہیں اور بہت سے نقادوں، اقبال شناسوں اور تجزیہ نگاروں نے ان کی متعدد غزلوں کے تجزیے کیے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے جس طرح نظموں کے تجزیے کیے ہیں، اسی طرح غزلوں کو بھی تجزیاتی عمل سے گزارا ہے۔ ابتدا میں یہ تجزیے ان کے رسالے ''نقد ونظر'' میں شائع ہوتے تھے بعد میں انھوں نے ان تمام تجزیوں کو اپنی کتاب 'غزل تنقید' میں شامل کر دیا۔ یہ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی۔ حصہ اوّل میں ولیؔ، سراجؔ، سوداؔ، دردؔ، میرؔ، آتشؔ اور دیگر شعرا کی غزلوں کے تجزیے اور حصہ دوم میں اقبال کی غزلیات ہیں جن کا تجزیاتی مطالعہ اسلوب صاحب کے ساتھ ساتھ دیگر ناقدین نے بھی کیا ہے۔

اپنی کتاب 'غزل تنقید' کے پہلے حصہ میں اسلوب صاحب نے اوّلاً چند صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں غزل کے فن، عہد بہ عہد اس کے ارتقا اور غزل گو شعرا کے محاسنِ شعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ حصہ دوم کی ابتدا میں بھی اسلوب صاحب نے پیش لفظ شامل کیا ہے جس میں انھوں نے اقبال کی غزلوں سے متعلق مختصراً اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے بعد ان کی غزلوں کے تجزیے شامل کیے ہیں،

۱۔ غزل تنقید (حصہ اوّل)۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۲۹

جن میں ابتدائی دس تجزیے خود اسلوب صاحب کے ہیں۔اس کے بعد تین تجزیے زیڈ.اے.عثمانی صاحب کے، تین تجزیے سید وقار حسین صاحب کے، ایک تجزیہ قاضی افضال حسین صاحب کا، ایک انور صدیقی اور آخری تجزیہ اقبال احمد انصاری نے پیش کیا ہے۔اس لحاظ سے ان تجزیوں کی تعداد اُنیس تک پہنچتی ہے جس میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کی چند غزلوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اقبال کی فارسی غزلیات کے تجزیوں کو اردو غزلوں کے بعد شامل کیا جائے گا۔بانگِ درا کی تیسری اردو غزل کا تجزیاتی مطالعہ اسلوب صاحب نے اس طرح کیا ہے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانۂ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

جیسا کہ معلوم ہے بانگِ درا اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے جو اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء، رموزِ بے خودی ۱۹۱۷ء اور پیامِ مشرق ۱۹۲۳ء تینوں فارسی مجموعوں کے بعد ۱۹۲۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کی مقبولیت کا بڑا سبب یہ ہے کہ اقبال نے اسے اردو زبان میں پیش کیا اور اس میں وہ نظمیں اور غزلیں شامل کیں جو پہلے ہی سے ملک میں عام اور مشہور ہو چکی تھیں۔ اس مجموعے میں وہ نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جو اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں اور جس پر داغؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی جیسے شعرا کا رنگ واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
(بانگِ درا)

اس میں ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جن پر تصوف کا رنگ غالب ہے اور وہ فکر و فلسفہ کے لحاظ سے بھی اہم ہیں۔ اسلوب صاحب غزل تنقید حصہ اوّل کے افتتاحیہ میں اس غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''پیامِ مشرق کے بعد اور 'بالِ جبریل' اور 'زبورِ عجم' کی غزلوں سے بہت پہلے یہ غزل انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور اس کا حتمی ثبوت ہے کہ مفاہیم شعری اور لسانی وسائل کس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہو کر اور ایک دوسرے کو سہارا دے کر شاعری کا جادو جگا سکتے ہیں۔''[۱]

اقبال نے اپنی بیشتر غزلوں کے لیے مترنم بحروں، دل کش پیرایۂ بیان اور عمدہ قافیوں اور ردیفوں کا انتخاب کیا۔ یہ غزل بھی لمبی بحر میں لکھی ہوئی ہے، اس غزل کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے بہت عمدہ غزلیں کہی ہیں۔ اس میں تصوف کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی ہے۔ غزل کے تجزیے کی

۱۔ غزل تنقید (حصہ اوّل)۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۲۲

ابتدا میں اسلوب صاحب نے اس عام خیال کو رد کیا ہے کہ ''اقبال غزل کے مقابلے میں بڑے نظم گو شاعر ہیں۔'' جیسا کہ عام خیال ہے کہ غزل میں دقیق موضوعات کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن اقبال نے اس خیال کو مسترد کیا ہے اور اپنی غزلوں میں بھی ان افکار و خیالات کو پیش کیا ہے جو ان کی نظموں کا خاصہ ہیں۔ اسلوب صاحب نے غزل کے موضوع یا خیال پر تبصرہ کیا ہے۔ اقبال نے اس میں خدا سے التجا کی ہے، اور اپنے مختلف افکار کو پیش کیا ہے۔ اسلوب صاحب نے غزل میں استعمال کردہ الفاظ اور ان کی معنویت کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ مثلاً کبھی، ہزاروں سجدے، تڑپ، جبینِ نیاز، خروش، نوا، حقیقتِ منتظر، سرود، پردۂ ساز وغیرہ۔ تجزیہ نگار نے تیسرے شعر کو کلیدی حیثیت کا حامل قرار دیا ہے اور اس شعر میں ابہام کی بھی نشان دہی کی ہے۔ شعر کی مزید توضیح میں ابنِ عربی کے متصوفانہ نظام اور تصدیق کے لیے قرآن کریم کی 'سورہ نور' کی ایک آیت پیش کی ہے۔ اسی شعر کی وضاحت کے لیے اسلوب صاحب نے مسلم مفکر صوفی عبدالکریم الجیلی کی اہم ترکیب ''افتراقِ خود'' ملٹن اور دوسرے مغربی مفکرین کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ غزل کے چوتھے شعر کے متعلق تجزیہ نگار نے 'شمع و پروانہ' کے روایتی امتیاز و تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے اور شعر میں شامل ترکیب، حکایتِ سوز اور 'حدیثِ گداز' کو دو موضوعی کوششیں کہا ہے۔ پانچویں شعر میں 'اماں ملی' کی تکرار کو جھنکار کہہ کر اسلوب صاحب نے اس کی نغمگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے پہلے مصرعے میں استفہام اور دوسرے مصرعے کو اس کا جواب قرار دیا ہے اور اس کے بعد گناہ اور عفو کے معنوی رمز سے بحث کرتے ہوئے تجزیہ نگار نے غزنوی اور ایاز کی اپنی مخصوص اور وسیع المفاہم تلمیحات کی بھی وضاحت کی ہے۔

اسلوب صاحب نے غزل کا خاص وصف اس کی نغمگی، ترنم اور صوتی آہنگ کو قرار دیا ہے اور ابتدائی تین اشعار میں اقبال کے جذباتی اضطراب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ نوا، سرود اور پردۂ ساز میں مناسبت لفظی کی بھی وضاحت کی ہے۔ غزل کے آخری شعر یعنی مقطع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسلوب صاحب نے 'ذوق و شوق' کے اس شعر کو بطور نمونہ پیش کیا ہے:

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

تجزیے کے آخر میں اسلوب صاحب غزل کے مرکزی تاثر کی نشان دہی اس طرح کرتے ہیں:

''اس غزل کا مرکزی تاثر یا موتف حقیقت اور مجاز یا لامحدود اور محدود کے مابین رشتۂ اتصال کی نوعیت ہے۔''[1]

اسلوب صاحب نے غزل کا موضوع ایک متصوفانہ تجربہ کو قرار دیا۔ ہے۔ پوری غزل کے معنی و مفاہیم کو تجزیہ نگار نے بہت وضاحت سے بیان کر دیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے مغربی مفکرین کے خیالات ونظریات کا بھی حوالہ دیا ہے اور مغربی اصطلاحات کو بھی حسبِ ضرورت بخوبی برتا ہے۔

☆☆☆

۱۔ غزل تنقید (حصہ دوم)۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۴۷۴

غزل:۲

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ برہانی
ہے دانش برہانی، حیرت کی فراوانی

اس پیکرِ خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری
میرے لیے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے، آدم کی یہ ارزانی

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے تقدیر کا زندانی

تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

یہ غزل اقبال کے شعری مجموعہ بالِ جبریل میں شامل ہے۔ اس کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان کے اردو کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جو بانگِ درا (۱۹۲۴ء) کے بعد ۱۹۳۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ بالِ جبریل میں شاعر نے خودی، عشق، مردِ مومن، فقر و استغنا، حرکت و عمل، زندگی اور زمان و مکان وغیرہ تصورات بڑی عمدگی سے پیش کیے ہیں۔ اس مجموعے میں غزلوں کے علاوہ نظمیں اور قطعات و رباعیات بھی

شامل ہیں۔اس میں اقبال کے موضوعات بلاشبہ بہت پختہ و بلند ہیں۔ بالِ جبریل میں اقبال کا اسلوب اور اندازِ بیان بڑا فکر انگیز اور مؤثر ہے۔اس مجموعے میں شامل کلام میں جگہ جگہ رمزیت وایمائیت ہے اور سوز وگداز بھی۔ اس مجموعے کی غزلوں میں جدت طرازی بھی ہے۔اس میں بہت بلند اور پاکیزہ مضامین اور اعلیٰ رومانی حقائق پیش کیے گئے ہیں۔رنگ وآہنگ کے لحاظ سے بالِ جبریل کی اثر پذیری جاوید نامہ سے کم نہیں ہے۔

مندرجہ بالا غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔فکری اعتبار سے یہ غزل بھی فلسفیانہ عناصر سے معمور ہے۔ اسلوب صاحب نے موضوعات کے تعین کے سلسلے میں اقبال کو فارسی، روسی، برطانوی و رومانوی شعرا کے مثل قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اقبال نے عقل وخرد اور اس کے بالمقابل عشق اور وجدان جیسے موضوعات کو مختلف سیاق وسباق میں استعمال کیا ہے۔غزل کے پہلے شعر میں تجزیہ نگار نے لہجے کی سنجیدگی کی طرف توجہ دلائی ہے اور متضاد الفاظ کی نشان دہی کی ہے۔ اپنے تنقیدی رویے کے مطابق اسلوب صاحب نے اس غزل میں بھی فرانسیسی سائنس داں اور ریاضی داں Henri Poincare کی فکر سے استفادہ کیا ہے۔جنھوں نے آئنس ٹائن کے تاریخ ساز حیرتِ زا نظریۂ اضافیت کے لیے قیاسی اور تجرباتی مساعی کے ذریعے زمین ہموار کی۔ لفظ 'برہان' کے متعلق کہتے ہیں کہ اقبال کے یہاں اس اصطلاح کا استعمال سترہویں صدی کے برطانیہ کے مابعدالطبیعاتی شاعر اینڈریو مارول کی مشہور نظم 'The Difinition of Love' میں مستعمل جیومیٹری کی اصطلاحات کے مماثل ہے۔اس کے متعلق ٹی.ایس.ایلیٹ کی رائے کہ ''شاعر کی قوتِ متخیلہ ایک امتزاجی قوت ہے'' بھی درج ہے۔ پہلے شعر میں مستعمل الفاظ مثلاً برہانی، اور 'نورانی' کی وضاحت میں اسلوب صاحب نے 'بالِ جبریل' اور 'جاوید نامہ' سے اشعار پیش کیے ہیں۔موصوف نے 'دانشِ برہانی' کا تعلق عقل اور ذہن سے اور 'دانشِ نورانی' کو قلب اور قرآنی اصطلاح میں 'فواد' سے ملایا ہے۔

اسلوب صاحب نے دوسرے شعر میں لفظ 'شے' سے مراد 'نفس' یا 'روح' لیا ہے اور اپنی بات کی دلیل میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت پیش کی ہے۔اسی ضمن میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال انسانی شخصیت کے وجود کے لیے تین عناصر کو بنیادی قرار دیتے ہیں:

(۱)جسم (۲)قلب (۳)روح۔

تیسرے شعر کے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے میں 'غزل خوانی' سے مراد ہے 'قوتِ گویائی' یعنی تاب سخن وری۔ اور پہلے مصرعے میں 'فغاں' سے مراد ہے استفہام کا تند و تلخ لہجہ۔ اس شعر کو اسلوب صاحب طنزیہ قرار دیتے ہیں۔ اس میں تجزیہ نگار نے اقبال کی جرأتِ گفتار کی طرف اشارہ کیا ہے اور لہجے کی شوخی اور طنز کے لحاظ سے اس میں نظم 'شکوہ' کی مشابہت تلاش کی ہے۔ چوتھے شعر میں شاعر کا انداز استفہامیہ ہے۔ پانچویں شعر کی وضاحت میں اسلوب صاحب نے مسلم مفکرین 'الکندی' اور 'الفارابی' جو معتزلہ کے سرخیل تھے اور جنھوں نے ''عقلیت اور یونانی فلسفے کی روشنی میں اسلام کی تفسیر کرنا چاہی تھی''[1] کے عقائد کو پیش کیا ہے۔

چھٹے شعر میں انھوں نے اقبال کے مسئلہ تقدیر کی وضاحت کی ہے۔ ساتویں شعر میں اسلوب صاحب نے 'صنم اور صنم خانے' کو کلیدی الفاظ کہا ہے۔ پیکر نگاری کے لحاظ سے آخری شعر کو مسجدِ قرطبہ کے اس شعر سے مشابہ بتایا ہے:

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات! کارِ جہاں بے ثبات

اسلوب صاحب نے زیرِ تجزیہ غزل میں تین عناصر کو نمایاں بتایا ہے: (۱) صوتی گونج (۲) استفہامیہ انداز (۳) طنزیہ عنصر کی کارفرمائی۔

دوسرے تجزیوں کی طرح مذکورہ غزل کے تجزیے میں بھی اسلوب صاحب نے مغربی اساتذۂ فن سے استفادہ کیا ہے۔ دانشِ برہانی کی وضاحت میں ازمنہ وسطیٰ کے مسلم سائنس داں 'الحسن ابن الہیثم' تک پہنچتے ہیں۔

لفظ برہان کا تعلق 'کتاب البرہان' جس کو حکیم ارسطو کی Posterior Analytics کا ترجمہ کہا جاتا ہے، اس سے ملایا ہے اور اس کی مثال مولانا رومی کی 'مثنوی معنوی' سے دی ہے۔ اپنی بات کو مدلل بنانے کے لیے اسلوب صاحب نے مغربی مفکرین کے ساتھ ساتھ قرآنی دلائل سے بھی مدد لی ہے۔ بسا اوقات غالب کی شاعری کو بھی بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

۱۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۰۰

غزل:۳

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرّہ شہید کبریائی
بے ذوق نمودِ زندگی، موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت
پربت ضعفِ خودی سے رائی
تارے آوارہ و کم آمیز
تقدیرِ وجود ہے جدائی
یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند
بے راز و نیازِ آشنائی
تیری قندیل ہے ترا دل
تو آپ ہے اپنی روشنائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی
ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی

اسلوب احمد انصاری نے زیرِ نظر غزل بھی بالِ جبریل سے منتخب کی ہے۔

مذکورہ غزل میں اشعار کی تعداد آٹھ ہے۔ پوری غزل میں تواتر سے اقبال نے خودی کی اہمیت وعظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ باور کرایا ہے کہ خودی ہی مومن کا ہتھیار ہے۔ اس میں شاعری کے ساتھ ساتھ فلسفے کی چاشنی بھی موجود ہے۔ اس خیال کو اقبال نے اپنی متعدد نظموں میں پیش کیا ہے اور مختلف انداز سے اس کی عقدہ کشائی کی ہے۔ اس غزل میں شاعر نے اس فلسفہ کی طرف بھی توجہ

دلائی ہے کہ دشواریوں کو سر کر کے آگے بڑھنے کا نام ہی زندگی ہے اور یہ تبھی ہوسکتا ہے جب انسان کی خودی اس پر آشکارا ہو جائے۔

اس غزل کے تجزیے میں اسلوب صاحب نے پہلے شعر کو بنیاد قرار دیا ہے، چوں کہ اس میں ایک ہی خیال کو شاعر نے مختلف طریقے سے ادا کیا ہے۔ اس کو اسلوب صاحب نے Thought Process یعنی خیال کا پیچ در پیچ ارتکاز کہا ہے اور اپنے خیال کی مزید وضاحت کے لیے جرمن صوفی فلسفی Jacob Boehme جس نے تضاد یعنی Contrariety کے اصول کی اوّلیت پر اصرار کیا، اس کی فکر کو مستعار لیا ہے۔ اسلوب صاحب نے اپنے تجزیے میں معنی کی مختلف جہتوں اور تہوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ذرّہ، خودنمائی، شہید اور محو وغیرہ۔ لفظ ذرّہ کا استعمال یونانی فلسفیوں اور زمانۂ قدیم کے ایرانی صوفی مشرب شاعروں نے 'وجود' کے لیے کیا ہے۔ دوسرے شعر میں 'ذوقِ نمود' کو پہلے شعر کے 'خودنمائی' کا متبادل قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ شروع کے دونوں اشعار کے مضمون کو اقبال کی نظم 'محاورہ مابین خدا و انسان' پیامِ مشرق کے خیال اور انگریزی رومانی نقاد اور شاعر کولرج کے بعض خیالات کے مماثل کہا ہے۔

اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ غزل کے تیسرے شعر میں اقبال کا اصل مقصد سادگی کے ساتھ تعمیرِ خودی کے بنیادی عمل کی طرف اشارہ کرنا ہے اس میں 'پربت' اور 'رائی' دو متضاد الفاظ ہیں۔ اس شعر کو اسلوب صاحب نے 'خیر' اور 'شر' کی دو متضاد قوتوں کے حوالے سے بیان کیا ہے اور یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ پہاڑ یعنی دیکھنے میں بہت بلند چیز، اپنے اندر کی طاقت (خودی) کے سبب ہی مضبوط و مستحکم رہ سکتی ہے اور اگر اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا جائے تو کچھ عرصے میں ٹوٹ پھوٹ کر دھول مٹی (رائی) جیسی بے حقیقت چیز رہ جائے گا۔ چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے:

ع ''تقدیرِ وجود ہے جدائی''

کو اسلوب صاحب نے کلیدی حیثیت کا حامل بتایا ہے۔ 'ستاروں کی آوارگی' اور کم آمیزی اور پچھلے پہر کے زرد رو چاند کو موجودہ دور کے تنہا انسان کے المیہ سے ملایا ہے۔ چھٹے شعر کے ذریعے اسلوب صاحب نے انسان کو اس کے حقوق کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کو مختلف طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ساتویں شعر کے مضمون کو نظم 'لالۂ صحرا' کے اس شعر کے معنی سے ملاتے ہیں:

تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا

اک جذبۂ پیدائی، اک لذت یکتائی

اسلوب صاحب اس غزل کو اقبال کی ان نظموں کے مماثل قرار دیتے ہیں جن میں وجود کی حقیقت پر غور کیا گیا ہے۔ اس غزل میں تصوف کے عناصر بھی بہ کثرت موجود ہیں اور اسلوب صاحب نے اس کا بہت گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیا ہے۔ نیز مختلف علما کے افکار کے ذریعے اسے بہتر طور پر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسلوب صاحب نے ایک ایک شعر کی عمدگی سے وضاحت کی ہے۔ انھوں نے غزل کی بہتر تفہیم کے لیے اپنے تجزیوں میں متنی اور محاسن شعری نیز اقبال کے افکارِ عالیہ کی وضاحت کے لیے مختلف اساتذۂ فن کے افکار و خیالات کو دلائل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس غزل میں اقبال نے اپنی مخصوص فکر کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اقبال کی غزل گوئی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''اقبال کی غزلوں میں وہ باتیں نہیں ملتیں جو اردو غزل میں بہت مقبول تھیں۔ مثلاً رشک و رقابت، فراق و وصال، جسم و جمال کا ذکر، صنائع و بدائع اور زبان و بیان کی نمائش جن کے بغیر غزل، غزل نہیں سمجھی جاتی تھی..... اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعرا کی نہ زبان رکھی، نہ موضوع، نہ لہجہ، بلکہ ایسی زبان، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے ایسا کوئی رشتہ نہ تھا۔''[1]

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے اپنی اس غزل کے ذریعے جو پیغام دیا وہ دوسرے شعرا کے یہاں نظر نہیں آتا ہے اور تجزیہ نگار نے غزل کے تمام نکات کو بہتر طریقے سے سمجھایا ہے اور اس کے معنوی رموز کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

۱۔ خطباتِ رشید احمد صدیقی۔ مرتبین مہر الٰہی ندیم، لطیف الزماں خاں، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۵۴

غزل:۴

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

مندرجہ بالا غزل اقبال کے شعری مجموعہ بالِ جبریل کی بہت مشہور و مقبول غزل ہے۔ اس میں شاعر نے ایک بنیادی خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پوری غزل میں سات اشعار ہیں اور سب میں ایک ہی خیال اور جذبے کو بیان کیا گیا ہے۔ شاعر نے اس میں بتایا ہے کہ انسان کی زندگی مسلسل حرکت و عمل سے عبارت ہے، محض ایک جگہ رُک کر بیٹھ جانا عقل مندی نہیں ہے۔ یوں تو وحدتِ تاثر نظم نگاری کے ساتھ

مخصوص ہے لیکن اس کے امکانات اس غزل میں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ غزل کے ہر ہر شعر میں اقبال نے اپنی بلندیٔ فکر سے کام لیا ہے۔ اس میں انھوں نے فلسفۂ حرکت وعمل کو بہت سادہ ومقبول زبان اور موثر اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اسلوب صاحب نے دوسری غزلوں کی طرح اس کا تجزیہ بھی پوری فنی پختگی و چابک دستی سے کیا ہے اور سلیس وسادہ غزل پر بہت عالمانہ انداز میں اپنی تنقیدی گفتگو کی ہے۔ تجزیے کی ابتدا میں ہی اسلوب صاحب نے بالِ جبریل اور زبورِ عجم کی غزلوں کو شاعری کی روایت سے گریز کی مثال کہا ہے، کیوں کہ بالِ جبریل کی غزلوں میں روایتی حسن وعشق کے مضامین نظم نہیں ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے اسلوب صاحب اقبال کو برطانوی شاعر ورڈز ورتھ کے مثل بتاتے ہیں اور وجہ مماثلت یہ بیان کرتے ہیں کہ اقبال اور ورڈز ورتھ دونوں کے یہاں جنس کا گزر نہیں ہے اور عشق، جس سے جنس یا جنسی مسائل وابستہ ہوتے ہیں وہ اقبال کے یہاں وسیع ترین معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جذبۂ عشق کی مثال میں انھوں نے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ عشقیہ اشعار کے استعمال میں اسلوب صاحب، اقبال کو حافظؔ، میرؔ اور غالبؔ سے منفرد وممتاز خیال کرتے ہیں، انھوں نے اقبال کی عشقیہ شاعری پر بھی طویل گفتگو کی ہے۔ ستاروں کی گردش کی وضاحت میں 'علم فلکیات' کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیوٹن، آئنسٹائن، برطانوی شاعر ولیم بلیک کے خیالات کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ تجزیے میں ان کے فکر وفن کے حوالے بھی موجود ہیں۔ آخر میں اسلوب صاحب نے 'ستاروں کی گردش' کو روزِ قیامت سے ملایا ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے قیامت کی نشانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی ضمن میں روزِ محشر سے متعلق قرآنی آیات، سورج، چاند، ستاروں کی گردش اور کائنات کے فنا ہونے کے اسباب وعوامل کی بھی وضاحت کی ہے۔

دوسرا شعر:

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

میں اسلوب صاحب نے ان سیاروں کی طرف اشارہ کیا ہے جن پر زندگی کے آثار نہیں آتے:

''۷۰ء مین آئن سٹائن کے بعد اس صدی کے سب سے بڑے سائنس داں اسٹیفن ہاکنگ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مکاں یعنی Space میں ایسے تاریک نقطے یعنی

Black Holes موجود ہیں جن سے کسی بھی شے حتیٰ کہ روشنی کا بھی اخراج نہیں ہوتا۔ان نقطوں کو Black Voids بھی کہا گیا ہے۔"[1]

تیسرے شعر سے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس میں انسانی فکر کو اقبال نے انتہائی بلندی اور ترقی پر لے جانے کی کوشش کی ہے اور آگے بڑھتے رہنے کی طرف اُکسایا ہے۔'شاہین' اقبال کا پسندیدہ استعارہ ہے۔اسلوب صاحب شاہین کو مردِ مومن کا رمز قرار دے کر اس کے ذریعے مستقل آگے بڑھتے رہنے اور ترقی کرنے کا سبق سکھاتے ہیں۔ چھٹے شعر کو اسلوب صاحب تیسرے شعر کی نظریاتی یا معنویاتی تکرار کہتے ہیں اور آخری شعر کو اقبال کا خیالی تصور بتاتے ہیں۔

اس غزل میں ایک جوش ہے، ایک روانی ہے اور ایک گہری شعریت ہے۔اگر چہ اس غزل میں نظم کا سا انداز زیادہ ہے، لیکن یہ اقبال کا خاص انداز ہے کہ جو بات وہ اپنی طویل نظموں میں کہتے ہیں وہی وہ غزل کے چند اشعار کے ذریعے کہہ جاتے ہیں۔ کائنات کے کل مطالعے کو Cosmology کہا جاتا ہے۔اسلوب صاحب نے اسے زیرِ تجزیہ غزل کا مرکز و محور بنایا ہے۔

غزل کی وضاحت میں انھوں نے مختلف سائنس دانوں کے نظریات کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ بحث اگر چہ معلومات افزا ہے لیکن کچھ غیر ضروری محسوس ہوتی ہے، اس بحث سے ان کی علمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اسلوب صاحب کے یہاں علمِ قرآن سے استفادہ بھی کثرت سے موجود ہے۔محاسنِ شعری اور تلمیحی اشعار کو بھی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

۱۔ غزل تنقید۔اسلوب احمد انصاری، ص:۵۱۸

غزل:۵

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

یا سنجر و طغرل کا آئین جہانگیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ

یا حیرت فارابی، یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ، یا جذبِ کلیمانہ

یا عقل کی روباہی، یا عشق یداللّٰہی
یا حیلۂ افرنگی، یا حملۂ ترکانہ

یا شرع مسلمانی، یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو کہ بت خانہ

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا ہے جرأتِ رندانہ

مذکورہ غزل بھی مجموعۂ بالِ جبریل میں شامل ہے، یہ چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس غزل کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان، اشرف المخلوقات اور 'خلیفۃ اللہ فی الارض' کی کامیابی کا دارومدار ہے، مقصدِ حیات کا تعین یعنی جب تک وہ اپنی زندگی کا مقصد طے کر کے اس کے مطابق عمل نہیں کرے گا وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی بات کو اقبال نے مختلف طریقوں سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شاعر نے اپنی کوئی بات زبردستی منوانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ قاری کو اختیار دیا ہے کہ وہ کسی بھی راہ کو منتخب کرلے۔

غزل کے تجزیہ نگار جناب اسلوب احمد انصاری نے تجزیے میں 'گوہرِ یک دانہ' سے مراد خودی کے شعور کو لیا ہے اور بتایا ہے کہ خودی کے لیے عشق ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتا ہے جو خودی کی تندی و تیزی کو برقرار رکھتا ہے۔ اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ شاعر نے اوّلین شعر کے بعد چاروں اشعار میں بہ ظاہر ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو ایک دوسرے کا تضاد پیش کرتے ہیں۔ مثلاً سنجر و طغرل اور مردِ قلندر، حیرتِ فارابی اور تاب و تبِ رومی، عقل اور عشق، کعبہ اور بت خانہ وغیرہ۔ 'عشق یداللّٰہی' سے اسلوب صاحب نے 'مسجدِ قرطبہ' کے اس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے:

'ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ'

اقبال نے سنجر و طغرل جو کہ مشہور بادشاہ گزرے ہیں اور ان کے بالمقابل مردِ قلندر کو پیش کیا ہے اور تائید کے لیے نظم 'ذوق و شوق' کے اس شعر کا بھی حوالہ دیا ہے:

شوکت سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید، تیرا جمال بے نقاب

اسلوب صاحب نے مسلم فلسفی 'فارابی' اور 'رومی' کو خبر اور نظر کے استعارے کہا ہے۔ اس کو انھوں نے بالِ جبریل کے اس شعر سے واضح کیا ہے:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اسلوب صاحب نے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں یک رنگی سے مراد جذب کرنے کا عمل بتایا ہے اور شعر میں آزادی کا مطلب 'اختیار کی آزادی' کہا ہے۔ اسلوب صاحب نے اقبال کے نظریۂ عقل و عشق پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں کے تفاوت پر بھی مدلل اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے غزل کے لہجے کو خطیبانہ اور پُر تمکنت قرار دیتے ہوئے بانگِ درا کی بعض پُر جوش نظموں کے آہنگ اور لہجے کے مماثل قرار دیا ہے اور اس کی تائید میں اپنے استاد خواجہ منظور حسین کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

''آواز کے شکوہ اور گونج میں اقبال کا کلام اس غزل کا جواب نہیں رکھتا۔''[1]

۱۔ غزل تنقید (حصہ دوم)۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۳۰ (مشمولہ اقبال اور دوسرے شعرا، ص: ۲۰۹)

اسلوب صاحب نے غزل کے تجزیے میں کافی اختصار سے کام لیا ہے۔ استعاراتی بیان کی وضاحت کے ساتھ ساتھ متضاد الفاظ اور ان کی معنویت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ غزل کے بعض اشعار کو سمجھانے کے لیے حسبِ دستور علامہ اقبال کے دوسرے اشعار کو بھی بہ طور نمونہ پیش کیا ہے۔ شعر میں موجود تلمیح کو بھی صراحت سے بیان کیا ہے۔ عقل و عشق کے مابین فرق وارتفاع کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جب عقل میں خودشناسی اور خودنگری پیدا ہوجاتی ہے، تو وہ اپنی متعینہ حدود اور پابندیوں سے متجاوز ہوکر عشق کے مرتبے کو پہنچ جاتی ہے اور عشق اگر اس عنصر سے خالی ہوجائے، تو اس کے بے خطا اور بے محابا اور قائم بالذات ہونے کی صلاحیت میں اضمحلال اور نقص پیدا ہوجاتا ہے۔''[1]

اسلوب صاحب نے تجزیے کے آخر میں غزل کے صوتی آہنگ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

۱۔ غزل تنقید (حصہ دوم)۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۲۹

غزل:٦

دریا میں موتی، اے موجِ بے باک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نم ناک

تیرا زمانہ، تاثیر تیری
ناداں! نہیں یہ تاثیر افلاک

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک

کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منتِ تاک

رکھتا ہے اب تک مے خانۂ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک

اہلِ نظر ہیں یورپ سے نومید
ان اُمتوں کے باطن نہیں پاک

مذکورہ غزل مجموعۂ 'ضربِ کلیم' سے ماخوذ ہے۔ ضربِ کلیم، بالِ جبریل کی اشاعت کے ایک سال کے بعد ۱۹۳۶ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس مجموعے میں اقبال نے تمام عالمی مسائل پر بہت سنجیدگی سے غور و خوض کیا ہے، اور اسلام کی حقانیت و عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کے اصول و ارکان تمام اقوامِ عالم کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ اس میں انھوں نے

اسلام مخالف قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔اسی لیے اس کا نام 'ضربِ کلیم' رکھا۔اس مجموعے میں فن اور شعریت پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور حقائق و معارف کی پیش کش کو ترجیح دی گئی ہے۔اسی لیے اس میں فکر و خیال کی بلندی اور پختگی نظر آتی ہے۔ضربِ کلیم کی وجہ تسمیہ کے متعلق پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا ضربِ کلیم، نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ علامہ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کتاب میں جو اشعار ہیں یا بالفاظ صحیح ان اشعار میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، وہ عصرِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کرنے میں ضربِ کلیم کا اثر رکھتے ہیں اور علامہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان خیالات پر عامل ہو کر اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس کی بدولت وہ دورِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کر سکیں۔''[1]

ضربِ کلیم کو اقبال نے ذیلی عنوانات کے تحت چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے جو اس طرح ہیں:

اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات اور فنونِ لطیفہ، سیاسیات مشرق و مغرب اور محراب گل افغاں کے افکار وغیرہ۔ان عنوانات سے موضوعات کی وسعت اور پیچیدگی دونوں ہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ضربِ کلیم میں غزلیں صرف پانچ ہیں: دو غزلیں 'اسلام اور مسلمان' کے ذیل میں ہیں اور دو 'تعلیم و تربیت' کے ذیل میں اور ایک یعنی زیرِ نظر غزل، ادبیات، فنونِ لطیفہ کے زمرے میں آتی ہے۔

ضربِ کلیم چوں کہ علامہ اقبال کا پختہ عمر اور تقریباً آخری زمانے کا کلام ہے، لہٰذا اس میں علامہ کی فکر بھی اپنے معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔اس مجموعے کی ایک خوبی اس کا اختصار ہے۔

زیرِ نظر غزل، 'ادبیات و فنونِ لطیفہ' کے زمرے میں آتی ہے۔اقبال نے اپنے افکار عالیہ کی پیش کش کے لیے بہ ظاہر ہلکے پھلکے الفاظ اور مظاہرِ قدرت و مناظرِ فطرت سے متعلق تشبیہات و استعارات اور رعایات کا سہارا لیا ہے، لیکن ان الفاظ کے توسط سے بڑی بلیغ باتیں کہہ دی ہیں۔

تجزیے کی ابتدا میں اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس غزل میں: ''فنی ارتکاز، قطعیت اور تقلیل الفاظ کا قرینہ اور سلیقہ موجود ہے۔''[2]

۱۔ غزل تنقید۔اسلوب احمد انصاری، ص:۷۳

۲۔ ایضاً۔ص:۵۳۲

اسلوب صاحب نے تجزیے میں اقبال کے جن خیالات کی وضاحت کی ہے وہ تفکر اور تخیل سے لبریز ہیں۔ دریا کی گہرائی اور اس میں پوشیدہ خزانوں کے مقابلے میں ساحل پر موجود چیزوں کو خس و خاشاک سے، صاحبِ خود کے قلب کو بجلی کی طاقت و تابانی کا حامل اور خودی سے محروم شخص کو محض خالی میدان سے تشبیہ دی ہے۔ اسلوب صاحب نے اقبال کی نظموں مثلاً 'شعاعِ امید' اور 'لا الہ الا اللہ' کو اس مجموعے کے ترفع اور بلوغت کا غماز کہا ہے۔ اسلوب صاحب بتاتے ہیں کہ جوش ملیح آبادی بھی فراق گورکھ پوری کی طرح احساسِ کمتری کا شکار ہیں جنھوں نے ضربِ کلیم کی شاعری کو چٹکلے والی شاعری کہا ہے۔ ان دونوں کے برخلاف اسلوب صاحب عبدالماجد دریابادی کے خیال سے اتفاق کرتے ہیں جنھوں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ ''ضربِ کلیم کا وصفِ امتیازی حکیمانہ ژرف نگاہی ہے۔''[1]

اسلوب صاحب نے ضربِ کلیم کی تمام غزلوں کو کفایتِ لفظی سے معمور کہا ہے اور مذکورہ غزل کو بھی کفایتِ لفظی کا شاہکار کہا ہے۔ غزل کے پہلے شعر کو اسلوب صاحب نے فکر انگیز اور قطعیتِ لفظی کا حامل قرار دیتے ہوئے اس میں لفظی مناسبت کی بھی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً دریا، موتی، ساحل اور خار و خس و خاشاک وغیرہ۔

غزل کے دوسرے شعر کو اسلوب صاحب نے پہلے شعر کی توسیع کہا ہے، چوں کہ تیسرے شعر میں پیش کردہ خیال نیا ہے اس لیے اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے مصرعے سے ایک بالواسطہ ربط و تعلقِ معنوی کا اظہار سامنے آتا ہے اور اس شعر سے شاعر کی مراد یہ ہے کہ انسان اپنی شخصیت اور اپنی کائنات کا خود خالق ہے۔

اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس شعر میں شاعر نے تصورِ خودی کو پیش کیا ہے اور خودی اقبال کی شاعری میں استعمال کیا جانے والا ایک اہم شعری محرک ہے۔ دوسرے مصرعے:

''ناداں! نہیں یہ تاثیر افلاک''

کے متعلق کہتے ہیں کہ اس میں تقدیر پرستی، رجعت پسندانہ میلان اور ضعفِ یقین کی تکذیب کی گئی ہے۔ اسلوب صاحب نے چوتھے شعر کو تیسرے شعر کی توسیع کہا ہے۔ اس شعر میں مستعمل 'جنوں' کو تجزیہ نگار نے

۱۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۳۳ (مشمولہ، اقبالیاتِ ماجد، ص: ۳۵)

عقل وخرد کے متضاد بتایا ہے۔ ''تقدیر کے چاک'' کی صراحت، اسلوب صاحب نے غیبی طاقتوں اور مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی، مشرقی قوموں کی روایت اور ضعیف الاعتقادی سے کی ہے۔ اس شعر میں پیش کیے گئے خیال کو اسلوب صاحب نے بانگِ درا کی نظم کے مندرجہ ذیل شعر کے مشابہ کہا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

''تقدیر پرستی'' کی ایک دوسری مثال اسلوب صاحب نے بالِ جبریل کی نظم 'زمانہ' سے دی ہے۔ پانچویں شعر کو چوتھے شعر سے منسلک کرتے ہوئے اسلوب صاحب 'رندی' اور 'جنوں' میں یک گو مماثلت کی طرف ذہن کو منتقل کرتے ہیں۔ 'رند' اور 'رندی' کی علامات کو حافظ شیرازی کے کلام میں مستعمل علامات سے ملایا ہے اور ان الفاظ کی معنویت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں 'نعرۂ اناالحق' کی بھی وضاحت کی ہے۔ مے اور مے خانہ میں مناسبتِ لفظی کو بتایا ہے۔ اسلوب صاحب نے اس شعر کے مرادی معنی کی بھی وضاحت کی ہے۔

آخری شعر کے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس میں اقبال صریح تعصب کو سامنے لائے ہیں اور بتایا ہے کہ اسی خیال اور جذبے کو بعض مغرب کے جدید شعرا اور مفکروں نے بھی پیش کیا ہے۔

مذکورہ غزل کے تجزیے میں اسلوب صاحب نے نہ صرف مجموعہ 'ضربِ کلیم' کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے بلکہ کھل کر فراق گورکھ پوری اور جوش ملیح آبادی کے خیالات کو بھی مسترد کیا ہے۔ غزل کے اشعار کی وضاحت کے دوران انھوں نے اس کے ہر ہر شعر پر مدبّرانہ نظر ڈالی ہے اور اقبال کی فکر کو جامع اور مربوط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزل:۷

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

زیرِ نظر غزل مجموعۂ بالِ جبریل کی ابتدائی غزلیات میں سے ہے۔ یہ غزل مسلسل ہے، اور غنائی شاعری کی عمدہ مثال ہے۔ کسی بھی شاعر کی عظمت کا راز اس کی فکر کی بلندی کے ساتھ ساتھ اس کے پیرایۂ بیان میں بھی مضمر ہوتا ہے۔ اقبال نے سادگی کے ساتھ ساتھ صناعی کے بعض نئے اور اچھوتے طریقے بھی ایجاد کیے ہیں۔ کلام میں حسن اور تاثیر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے مخصوص لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ پوری غزل اندیشہ ہٰے گوناگوں سے لبریز ہے، اس میں اوّل تا آخر جذبۂ عشق کی کارفرمائی ہے۔ غزل کے تجزیہ نگار زیڈ. اے. عثمانی صاحب ہیں۔ انھوں نے ابتدا ہی میں غزل کے شعری تاثر کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے شاعری کی پہلی آواز یعنی غنائی شاعری کے زمرے میں رکھا ہے۔ اس سے ذہن ٹی. ایس. ایلیٹ کے مضمون ''شاعری کی تین آوازیں'' کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

''پہلی آواز تو وہ آواز ہے جس میں شاعر خود سے بات کرتا ہے یا کسی اور سے نہیں کرتا۔ دوسری آواز اس شاعر کی ہے جو سامعین سے مخاطب ہوتا ہے، خواہ سامعین تعداد میں زیادہ ہوں یا کم۔ تیسری آواز اس شاعر کی ہے جب وہ نظم میں باتیں کرنے والے ڈرامائی کردار تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں جب وہ باتیں کرتا ہے تو یہ باتیں وہ نہیں ہوتیں جو وہ خود سے مخاطب ہوتے وقت کرتا، بلکہ صرف وہی کہتا ہے جو ایک خیالی کردار دوسرے خیالی کردار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہہ سکتا ہے۔''[1]

اس غزل میں شاعر اقبال خود سے مخاطب ہے اور اپنے اندیشہ کا اظہار انتہائی متفکرانہ انداز میں کرتا ہے، اس کے ہر شعر سے عشق کی کسی نہ کسی صفت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اقبال نے عشق کا ایک انوکھا اور بہت بلند تصور پیش کیا ہے۔ ان کا عشق زلف و رخسار کے لیے ادھر اُدھر نہیں بھٹکتا بلکہ وہ ایک نئے طرز کا شعور، آگہی اور بصیرت عطا کرتا ہے۔ مثلاً:

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

زیرِ نظر تجزیہ میں عثمانی صاحب نے اقبال کی تنوع آفرینی کو سراہا ہے اور پہلے شعر میں شعری تاثر کا محور دل کو قرار دیا ہے۔ اس کی معنویت پر اس طرح سے روشنی ڈالتے ہیں:

''دل وہ حسیّت وہ آگہی ہے جو طبعی وجود سے ماورا اور موت کے بعد بھی ممکن ہے۔ خاک پریشاں ہونے سے مراد وہ بربادی، انتشار اور موت ہے جو بالآخر انسان کی تقدیر ہے مگر جسے اہلِ دل خود ہی قریب کر لیتے ہیں..... 'دل' کی خاصیت مسلسل ذوق و شوق ہے اور اسی لیے مسلسل جستجو و آرزو و فراق و ناصبوری۔ غرض کہ ساری 'مشکل' دل ہی کے ہونے سے ہے۔''[2]

۱۔ ایلیٹ کے مضامین۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص:۹۶

۲۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص:۵۵۶

کلامِ اقبال کے بہت بڑے حصے میں یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ فکرِ اقبال میں 'دل' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف نظموں اور غزلوں میں انھوں نے دل کو اپنے افکار و خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ بالِ جبریل کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

دوسرے شعر میں 'حور' کے متعلق عثمانی صاحب کہتے ہیں کہ اسے اقبال نے علامتی معنی میں استعمال کیا ہے۔ کلامِ اقبال میں تشبیہات، استعارات اور علامات وغیرہ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ اس شعر میں لفظ 'حور' مثالی مظہرِ حسن کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ حوروں سے متعلق جاوید نامہ میں فارسی نظم 'حور و شاعر' میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے لیکن شاعر اقبال اس کی تمام تر مثالی خوبیوں اور خصوصیات کے اعتراف کے باوجود ایک مظہرِ حسن سے مطمئن ہونے کے بجائے نئے نئے مظاہرِ حسن کی آرزو کرتے رہے ہیں، اسی لیے وہ لامتناہی جذبۂ فراق کے قائل ہیں۔ عثمانی صاحب نے اقبال کے اس تصور کی تائید میں ان کا یہ شعر پیش کیا ہے:

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

تیسرے شعر کے متعلق عثمانی صاحب کہتے ہیں کہ اس میں اقبال نے نفسی زندگی کو حرکی وحدت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں اقبال کے 'جذبۂ خودی' کی کارفرمائی ہے۔ 'خودی' اقبال کے فلسفے کا بنیادی عنصر ہے، انسان کے لیے اپنی ذات و صفات کے احساس کو، یا اس کے اندر پنہاں حرکت و توانائی کو، یا دوسروں کے سہارے جینے کے بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کو، انھوں نے 'خودی' قرار دیا ہے اور خودی، جذبۂ عشق سے فروغ پاتی ہے، جو اس غزل کے چوتھے شعر میں کارفرما ہے۔

عثمانی صاحب نے چوتھے شعر کے پہلے مصرعے کے لہجے کو بلند یعنی High key کہا ہے اور دوسرے مصرعے سے ڈرامائی کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ڈرامائی انداز اقبال کے لب و لہجہ کی امتیازی شناخت ہے جو اُن کی ہر زمانے کی شاعری میں بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

پانچویں شعر کو عثمانی صاحب نے شعری تاثر کے لحاظ سے دوسرے شعر کا اعادہ کہا ہے۔ اس شعر میں تلمیحی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ افسانہ 'دنبالۂ محمل' کہہ کر مجنوں کے اس مشہور واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں وہ لیلیٰ کے پاس قاصد روانہ کرتا ہے اور اس کو تاکید کرتے ہوئے خود بھی لیلیٰ کے کوچے کی جانب چل دیتا ہے۔ اس میں بھی شاعر اقبال نے اسی جانب اشارہ کیا ہے کہ اگر میں اس عالم سے منتقل ہو کر دوسرے جہاں پہنچ بھی جاؤں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میرا سوزِ دروں مجھے وہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔ پانچویں اور آخری شعر میں عثمانی صاحب نے متضاد الفاظ کی نشان دہی کی ہے:

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

معنویت کے اعتبار سے بھی اس شعر میں بہت سے امکانی پہلو مضمر ہیں۔ اس میں حضرت آدمؑ کے حوالے سے شاعر نے عروج و زوال کی داستان بیان کی ہے۔ تاروں کے ٹمٹمانے کو اقبال نے کانپنے سے تعبیر کیا ہے۔ عثمانی صاحب نے اس میں طنزیہ عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس شعر میں انجم بہ طور استعارہ مستعمل ہے اور ٹوٹا ہوا تارا کنایہ ہے، حضرت آدمؑ کا۔ اقبال شوخیِ حسن میں اضافہ اور مقصدیت کی تاثیر کے لیے وقتاً فوقتاً استعارات اور حرکی و بصری پیکروں کا استعمال کرتے تھے۔ نظم 'محبت' میں ستارے سے متعلق یہ شعر درج ہے:

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں سے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں سے

عثمانی صاحب نے حضرت آدمؑ کے جنت سے اخراج کو انسان کے عروج کی داستان سے تعبیر کیا ہے اور 'مہ کامل' کو رسول اکرم ﷺ کے واقعۂ معراج سے مربوط و منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزل:۸

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف

عشقِ بتاں سے ہاتھ اُٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگار دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف

کھول کے کیا بیاں کروں سر مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ 'لاتخف'

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اقبال نے اپنے شعری افکار و خیالات کی پیش کش کے لیے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا۔ مذکورہ غزل کا اگرچہ صرف پہلا مصرعہ ہی فارسی میں ہے لیکن پوری غزل پر فارسیت کا غلبہ ہے۔ بالِ جبریل کی یہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں اقبال نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی

بے بضاعتی اور زبوں حالی کا پُرسوز انداز میں تذکرہ کیا ہے اور ان کی حالتِ زار کا ذمہ داران کے بے عملی کو قرار دیا ہے جس نے انھیں اپنے مقصدِ حیات یعنی اشاعت و تبلیغِ اسلام سے غافل کر دیا ہے۔

مذکورہ غزل کے تجزیہ نگار زیڈ.اے.عثمانی صاحب ہی ہیں، انھوں نے غزل کے قافیے کو موتیوں کی لڑی سے تعبیر کیا ہے اور اس کے لہجے میں موسیقیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبال اپنے افکار خواہ چھوٹی بحر میں پیش کریں یا بڑی اور طویل بحر میں، ان میں ہر جگہ غنائیت اپنی بلندی پر نظر آتی ہے۔ اقبال کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا اور شاعری میں اس سے فائدہ اُٹھانے کا ہنر بھی انھیں بخوبی آتا تھا۔ ان کی مذکورہ خصوصیات سے ہمارے تجزیہ نگار بہت متاثر نظر آتے ہیں اسی لیے زیرِ نظر غزل کے تجزیے کے دوران عروض و آہنگ سے اقبال کی خصوصی دلچسپی کے سلسلے میں عثمانی صاحب نے بہت وضاحت سے اظہارِ خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ کلامِ غالب کی طرح اس میں بھی 'عروضِ کیفی' کی شمولیت ہے، اور انھوں نے پہلے شعر کی آواز کو 'کورسی' آواز کہا ہے، یعنی اس میں لہجہ مدھم ہونے کے بجائے اونچا ہے۔ شعر کے صوتی عناصر کو موصوف نے اس طرح منقسم کیا ہے:

میر-سپاہ۔ ناسزا= لشکریاں شکستہ صف
آہ۔ وہ تیر نیم کش= جس کا نہ ہو کوئی ہدف

دوسرے مصرعے میں 'تیر نیم کش' کے متعلق عثمانی صاحب کہتے ہیں کہ یہ ترکیب اگرچہ غالب کے یہاں رومانی انداز میں بڑے طمطراق سے استعمال ہوئی ہے:

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
وہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

لیکن اقبال نے اپنی فکر کی بلندی و سنجیدگی سے اس ترکیب کے ذریعے معنی میں ارتفاع پیدا کیا ہے۔ چنانچہ غزل کے پہلے شعر میں 'تیر نیم کش' سے مراد ہے، 'کوشش' اور 'ہدف' سے مراد ہے 'مقصد یا نصب العین'۔ اس میں اقبال نے مسلمانوں کی حالتِ زار پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے نصب العین سے غافل ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کا نصب العین جیسا کہ قرآن مجید سے واضح ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام یا اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔'' اقبال اس بات سے فکر مند ہیں کہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام

کے لیے نہ اس وقت پورے ملک میں کوئی نظام قائم تھا نہ اس طرح کی کوئی کوشش اور اس کے قیام کے کہیں آثار نظر آتے ہیں۔

دوسرے شعر میں 'گوہرِ زندگی' کو عثمانی صاحب نے اقبال کی شخصی علامت کہا ہے اور اس شعر میں اقبال کا منشا یہ ہے کہ عشق کے بغیر خودی مستحکم نہیں ہوسکتی اور خودی کے بغیر انسانی وجود غیر اہم ہے۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مسلمانوں میں خودی اپنی انتہائی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوجائے لیکن میرے مطالعے کی روشنی میں اعلیٰ شخصیت کا یہ جوہر مسلمان کے اندر سے پوری طرح نکل چکا ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہورہے ہیں۔

شاعری میں رموز وعلائم کی ہمیشہ ہی اہمیت رہی ہے۔ شاعر مختلف فنی وسیلوں کے ذریعہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ باتیں کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس زاویے سے اگر اقبال کے شعری رویوں اور خود تصورِ شعر پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شاعری میں سپاٹ بیان اختیار نہ کرکے بالواسطہ طرزِ اظہار کو ترجیح دیتے ہیں۔ عثمانی صاحب نے 'موج موج' اور 'صدف صدف' کی تکرار سے تاثر کی شدت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کلامِ اقبال میں جگہ جگہ منظر کشی کے اعلیٰ نمونے بکھرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ چاند، ستارے، موج، دریا اور ابر وغیرہ کا استعمال ان کے یہاں انتہائی ہنرمندی سے ہوتا ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال نے پھر خودی کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے مخاطب کو اس بات کی تائید کی ہے کہ غیر ضروری، مہمل، عارضی اور فانی چیزوں میں صلاحیت ضائع کرنے کے بجائے اپنی خودی کو مضبوط و مستحکم بناؤ۔ اس شعر کے متعلق عثمانی صاحب کا خیال ہے کہ:

> ''یہ سب ایسے ہی اشاروں کی علامتی ادائیگی ہے کہ جس میں صوتِ معنی کے مقداری عناصر کے ساتھ کیفی عناصر اور خصوصاً تاکیدی زور کا خاص رول رہا ہے۔ 'نقش ونگار دہر میں' کے آخر میں آواز گرتی ہے جس کے بعد 'خون جگر' کی ادائیگی میں آواز کچھ گلوگیر ہوجاتی ہے۔ جس سے شاعر کی دل سوزی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا مصرانہ خلوص مزید شدت اختیار کرلیتا ہے۔''[1]

۱۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۷۱

چوتھے شعر میں بھی اقبال نے عشق کی کارفرمائیوں کا تذکرہ کیا ہے۔عثمانی صاحب نے بیان کی توضیح میں ایلیٹ کے نزدیک مرگ اور حیات کی معنویت کو اس طرح سے بتایا ہے:

''وہ حیاتِ بے شرف کو جس میں عشق کا فقدان ہوتا ہے، مرگ کے مرادف قرار دیتے ہیں اور مرگ باشرف یا فنافی العشق کو جسے Death in love کہتے ہیں اس حیاتِ نو کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں جو مسلسل تجدید پذیر ہے۔''[1]

اقبال نے خودی کی تکمیل اور استحکام کے لیے عشق کو ضروری قرار دیا ہے۔اقبال کی شاعری کا یہ اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے عشق کے معنی بدل دیے۔مثلاً:

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

پانچویں شعر میں عثمانی صاحب نے مدھم لہجے کی نشان دہی کی ہے اور 'حکیم' کو عقل جزوی یا محض منطقی عقل کی علامت اور 'کلیم' کو بے باک و بلاخیز و جہد طلب قوتِ خلاقی و مشتاقی کی علامت کہا ہے۔ اقبال کے اس شعر میں تلمیحی اشاریت موجود ہے، پیر رومی کی صحبتوں کا اعتراف اقبال نے متعدد مقامات پر کیا ہے: کہ ان کے مطالعے سے مجھ پر عشق کے رموز کا انکشاف ہوا۔اسی طرح حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے اظہار کے لیے بھی متعدد جگہ تلمیح کو وسیلہ بنایا ہے۔کلامِ اقبال میں جگہ جگہ موسیٰ کے واقعات کے متعدد اشارے ملتے ہیں اور ان واقعات کو جذب وشوق کی ایسی کیفیات میں تبدیل کر دیا گیا ہے کہ ماضی کی ساری شان وشوکت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔اسی طرح حکیم نطشہ سے متعلق ضربِ کلیم میں کہتے ہیں:

حریفِ نکتۂ توحید ہوسکا نہ حکیم
نگاہ چاہیے اسرارِ لا الٰہ کے لیے

چھٹے شعر میں اقبال نے دوبارہ موسیٰ کلیم اللہ کو بہ طور تلمیح پیش کیا ہے کہ اگر آج بھی دنیا میں کوئی موسیٰ صفت انسان پیدا ہو جائے تو خدا کی جانب سے غیبی نصرت اس پر نازل ہوگی۔اس کے لہجے کو

۱۔ غزل تنقید۔اسلوب احمد انصاری، ص:۵۷۳

عثمانی صاحب نے Middle key کہا ہے۔انھوں نے غزل کے معنوی اسرار ورموز کے بجائے صوتی آہنگ پر زیادہ توجہ دی ہے۔ساتویں شعر میں اقبال نے انگریزی سائنس وفلسفہ پر محمدؐ اور حضرت علیؓ کو فوقیت دی ہے۔اقبال کے کلام میں تلمیحات کا سلسلہ اس بات کا شاہد ہے کہ ان کی نظر قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ تاریخ،فلسفۂ سیاست ومعاشیات پر بھی تھی۔

زیڈ.اے.عثمانی صاحب کی اس غزل اور دیگر غزلوں کے تجزیوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے اپنے دقیق اسلوب اور فکر کی سنجیدگی سے اقبال کے اشعار کی شرح کرنے کے بجائے انھیں مزید پیچیدہ بنا دیا ہے اور ان کی شرح بجائے خود مشکل متن بن گئی ہے،جس کی مزید شرح وتشریح کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے یہ تجزیہ نگاری نہیں بلکہ شاعر کی تفہیم کو پیچیدہ تر اور مشکل تر بنانے کی ایک سوچی سمجھی کوشش ہے۔

غزل:۹

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لیے جہاں میں فراغ

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ 'مازاغ'

وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ!

زیرِ مطالعہ غزل، مجموعۂ ضربِ کلیم کی چار منتخب غزلیات میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ضربِ کلیم چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ غزل 'حصۂ تعلیم و تربیت' میں شامل ہے۔ اس میں اقبال نے مغربی تہذیب، خودی کی تربیت، عصرِ حاضر، اساتذۂ دین و تعلیم اور حکیم نطشہ جیسے دیگر اہم موضوعات پر مختصراً نظمیں کہیں ہیں۔ اس غزل میں اقبال نے اپنے مخصوص نظریے یعنی حرکت و عمل کو پیش کیا ہے۔ دراصل اقبال مسلسل عمل کو ہی زندگی کی علامت مانتے تھے، وہ جانتے تھے کہ سکون و جمود موت کی طرف لے جاتے ہیں اور اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں، جو اپنے عمل کے ذریعے زندہ ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ غزل کے دوسرے شعر میں بندۂ حر، مردِ حر، مردِ قلندر اور مردِ آزاد کو حرکت و عمل اور سعی پیہم کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔

یہ تمام صفات مردِ خدا کے اندر ہوتی ہیں۔ اقبال نے مسلمانوں کے اخلاقیات و روایات میں پراگندگی اور بگاڑ کا ذمہ دار بہ ظاہر ترقی یافتہ لیکن بباطن زوال آمادہ تہذیب و تمدن کو ٹھہرایا ہے۔ انھوں نے اپنی بہت سی نظموں اور غزلوں میں مغرب کی خرابیوں کا ذکر کیا ہے۔ نظم 'شعاعِ امید' میں کہتے ہیں:

اک شور ہے، مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا محض عیش و عشرت کی جگہ ہے تم اس میں کھو کر اپنے مقصدِ حیات سے غافل مت ہو جاؤ۔ یہاں کی ظاہری چکا چوند ترقی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہے۔ یہ سب فریبِ نظر ہے اور اس کو پائیداری نصیب نہیں ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ محدودیت انسان کو کور ذوق کر دیتی ہے۔ انسان کو صبا کے مثل ہونا چاہیے جو ہمیشہ سرگرداں رہتی ہے، کیوں کہ زندگی مسلسل سرگرم عمل رہنے کا ہی نام ہے۔

زیرِ مطالعہ غزل کے تجزیہ نگار سید وقار حسین صاحب نے تجزیے کی ابتدا میں غزل میں بہ کثرت مستعمل روشنی کے پیکروں کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً ستارہ، چراغ، چمک اور صبا۔ وقار صاحب نے غزل کے مضمون کو غالبؔ کے دو قطعات کے موضوع سے مشابہ قرار دیا ہے۔ پہلے قطعہ کا مصرعہ ہے:

ع نہ سنو اگر برا کہے کوئی

دوسرے قطعہ کا مصرعہ ہے:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

اور بتایا ہے کہ غالبؔ کے یہاں بعض جگہ اس طرح کے استعارات بہ کثرت مل جاتے ہیں، لیکن غالبؔ کی حیثیت اقبال جیسے مفکر کی نہیں۔ وہ محض شاعر ہیں اور کہیں کہیں فلسفیانہ مضامین بھی خوب نظم کر جاتے ہیں، اس لیے دونوں کے درمیان موضوعات و مضامین میں یکسانیت کے باوجود دونوں کے دائرۂ کار اور تاثر و تاثیر میں بیّن فرق ہے۔ وقار صاحب اقبال کی اس غزل کو زبان کے اعتبار سے سادہ اور معنی کے لحاظ سے بلند خیال کرتے ہیں۔ یہ 'ضربِ کلیم' کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس میں شامل اقبال کا تمام کلام سادگی و اختصار کے ساتھ ساتھ معنوی اعتبار سے بلند پایے کا ہے۔ وقار صاحب نے غزل کے مطلع کو اس کی مقناطیسی

کشش اور غیر معمولی تاثّر پذیری وفنی ہنرمندی کی بنیاد پر اس غزل کے بقیہ تمام اشعار پر فوقیت دی ہے۔ حالاں کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل اور معنوی اعتبار سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ مطلع میں شاعر کا انداز تنبیہ کا سا ہے۔ یعنی تم تبھی فتح یاب ہو سکتے ہو جب تمہاری نگاہ اور بصیرت بلند اور اعلیٰ درجے کی ہوگی:

ولا تهنوا ولا تحزنوا انتم الاعلون ان كنتم مومنين۔[1]

وقار صاحب نے اندھیری شب سے مراد اقبال کے عہد کی گمراہی کو لیا ہے اور مخاطب ان کے معاصرین کو بتایا ہے۔ کلامِ اقبال کے پس منظر کی واقفیت کی بنا پر اس بات کو صد فی صد درست اور اس استعارے کو بہت برمحل کہا جا سکتا ہے، لیکن اس شعر کو اگر تعمیمی انداز میں لیا جائے تو اس سے ہر عہد کی تاریکی اور گمراہی بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ موجودہ دور میں بھی انسان دین وشریعت سے عدم واقفیت کی بنا پر راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے۔ لہٰذا اقبال کا یہ شعر موجودہ عہد کے مسلمانوں پر بھی صادق آتا ہے۔ وقار صاحب نے 'چیتے کی آنکھ' کو روشنی کا استعارہ اور موت کے علامت کہا ہے جس کی وضاحت خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> ''چیتے کی آنکھ کو چراغ کہہ کر اقبال نے استعاراتی معنی کا ایک طلسم پیدا کر دیا ہے اور شعر میں حسنِ صورت اور حسنِ معنی کی دوئی یکسر ختم ہو گئی ہے۔ دوسرا مصرعہ ہم کو چشمِ زدن میں ماقبلِ تہذیب زمانوں کی جھلک دکھلا دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اندھیری رات ایک ازلی اور ابدی مظہر ہے اور اس رات میں انسان سدا سے اپنی منزل کی تلاش میں ہے۔ چیتے کی آنکھ صرف روشنی ہی نہیں موت کی بھی علامت ہے۔ موت زندگی کو راستہ دکھاتی ہے اور انسان کی ہر بڑی سعی موت کے سائے میں بارآور ہوتی ہے۔''[2]

تیسرے شعر کے متعلق وقار صاحب کا خیال ہے کہ اس میں شاعر کا خطاب اپنے عہد اور اپنی قوم سے ہے۔ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ غزل کے شعر کی ایک خوبی عمومیت بھی ہے لہٰذا اس میں بھی شاعر کے مخاطب موجودہ عہد کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس شعر میں مناسبت لفظی پائی جا رہی ہے یعنی 'فروغ' کی

۱۔ قرآن مجید، سورہ آل عمران: ۳، رکوع: ۱۴، آیت ۱۳۹

۲۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۸۴

نسبت سے 'خیرہ' اور نظر کی نسبت سے نگہباں۔ شعر میں لفظ 'مازاغ' قرآن پاک کی سورہ 'النجم' سے ماخوذ ہے، اس شعر کا انداز دعائیہ ہے۔ چوتھے شعر میں صراحت کم ہے لیکن معنوی اعتبار سے مکمل ہے۔ اس شعر میں بھی 'بزمِ عیش' اور 'ایاغ' میں مناسبت ہے اور 'مہمان' اور 'نفس' میں رعایتِ لفظی پائی جارہی ہے۔ اس میں اقبال نے بہت خوب صورتی سے بزمِ عیش، مہمان، ستارہ اور ایاغ کے وسیلے سے باطل عقیدے کی جانب توجہ دلائی ہے کہ یہ محض دکھاوا ہے اور جلد ہی یہ سب کچھ فنا ہونے والا ہے۔ پانچویں یعنی آخری شعر میں صبا کا ذکر ہے جو کہ صبح کی آمد کی دلیل ہے۔ وقار صاحب نے پانچویں شعر کی وضاحت میں کہا ہے کہ 'کورِ ذوق' سے اقبال کی مراد وہ مدرسے یعنی سرکاری کالجوں کے طالب علم ہیں۔ جو تخلیقی شان سے محروم رہے اور جنھیں فطرت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور جن کا سارا علم کتابی ہوتا ہے۔ اس شعر سے اقبال کی گہری مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ فطرت کے مظاہر کے ذریعے لوگوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔

تجزیے کے آخر میں وقار صاحب نے مجموعی غزل پر اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''فطرت سے انسان کی بڑھتی ہوئی لاتعلقی کے تکلیف دہ احساس نے دنیا بھر کے شاعروں کو متاثر کیا ہے۔ اقبال کے ہاں یہ ماتم اور بھی سخت یوں ہو جاتا ہے کہ فطرت سے بے خبری علامتی سطح پر زندگی کے امکانات سے ہے اور اقبال کی شاعری کا بنیادی وظیفہ انسان کو وجود کے بے پایاں امکانات کا احساس دلا کر مائل بہ عمل کرنا ہے۔

ایک طرف وہ بندۂ حُر ہے جو چیتے کی آنکھ کی روشنی میں اپنی تلاش کرتا ہے اور دوسری طرف فروغ مغربیاں سے چوندھیایا ہوا وہ کرمِ کتابی جس کے حواس اتنے بیکار ہو چکے ہیں کہ صبا کی بشارت بھی اس پر اکارت جاتی ہے۔ ان ہی دو متضاد اسالیب حیات کے تقابل نے اس غزل کے اشعار میں مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔''[1]

۱۔ غزل تنقید (حصہ دوم)۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۸۸۔۵۸۹

غزل:۱۰

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دَو

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز
کہ سازگار نہیں یہ جہانِ گندم و جو

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

اس غزل میں اقبال نے سلاست و روانی کے جوہر دکھائے ہیں اور انتہائی سادگی اور مؤثر طریقۂ کار کو اپنے خیالات کی ادائیگی کا وسیلہ بنایا ہے۔ پہلے شعر ہی سے اقبال کا فلسفہ جہد و عمل عیاں ہو جاتا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ مسلسل جدوجہد کے ذریعہ ہی انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اقبال نے خودی و عشق کی بقا کے لیے جہد و عمل کو لازمی جز قرار دیا ہے۔ کلامِ اقبال میں جگہ جگہ اس تصور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے طالب حسین سیال کا بیان ہے:

''اقبال تجدید عمل کا مفکر ہے۔ وہ انسان کو نائب خدا کی حیثیت سے دیکھتا ہے، جس کا وظیفۂ حیات یہ ہے کہ وہ مسلسل عمل کرتا رہے۔ اس دنیا میں مختلف مزاحمتوں اور آزمائشوں کا ہمت اور عزم سے مقابلہ کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتا جائے۔ اپنی

دنیاوی زندگی کو خوب صورت اور پُرامن بنانے اور اپنی کوشش و عمل سے آخرت کی
زندگی کا بھی سامان کر کے بقائے دوام حاصل کرے۔''[1]

غزل کے تجزیہ نگار سید وقار حسین صاحب بالِ جبریل کی دوسری غزلوں کے مقابلے میں اسے ''مختصر، سادہ اور قدرے کم معروف'' خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے پہلے شعر میں مہ نو، سفر، جستجو اور جہدِ مسلسل کی ایک 'علامت' کہا ہے۔ 'ماہِ نو' استعاراتی معنی میں مستعمل ہے جس کا نمایاں وصف حرکت ہے۔ چاند کی خصوصیات بتاتے ہوئے انھوں نے اقبال کی نظم 'چاند اور تارے' میں چاند کے جواب کو اہمیت دی ہے۔ جو کہ اس طرح سے ہے:

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق انتہا حسن

سید صاحب نے چاند کی اس مسلسل کوشش کو 'جہد حیات' کی علامت کہا ہے۔ چاند کی انھیں خصوصیات کے پیش نظر اقبال نے اپنے کلام میں اکثر اسے علامتی معنی میں استعمال کیا ہے۔ بانگِ درا کی نظم ماہِ نو میں کہتے ہیں کہ:

گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تُو
ہے وطن تیرا کدھر، کس دیس کو جاتا ہے تو؟

دوسرے شعر میں وقار صاحب نے نفس، غنچہ اور آفتاب سے کثرتِ تعبیر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ 'غنچہ' اور 'آفتاب' میں پستی اور بلندی کی رعایت کی نشان دہی ہے۔ اس شعر میں اقبال نے 'غنچہ' اور 'آفتاب' کو اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کا وسیلہ بنایا ہے۔ کلامِ اقبال میں متعدد مقامات پر آفتاب کے ایک مخصوص شعری پیکر یا علامت کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ زندگی کے نفسیاتی و لاشعوری پہلوؤں اور رموز کو آشکار کرتا ہے۔ مثلاً بانگِ درا کی نظم آفتاب میں کہتے ہیں:

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو

۱۔ طالب حسین سیال۔ دانش اقبالؒ کے چند پہلو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۱۰

غزل کے دوسرے شعر کو سید صاحب نے قطعیت کے اعتبار سے مطلع سے اہم قرار دیا ہے۔ اقبال مادّی ترقی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس ترقی نے آدمی کو مغالطے میں مبتلا کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ و برتر سمجھتا ہے۔ اس طرح انسان کا رشتہ خدا سے ٹوٹ کر خود پرستی پر مرکوز ہو گیا ہے۔ اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خواہ انسان مادیات میں کتنی ہی ترقی حاصل کیوں نہ کر لے لیکن جب تک اس کا دل خوفِ خدا اور یادِ الٰہی سے معمور نہیں ہوگا وہ اپنے مقصدِ اصلی تک نہیں پہنچ سکتا۔

تیسرے شعر کے متعلق سید وقار صاحب کہتے ہیں کہ اس میں بہ ظاہر تطہیر نفس کے ایک اخلاقی تصور کو پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ عفتِ نگاہ، شانِ فقر سے پیدا ہو سکتی ہے اور شانِ فقر، عشقِ رسولؐ پر موقوف ہے۔ ایک دوسری جگہ بھی وہ کہتے ہیں:

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقہ کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

سید وقار صاحب چوتھے شعر کو معنویت کے اعتبار سے دوسرے شعر سے ملاتے ہیں۔ اس شعر میں 'لالہ' کو مرکزیت حاصل ہے جو اقبال کے کلام میں پائی جانے والی اہم علامتوں میں سے ایک ہے۔ انھیں بعض مخصوص پھولوں یا مناظر خصوصاً لالہ میں وہ تمام خصوصیات نظر آتی ہیں جو اُن کی شاعرانہ شخصیت کا حصہ بھی ہیں اور مردِ مومن کے دل و جگر کی علامت بھی:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن

سید وقار صاحب نے چوتھے شعر میں لالہ، گندم اور جَو کے علامتی معنی بتائے ہیں اور کہتے ہیں کہ لالہ کے پھول کو 'فقر' اور 'بے نیازی' کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور لالہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے، یہ پھول جذبۂ عشق کی سرشاری کی ایک شبیہ ہے اور جہانِ گندم و جو، کنایہ ہے مادیات کی دنیا سے اور 'لالۂ دل سوز' کنایہ ہے، عشق و محبت کی دنیا سے۔ آخری شعر میں تلمیح کا بیان ہے۔ اقبال نے تلمیحات کے ذریعہ بڑی بڑی تفصیلی بحثوں کو اشاروں میں سمیٹ لیا ہے۔ تلمیحاتِ اقبال کا سرچشمہ زیادہ تر

قرآن، احادیث، تاریخ اسلام کے واقعات و کردار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد جگہ اقبال نے غزل کی مروجہ اور مشہور روایتی تلمیحات کو بھی اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ ان اشعار میں بھی فرسودگی کے بجائے تازگی اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ غزل کے اس شعر میں تاریخی شخصیات کے ساتھ اقبال نے لیلیٰ و مجنوں کی تاریخی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سلطان 'شہاب الدین غوری' جس نے ہندوستان کے آخری ہندو حکمراں پرتھوی راج کو شکست دے کر اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت قائم کر دی اور سلطان قطب الدین ایبک ہندوستان کا پہلا فرماں روا تھا جو نہایت شریف النفس، شجاع اور عادل سلطان گزرا ہے۔

سید وقار صاحب نے امیر خسرو کے تخلیقی کارناموں کی مختلف جہتوں سے نشان دہی کی ہے۔ اس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

> ''امیر خسرو سپاہی بھی تھے۔ اس طرح وہ ایک مکمل انسان کی علامت بن کر غزل کے آخری شعر میں نمودار ہوتے ہیں۔ مہ نو (جہدِ مسلسل) غنچہ اور آفتاب (تکمیلِ وجود)، دل اور نگاہ (تزکیۂ نفس) اور لالۂ دل سوز فقر اور حوصلہ مندی۔ غزل کی یہ ساری علامتیں نغمۂ خسرو کے دوام آشنا پیکر میں ایک وحدت اختیار کر گئی ہیں۔''[1]

۱۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۹۶

غزل:۱۱

اثر کرے نہ کرے، سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم، تیری لذتِ ایجاد!

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری، یہی ہے بادِ مراد؟

قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبال کی امتیازی خصوصیت ان کی فکر کے ساتھ ساتھ ان کا اندازِ بیان بھی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے عہد کے فنی طریقۂ کار کو اپنایا ہے بلکہ صناعی کے نئے اور اچھوتے طریقے بھی ایجاد کیے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان اور لب ولہجہ میں ان کے خطیبانہ انداز کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس کی مثالیں ان کے کلام میں جا بہ جا ملتی ہیں۔ خطابت کے ذریعہ اقبال نے اردو شاعری کو ایک خاص انداز بیان عطا کیا۔

'بالِ جبریل' کی متعدد نظموں اور غزلوں میں خطیبانہ انداز ملتا ہے اور ان میں بلند آہنگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی ایک اور غزل کا مطلع اسی کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے:

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

اقبال کے لہجے میں خطابت ایک خاص طرح کی بلند آہنگی، علویت اور طنزِ ملیح کی تہہ داری بھی رکھتی ہے، اس لیے ان کا خطابیہ اسلوب ان کے شاعرانہ طریقِ کار کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو:

اگر کج رو ہے انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

زیرِ نظر غزل کی ایک بہت بڑی صفت شوخی ہے۔ اقبال کی اردو کی عام غزلوں میں بھی ناز و نیاز کے بہت سے مسائل کا تذکرہ ملتا ہے لیکن اقبال ان مسائل کو شعریت کے جامے میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم اس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے عیب کو مستحسن خیال کرنے لگتے ہیں اور اس کی گستاخی کو شوخیِ ادا سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل کے تجزیہ نگار حامدی کاشمیری صاحب ہیں۔ حرفِ راز ''اقبال ایک مطالعہ'' اقبال کی شخصیت اور فن سے متعلق ان کی اہم تصنیف ہے، یہ تجزیہ بھی اسی کتاب میں شامل ہے۔ اس غزل کا نمایاں پہلو اس کا صوتی آہنگ ہے۔

تجزیے کی ابتدا میں انھوں نے غزل کی ہیئت پر روشنی ڈالی ہے اور لفظوں کی نشست اور آہنگ سے تحیر خیز ڈرامائی کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حامدی صاحب نے غزل کے پہلے شعر کو خالق و مخلوق کے مابین تکرار کہا ہے۔ اس شعر میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ اقبال اس شعر میں تسلیم و رضا کے پیکر کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔ دوسرے شعر کی فضا سے شعری کردار کی بے بسی و بے چارگی کا احساس ہوتا ہے۔ حامدی صاحب اس شعر سے متعلق کہتے ہیں کہ ''شعر میں بے رحم کائنات میں انسان کی پیدائش

اوراس کی تباہی کی ناگزیریت کواس کی مجروح انانیت کے مسئلے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔"[1] اس میں شاعر نے انسان کی قوتوں کو ناقص ومحدود کہا ہے اور دنیاوی مشکلات کو بہت وسیع۔ 'کرم یا ستم' میں شوخی کا رنگ غالب ہے۔

تیسرے شعر میں حامدی صاحب نے 'ہوا' کو تباہی کی علامت کہا ہے۔ 'خیمۂ گل' کے استعاراتی پیکر میں رنگ، نغمہ، حسن، شادابی، خلوت، تحفظ اور نمو کی آمیزش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں شاعر نے انسان کی ناپائیداری کو گلوں کے خیمے کے مشابہ کہا ہے اور شاعرانہ انداز میں انسانی زندگی کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چوتھے شعر میں شاعر کا بلند لہجہ عود کر آیا ہے جس میں طنز کی بھی کاٹ موجود ہے۔ اس میں شاعر نے مذہبی تلمیح کا استعمال کیا ہے جس میں آدم علیہ السلام کو نافرمانی کی بنا پر جنت سے نکلنا پڑا۔ شاعر کہتا ہے کہ فرشتے معصوم ہوتے ہوئے بھی تمہاری اس دنیا کو آباد کرنے کے اہل نہیں ہیں جب کہ میں نے تیری نافرمانی کی اور اس کی پاداش میں تم نے مجھے اس رنگ وبو میں بھیج دیا اور آج اس کی ساری رونقیں میرے ہی دم سے ہیں۔

آخری تین اشعار کو حامدی صاحب نے باہم مربوط کہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے خدا انسان فطرتاً خطر پسند ہے اس کے اندر قوتِ عشق کی کارفرمائی ہوتی ہے اس لیے وہ عافیت کوش نہیں ہوتا بلکہ وہ معراجِ کمال تک پہنچنا چاہتا ہے۔

چھٹے شعر کے متعلق حامدی صاحب کہتے ہیں کہ اس میں شعری کردار اپنی شخصیت کے مثبت پہلوؤں یعنی برتری اور انانیت کا اظہار کرتا ہے۔

آخری شعر میں شاعر نے اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر فخریہ انداز میں شاعرانہ گفتگو کی ہے کہ اے خدا صرف انسان کا دل ہی جذبۂ عشق سے سرشار ہے، فرشتے تیری ہمہ وقت عبادت تو کر سکتے ہیں لیکن تیری راہ میں قربان ہونے کا جذبہ صرف انسان کے اندر ہی موجود ہے اور فرشتے اس جذبہ سے عاری ہیں۔

۱۔ حرفِ زار۔ اقبال ایک مطالعہ، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۳ء، ص: ۱۰۱

تجزیے کے آخر میں حامدی صاحب نے مجموعی غزل پر تبصرہ کیا ہے اور اس غزل کو اردو کی غزلیہ روایت سے انحراف کی اچھی مثال کہا ہے اور غزل کی اہم خصوصیت یعنی اس کا خاص وصف نظمیہ آہنگ کو قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

''اس میں غزل کے روایتی اور فرسودہ الفاظ سے احتراز کر کے نظمیاتی الفاظ و تراکیب کو برتا گیا ہے، اور ان کے تلازمی امکانات کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ بندۂ آزاد، لذتِ ایجاد، خیمۂ گل، غریب الدیار، دشتِ سادہ اور گھات جیسے الفاظ اقبال کے لسانی شعور کی گہرائی اور جدیدیت کے مظہر ہیں۔''[1]

حامدی صاحب نے غزل کے لسانی وصوتی اور ہیئتی پہلوؤں کے پیش نظر غزل کی صحیح قرأت کو اہم قرار دیا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعرا کے برعکس زبان اور لہجہ اختیار کیا۔ اس لیے ان کی غزلوں میں تنوع و تاثیر، شیرینی و شائستگی نظر آتی ہے۔ نظموں کی طرح اقبال کی غزلیں بھی انسان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتی ہیں جب کہ ان کی شاعری میں بھی گل و بلبل، ساقی، مے خانہ، صیاد و غزال کا ذکر بدستور نظر آتا ہے لیکن انھوں نے ان کی معنویت میں وسعت پیدا کر دی ہے۔

۱۔ حرفِ زار۔ اقبال ایک مطالعہ، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ص:۱۰۳

اقبال کی اہم فارسی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ

علامہ اقبال اردو، فارسی، انگریزی وعربی کے شعروادب کے فکری اورفنی حقائق پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔اس کے علاوہ بھی بعض دیگر زبانوں مثلاً جرمن اوراطالوی سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔اردو کے بعد فارسی ان کے لیے ایک قدرتی اورموزوں ترین وسیلۂ اظہار بن گئی تھی اوراس زبان میں ان کی فکر کے دقیق ترین اجزاوجود پذیر ہوچکے تھے۔فارسی زبان اورشعروادب سے ان کے فکروتخیل کا جولافانی رشتہ تھا، وہ کسی اورزبان سے نہیں تھا۔وہ فارسی میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کرنے سے پہلے اردوشاعری میں نام پیدا کرچکے تھے اوران کی بعض مشہورنظموں کے ذریعہ انھیں برصغیر کے طول وعرض میں شہرت ومقبولیت حاصل ہوچکی تھی۔ بانگِ درا سے قبل علامہ اقبال کے فارسی کلام کے تین مجموعے منصۂ شہود پرآچکے تھے: اسرارِخودی (۱۹۱۵ء)، رموزِ بے خودی (۱۹۱۷ء) اور پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء)۔ بانگِ درا کی اشاعت (۱۹۲۴ء) کے زمانے میں بھی علامہ کی زیادہ توجہ فارسی شعرگوئی ہی کی طرف تھی۔انھوں نے بچپن میں عربی کے ساتھ ساتھ اپنے فاضل استاد شمس العلماء مولانا سید میرحسن سے فارسی زبان اس حدتک پڑھ لی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کے لب ولہجے میں رچ بس گئی۔ چوں کہ ۱۹۰۵ءتک اقبال کی شاعری روایتی نوعیت کی تھی، اس میں فکری عنصر بھی اس دور کے ہندوستان کے عمومی حالات کے ماتحت تھا۔اس لیے فارسی کی یہ پوری تربیت اورمشق، یورپ جانے سے قبل تک ان کی شاعری میں زیادہ ظہور پذیرنہیں ہوئی تھی۔قیامِ یورپ اور اس میں ان کے تحقیقی مطالعے کی گوناگوں جہتوں اورعالمی سطح پرمسلمانوں کے حالات کی پیچیدگی نے ان کے اندرایک فکری انقلاب برپا کردیااوریہیں سے ان کا بیشتر ذہن اورمزاج بھی فلسفیانہ بن گیااوران کی شاعری میں پیامی رنگ اُبھرنے لگااوراسی کے ساتھ ساتھ ان کی فارسی شاعری بھی وجود میں آگئی جواردوشاعری پر بھی اثرانداز ہونے لگی۔اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ یورپ میں اقبال کے کلام میں جواہم تبدیلیاں واقع ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے فارسی زبان کواپنے شعری اظہار کے لیے استعمال کیا

جس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ مسلمان ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عرب وایران اور روس وغیرہ کے بعض حصوں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کے خیالات کی ترجمانی کے لیے اردو زبان کافی نہیں، اور ان کے پیغام کی ضرورت ایشیا والوں کو ہی نہیں بلکہ دوسری قوموں کو بھی ہے۔ اس لیے قیامِ یورپ کے آخری زمانے اور وہاں سے واپسی کے بعد خاص طور سے انھوں نے فارسی زبان کو اپنے خیالات کا وسیلۂ اظہار بنایا۔ شیخ عبدالقادر نے 'بانگِ درا' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''فارسی میں کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی، اور میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب حالاتِ تصوف کے متعلق لکھنے کے لیے جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیر مذاق میں دخل ہوگا۔ اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعۂ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انھوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنا آسان نہیں، اس لیے وہ فارسی کی طرف مائل ہوگئے.....اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہوگیا۔''[1]

مزید کہتے ہیں کہ:

''فارسی گوئی کا ایک اثر اقبال کے اردو کلام پر یہ ہوا کہ جو نظمیں اردو میں دورِ سوم میں لکھی گئی ہیں، ان میں سے اکثر میں فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں پہلے سے بھی زیادہ ہیں، اور بعض جگہ فارسی اشعار پر تضمین کی گئی ہے۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشہبِ قلم جو فارسی کے میدان میں گامزن ہے، اس کی باگ کسی قدر تکلف کے ساتھ اردو کی طرف موڑی جارہی ہے۔''[2]

۱۔ کلیاتِ اقبال۔ مرتب: خواجہ حمید یزدانی، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۱ء، ص: ۳۳

۲۔ ایضاً۔ ص: ۲۴

حقیقت بھی ہے کہ اس دور کی شاعری میں فارسیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور ان کی اردو شاعری، فارسی کے مقابلے میں مدھم پڑ جاتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اسرارِ خودی، رموز بے خودی اور پیامِ مشرق جیسی کتابیں لکھیں۔ اس ضمن میں عبدالقادر کہتے ہیں:

''پیامِ مشرق میں ایک طویل نظم کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی متفرق نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ سب نظمیں بلند پایہ ہیں، پیامِ مشرق کے ذریعہ اقبال نے مغرب کے لیے مشرق کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ المانوی شاعر گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے جو مغربی دیوان کے نام سے شائع ہوا تھا۔ 'رموزِ بے خودی' میں ملت اسلامی کے ارکان سے بحث کی ہے لیکن اسرارِ خودی محکوم اقوام کے لیے بڑی اہم نظم ہے۔ بہ ظاہر یہ متصوفانہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ محکومی اقوام کی اصلاح ذہنیت کا بڑا آلہ ہے۔''[1]

اسی ضمن میں محمد طاہر فاروقی لکھتے ہیں:

''.....اقبال نے خودی کے فلسفہ کو جس قدر تفصیل سے اپنی فارسی تصنیفات میں بیان کیا ہے اردو میں اس کا عشر عشیر نہیں ہے۔ عرفانِ نفس اور احساسِ خودی کو اقبال نے مادّی و روحانی ترقیات کا اصل الاصول قرار دیا ہے اس لیے اس محور پر ہر شے گردش کرتی نظر آتی ہے۔''[2]

فارسی شعرا میں انھوں نے مولانا روم کو اپنا پیر و مرشد اور روحانی رہبر تسلیم کیا۔ ایک طرف 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی'، 'مثنوی معنوی' ہی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں تو دوسری طرف مولانا روم سے متاثر علامہ اقبال کی غزلوں کی زیادہ تعداد زبورِ عجم سے تعلق رکھتی ہے۔ مولانا روم کے بعد اقبال نے فارسی کے جن شعرا کو کم و بیش یکساں حد تک سراہا ہے، وہ مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا غالب اور حکیم سنائی غزنوی ہیں۔ فکری نشو و نما کے ارتقائی ادوار میں اقبال بیدلؔ سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے کہ ان کے خیال میں

۱۔ اقبال حیات اور شاعر۔ عبدالقادر سروری، مشمولہ آثار اقبال، مرتبہ غلام دستگیر رشید، ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد، دکن، ستمبر ۱۹۴۴ء، ص: ۱۴۳

۲۔ سیرت اقبال۔ محمد طاہر فاروقی، قومی کتب خانہ، لاہور، طبع سوم، ستمبر ۱۹۴۹ء، ص: ۱۶۸

بیدل ایک حرکت پسند شاعر تھے، اور ان کی شاعری انسانوں کو خود آگہی اور خود شناسی کی طرف مائل کرتی ہے۔ مرزا غالب اردو اور فارسی شاعری میں اقبال کے عظیم پیش رَو تھے۔ اقبال کو بیدل کی طرح غالب کی شاعری میں بھی خودی کے تصورات اور استحکامِ انا کی آرزو نظر آتی ہے۔ مولانا سنائی کے بعد اقبال کے نظامِ ترجیحات میں محمود شبستری اور حکیم خاقانی شروانی کا مقام ہے۔ ایرانی شعرا کے بعد اقبال نے برصغیر کے جن فارسی گو شعرا کو اہمیت دی ہے وہ حضرت امیر خسرو، عرفی، نظیری، صائب، ابو طالب کلیم اور ملاّ غنی کاشمیری ہیں۔ علامہ اقبال کا معیارِ شعر فکری اختلاف کے باوجود فارسی کے عظیم شاعر خواجہ حافظ کے معیار سے بہت قریب نظر آتا ہے اسی لیے حافظؔ اور نظیریؔ سے متاثر غزلیں بھی پیامِ مشرق میں نسبتاً زیادہ ہیں۔

اقبال کی فارسی غزل ان کی شخصیت اور فلسفہ وفن کی مکمل آئینہ دار ہے۔ عرفیؔ، حافظؔ، رومیؔ اور غالبؔ کی مشترک و مرکب میراث کے ساتھ ساتھ کافی مقدار میں ایسے اجزا بھی موجود ہیں جو محض اقبال ہی کی شناخت اور انہی سے مختص ہیں۔ ان کی فارسی غزلیں بہت زوردار اور فنی خوبیوں سے مزیّن ہیں۔ ان کے کثیر جہتی انداز اور فنی ہنرمندی نے سنجیدہ قاری کے ساتھ ساتھ نقد و انتقاد کے ماہرین کو اپنی طرف ہمیشہ متوجہ کیا ہے۔ علامہ کی فارسی شاعری کو اس لحاظ سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے نظامِ فکر کو اس شیریں زبان میں زیادہ مرتب، مبسوط اور جامع انداز میں پیش کیا ہے اور فن کے اعتبار سے بھی جو تنوع ان کے فارسی کلام میں نظر آتا ہے، اردو اس سے ایک حد تک محروم ہے۔ علامہ کا فارسی کلام نہ صرف ان کے فلسفۂ حیات کی مکمل تفسیر ہے، بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق کی بھی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ بین الاقوامی سطح پر علامہ کا تعارف ان کی فارسی شاعری ہی کے ذریعے ہوا ہے۔

ان کی اردو غزلوں کی طرح مختلف اساتذۂ فن نے ان کی بعض فارسی غزلوں کو بھی تجزیاتی عمل سے گزارا ہے۔ چنانچہ ان کی ایک غزل جو اس طرح سے ہے:

غزل:۱

نہ تو اندر حرم گنجی، نہ در بت خانہ می آئی
ولیکن سوے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

قدم بے باک تر نہہ در حریم جان مشتاقاں
تو صاحب خانۂ آخر چرا دزدانہ می آئی

بغارت می بری سرمایۂ تسبیح خواناں را
شبخونِ دل زناریاں ترکانہ می آئی

گہے صد لشکر انگیزی کہ خونِ دوستاں ریزی
گہے در انجمن باشیشہ و پیمانہ می آئی

تو بر نخل کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر شمع یتیمے صورتِ پروانہ می آئی

بیا اقبال جامی از خمستانِ خودی درکش
تو از میخانۂ مغرب ز خود بیگانہ می آئی

مذکورہ غزل اقبال کے تیسرے فارسی مجموعہ پیامِ مشرق میں شامل ہے۔ اس شعری مجموعے کو اقبال نے گوئٹے کے 'دیوانِ مغرب' سے متاثر ہو کر ترتیب دیا تھا۔ پیامِ مشرق چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں 'لالۂ طور' کے نام سے رباعیات ہیں۔ دوسرے حصے میں 'افکار' کے ذیل میں نظمیں لکھی ہیں۔ تیسرا حصہ 'مئے باقی' کے نام سے ہے جس میں غزلیات شامل ہیں۔ چوتھے اور آخری حصے میں 'نقشِ فرنگ' کا عنوان قائم کیا ہے جس میں وہ نظمیں شامل ہیں جن کا موضوع مغربی افکار و سیاست ہے۔

زیرِ مطالعہ غزل کے تجزیہ نگار اسلوب احمد انصاری ہیں۔ اس کا لہجہ خطیبانہ ہے جس میں شاعر براہِ راست مسلمانوں سے مخاطب ہے کہ انسان ہمیشہ تذبذب میں مبتلا رہتا ہے اور خدا کو زمین و آسمان میں تلاش کرتا ہے جب کہ خدا کا مسکن، خود انسان کا دل ہے یعنی اگر انسان اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو جان لے تو گویا وہ خدا کو پہچان لے گا۔ یہی حدیث ''من عرف نفسه فقد عرف ربه'''' کا مفہوم بھی ہے۔

تجزیے کی ابتدا میں اسلوب صاحب نے اقبال کی نظموں اور غزلوں کے موضوعات پر مختصراً اظہارِ خیال کیا ہے۔ پہلے شعر کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کے پہلے مصرعے میں لفظ 'تو' کا استعمال اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں خطاب براہِ راست ہستیِ مطلق سے ہے۔ 'مشتاقاں' کو معنی خیز اور کلیدی لفظ کہا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے سے اس حدیثِ قدسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص میری جانب ایک قدم بڑھتا ہے، تو میں اس کی طرف دس قدم آگے بڑھتا ہوں۔''

دوسرے شعر کو اسلوب صاحب موضوع کے اعتبار سے پہلے شعر کا اعادہ کہتے ہیں۔ تغزل کے اعتبار سے یہ بہترین شعر ہے۔ شاعر خدا تعالیٰ سے التجا کر رہا ہے کہ میرے دل میں تیری محبت کے سوا کچھ نہیں ہے اس لیے تو اس میں بغیر کسی کش مکش کے داخل ہو جا۔ معنوی اعتبار سے دونوں اشعار باہم مربوط ہیں۔

تیسرے شعر میں شاعر کہتا ہے اے خدا تو خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، سب کا سخت امتحان لینے والا ہے۔ اسلوب صاحب تیسرے اور چوتھے شعر کو بھی معنوی اعتبار سے باہم مربوط خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں ایک نوع کی جارحیت، تشدد اور سختی و درشتی کا عنصر موجود ہے اور خونِ داستاں ریزی سے ایک طرح کی جارحیت اور طنطنے کا اظہار ہو رہا ہے۔ پانچویں شعر میں قرآنی تلمیح کا حوالہ دیا ہے اس کے دونوں مصرعوں میں حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے کوہِ طور اور حضور پاک ﷺ کے معراج کے واقعے کو پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں مصرعوں کی کیفیت کو اسلوب صاحب نے 'ظہوریت' کا نام دیا ہے۔ اس سیاق و سباق میں مولانا رومی کی مثنوی معنوی کے یہ اشعار پیش کیے ہیں:

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق جاں طور آمد عاشقا

طور مست و خرد موسیٰ صاعقا

معراج کے واقعے کی طرف 'سورہ الاسرا' کی آیت کے ذریعے اشارہ کیا ہے۔ غزل میں پیش کردہ موضوعات کو اسلوب صاحب نے برطانوی شاعروں میں جان ڈن اور جارج ہربرٹ کے شعری موضوعات کے مماثل قرار دیا ہے۔ چھٹے شعر میں شاعر نے ان مسلمانوں پر لعنت و ملامت کی ہے جو یورپ جا کر اور اپنی خودی کو فراموش کر کے غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیتے ہیں۔ یہ مضمون اقبال کے یہاں مختلف طرح سے نظم ہوا ہے:

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے

تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ

اسلوب صاحب نے اقبال کی استعمال کردہ تصوف کی اصطلاحات کو میرؔ، دردؔ، فانیؔ اور اصغرؔ گونڈوی کی اصطلاحات سے کسی قدر مشابہ بتایا ہے۔

☆

غزل:۲

خاکیم و تند سیر مثال ستارہ ایم
در نیلگوں یمے بہ تلاشِ کنارہ ایم
بود و نبودِ ماست ز یک شعلۂ حیات
از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم
بانوریاں بگو کہ زعقلِ بلند دست
ما خالیاں بہ دوشِ ثریا سوارہ ایم
در عشق غنچہ ایم کہ لرزد زبادِ صبح
درکارِ زندگی صفت سنگِ خارا ایم
چشم آفریدہ ایم چو نرگس دریں چمن
رو بند برکشا کہ سراپا نظارہ ایم

مذکورہ غزل پیامِ مشرق میں شامل ہے۔ پانچ اشعار پر مشتمل اس غزل میں شاعر اقبال نے انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو آشکارا کیا ہے۔ اس میں شاعر نے فلسفہ وحدت الوجود پر روشنی ڈالی ہے۔ اسلوب صاحب نے پیامِ مشرق کی غزلیات پر حافظ شیرازی کے لہجے کی جھلک کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے اقبال کے کلام کے مرکزی محرک کو Humanism یعنی 'بشریت' کا نام دیا ہے۔ پہلے شعر کی وضاحت میں اسلوب صاحب نے انسان کے انفرادی وجود اور اس میں پوشیدہ صلاحیتوں اور امکانات کو واضح کیا ہے اور شاعر کے استعاراتی پیرایۂ بیان کی بھی وضاحت کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں 'یمے' کو ساقی نامہ کے اس شعر کے مثل کہا ہے:

دمادم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

شاعر کہتا ہے کہ ہمارا جسم خاکی ہے اس لیے ساکن ہے اور ہمارا خیال سیار ہے، لیکن خودی، ذاتِ خداوندی کا پرتو ہے اور ذاتِ مطلق غیر محدود، اس لیے وہ محدود ہونے کے باوجود بھی سیار ہے۔

دوسرے شعر کے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس میں شاعر نے خودی کی توانائیوں کو بڑے لطیف پیرایے میں بیان کیا ہے۔ اسلوب صاحب نے خودی کے مدارج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

تیسرے شعر کو اسلوب صاحب نے معنوی اعتبار سے پہلے شعر کے مماثل قرار دیا ہے اور شعر کی وضاحت میں برطانوی شاعر ورڈز ورتھ کے عقل و وجدان کی تراکیب کو پیش کیا ہے۔ شعر میں مستعمل 'دوشِ ثریا' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان، کائناتِ آب وگل سے ماورا ہو کر ان فضاؤں میں پرواز کر سکتا ہے، جہاں عقلِ فرومایہ کے پر جلتے ہیں۔ ضربِ کلیم کی نظم 'معراج' سے درج ذیل مصرعہ پیش کیا ہے:

ع ''نازک ہے مسلماں، ہدف اس کا ہے ثریا''

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کو عقل کی بدولت اشرف المخلوقات ہونے کا درجہ حاصل ہے اس لیے اسے فرشتوں پر بھی افضلیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس شعر کا خاص عنصر بلند آہنگی ہے۔

چوتھے شعر میں اسلوب صاحب نے غنچے کو لطیف ترین کیفیات کا خاص استعارہ کہا ہے۔ 'غنچہ' اور 'سنگِ خارہ' کے درمیان تضاد کی بھی وضاحت کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عاشق کا دل تو نازک ہوتا ہے لیکن جب وہ دنیاوی مشکلات سے سامنا کرتا ہے تو جفاکشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

پانچویں شعر کے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس میں شاعر نے انسان کی صلاحیتوں کا اعتراف و اعلان بڑے دل پذیر طریقے سے کیا ہے۔ شعر میں مستعمل 'چشم' کو اقبال اور ورڈز ورتھ کے نزدیک کلیدی سمبل کہا ہے۔ آخر میں اسلوب صاحب نے غزل پر اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''عالم آب وگل میں اسیر ہونے کے باوصف انسان اس سے ماورا ہونے کا خواہش مند ہی نہیں بلکہ اسے حاصل کرنے کا استحقاق بھی رکھتا ہے، اور جن متضاد عناصر کا امتزاج اس کے اندرون میں موجود ہے اس سے کام لے کر وہ زندگی کو اپنے بسر کرنے کے لائق بنا سکتا ہے۔''[1]

۱۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۴۶۷

غزل:۳

ایں جہاں چیست، صنم خانۂ پندارِ من است!
جلوۂ او گردِ دیدۂ بیدارِ من است

ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے اورا
حلقۂ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است!

ہستی و نیستی از دیدن و تادیدن من
چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است!

از فسوں کاریٔ دل سیر و سکوں، غیب و حضور!
ایں کہ غمّاز و کشائندہ اسرارِ من است

آں جہاں نے کہ در و کاشۂ را مے دروند
نور و نارش ہمہ از سبحہ و زنارِ من است

ساز تقدیرم و صدا نغمۂ پنہاں دارم
ہر کجا زخمۂ اندیشہ رسد تارِ من است

اے من از فیضِ تو پائندہ نشانِ تو کجاست؟
ایں دو گیتی اثرِ ماست، جہانِ تو کجاست؟

مذکورہ غزل ''زبورِ عجم'' سے ماخوذ ہے۔ 'زبورِ عجم' علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا چوتھا مجموعہ ہے جو پیامِ مشرق کے بعد ۱۹۲۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ 'پیامِ مشرق' مغربی طرز پر لکھی گئی لیکن زبورِ عجم کے بارے میں اقبال یہ اعلان کر چکے تھے کہ ''میرا یہ شعری مجموعہ اہلِ مشرق کے لیے ہے۔'' ''زبورِ عجم' غزل کا مجموعہ ہے،

البتہ اس کے آخری حصے میں 'گلشنِ راز جدید' اور 'بندگی نامہ' کے نام سے دو مختصر مثنویاں بھی شامل ہیں۔ اقبال نے اپنے اس شعری مجموعہ کے بارے میں خود اس طرح سے اظہارِ خیال کیا ہے:

اگر ہو ذوق تو فرصت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

عبدالشکور احسن اس مجموعے سے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''اس کتاب میں سوز و ساز کی ایک منفرد اور بے مثال کیفیت ہے۔ موسیقی کی جو فراوانی اور متنوع دل کشی اس مجموعہ میں ہے، شاعر کی کسی دوسری کتاب میں نہیں۔ اس کے جذب و مستی اور وفورِ شوق کی متلاطم کیفیت وجد آفرین نغموں میں جھلک رہی ہے۔ اس میں شاعر کے نالۂ نیم شب کا نیاز بھی ہے اور دل کی پوشیدہ بیتیاں بھی۔ اس کی اُمنگیں اور آرزوئیں بھی ہیں اور اس کی جستجوئیں بھی، اس کے جذبات و افکار نغمہ و آہنگ کے طوفان میں ڈھل کے نکلے ہیں۔''[1]

تغزل کے اعتبار سے اسلوب صاحب نے اقبال کی اس غزل کو غالب کے اندازِ تغزل سے مشابہ کہا ہے۔ پہلے شعر میں استفہامیہ لہجے کی طرف اشارہ کیا ہے، اور اس کی معنویت کو فلسفیانہ اصطلاح میں Solipsism کہا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اس 'جہانِ رنگ و بو' کی کیا حیثیت ہے؟ اس کا وجود میری دید پر موقوف ہے، ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اسلوب صاحب نے کائنات کے اس تصور کو فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کے تصور سے ملایا ہے اور ورڈز ورتھ کے چشم باطن کا وظیفہ قرار دیا ہے استعاراتی بیان کی وضاحت میں اسلوب صاحب نے غالبؔ کا یہ معروف مصرعہ نقل کیا ہے:

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ابھی

اسلوب صاحب نے 'صنم خانۂ پندار' کی ترکیب سے ایک نوع کی لسانی سوفسطائیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابدیت کے تصور کو انھوں نے انگریزی مابعد الطبیعاتی شاعر وانؔ کے اس قول سے بھی ثابت کیا ہے:

۱۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ عبدالشکور احسن، اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۱۱۔۱۱۲

''اس نے گزشتہ شب اسے ایک منزہ اور بیکراں روشنی کے چھلے کی مانند دیکھا۔''[1]

دوسرا شعر، پہلے شعر سے مربوط ہے اس میں شاعر کہتا ہے کہ کائنات میری حد نگاہ تک پھیلی ہوئی ہے یعنی جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے کائنات کا وجود اتنا ہی ہے۔ اسلوب صاحب نے اس خیال کو اقبال کا تصور Dynamic Monad کہا ہے۔

تیسرے شعر کو اسلوب صاحب نے ابتدائی دو اشعار کی حیرت انگیز توسیع کہا ہے۔ شاعر نے اس شعر میں زمان و مکاں کی اہمیت بتائی ہے کہ وہ محض میرے دیکھنے اور نہ دیکھنے پر موقوف ہے۔ اسلوب صاحب نے شعر میں موجود متضاد الفاظ کی بھی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً دیدن اور نادیدن، ہستی و نیستی وغیرہ۔

اسلوب صاحب نے پہلے شعر سے چوتھے شعر میں منطقی تسلسل کی طرف اشارہ کیا ہے اور چوتھے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ کائنات میں سکون و ثبات، حرکت وغیرہ سب دل کی کرشمہ سازی ہیں، خارجی کائنات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسلوب صاحب نے اس میں 'سیر و سکون' اور 'غیب و حضور' دونوں ترکیبوں کو استعاراتی کیفیت کا رمز کہا ہے۔

پانچویں شعر سے متعلق اسلوب صاحب کہتے ہیں کہ اس میں 'مزرع' کی تمثیل استعمال کی گئی ہے۔ اس شعر میں شاعر نے دنیا کو مکافاتِ عمل سے تعبیر کیا ہے، یعنی انسان اپنے اعمال کی بدولت ہی آخرت میں اپنے انجام کو پہنچے گا۔ نیک اعمال کی جزا جنت ہے اور اعمالِ بد کی سزا جہنم۔ اس سلسلے میں اسلوب صاحب نے رومی کے مکافاتِ عمل سے بھی استفادہ کیا ہے۔ 'سبحہ و زنار' کے استعارہ کو روحانی اور مذہبی زندگی اور تسلیم و انقیاد سے منسلک کیا ہے۔

چھٹے شعر میں اسلوب صاحب نے بنیادی پیکر موسیقی کے ساز کو متعین کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے کارناموں نے ہی تقدیر کو وجود بخشا اور کائنات کی تمام رونقیں میرے افکار کی ہی بدولت زندہ و پائندہ ہیں۔ ساتویں اور آخری شعر میں شاعر کہتا ہے کہ میری موت اور زیست خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسلوب صاحب نے آخری شعر کو پہلے شعر کی جانب مراجعت کہا ہے اور اس خیال کو ضربِ کلیم کی نظم ''لا الہ الا اللہ'' سے مشابہ کہا ہے۔ ☆

۱۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۴۸۰

اسلوب صاحب نے ایک غزل زبورِ عجم سے منتخب کی ہے جو اس طرح ہے:

غزل:۴

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست

گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیام خویش
گاہے درونِ سینۂ مرغان بہ ہاؤ ہوست

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما
چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست!

آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما
بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سوست

ہنگامہ بست از پئے دیدارِ خاکیے
نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست

پنہاں بہ ذرّہ ذرّہ و ناآشنا ہنوز
پیدا چو ماہتاب و باآغوش کاخ و کوست

در خاکدانِ ما گہر زندگی گم است
ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست؟

اس غزل میں شاعر کہتا ہے کہ ہم نے یعنی خدا کے بندوں نے اپنے خالق کو بھلا دیا ہے، اس کے حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ خدا ہمیں اپنا بنانا چاہتا ہے، پھر سے ہم پر اپنی رحمت اور کرم کرنا چاہتا ہے لیکن ہم اس کی طرف سے بے نیاز اور بے پرواہ ہو کر اپنی خواہشاتِ دنیوی کی تکمیل میں مصروف و مدہوشی کا شکار

ہیں۔ پوری کائنات خدائی ذات وصفات کی غمازی کررہی ہے، خواہ لالہ کی پتّی ہو یا پرندوں کی آہ وفغاں، خالق کے جلووں کی ہرطرف کارفرمائی ہے۔ نرگس کے پھول کو اقبال نے آنکھ کے علامتی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ نرگس میں بھی خدا کا جلوہ ہے اور وہ ہماری تمام حرکات وسکنات کو دیکھ رہا ہے۔ خدا کا مسکن انسان کا دل ہے لیکن انسان اپنی غفلت کے باعث اسے دیکھ نہیں پاتا، یعنی جب انسان اپنی خودی کو پہچان لے گا تب وہ خدا تک رسائی حاصل کرلے گا۔

اسلوب صاحب نے غزل کے اس تصور کو وحدت الوجود کی ایک معکوس شکل قرار دیا ہے۔ انھوں نے پہلے شعر کو غزل کی تھیم اور نیاز وآرزومندی کو حرکی صفات کہا ہے۔

اسلوب صاحب نے غزل میں تین اہم کردار متعین کیے ہیں: (۱) وجودِ مطلق (۲) انائے محدود (۳) مظاہر کی کائنات یا تعینات کی دنیا۔

اسلوب صاحب دوسرے شعر کی جانب رُخ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس میں وحدت الشہود کے عام نظریے کی تقلیب کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اسلوب صاحب نے فارسی شاعر سعدیؔ اور اردو کے شعرا مثلاً: دردؔ، غالبؔ اور اصغرؔ کے اس مدعے کو ظاہر کیا ہے:

> ''کائنات کی تخلیق کی غایت یہی ہے کہ ذاتِ خداوندی کے حسنِ مطلق کے ارتعاشات خود اپنے لیے مرکزِ نگاہ بنیں۔ چنانچہ غالب اس ضمن میں کہتے ہیں:
>
> دہر جز جلوہ، یکتائی معشوق نہیں
>
> ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں''[۱]

تیسرے شعر میں اسلوب صاحب مستعمل نرگس کو غیر معمولی استعارہ کہا ہے، اور اس کو حیرت اور خاموشی دونوں سے وابستہ کہا ہے۔ نرگس کی مناسبت سے اسلوب صاحب نے انگریزی شاعر ولیم بلیک اور غالبؔ دونوں کے یہاں آنکھ کی بصیرت اور ادراکِ حقیقت بتایا ہے۔ جمال سے مراد ظاہری حسن کو نہیں بتایا ہے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ انسانی وجود کا ہرطرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے عیسائی صوفیوں مثلاً وکٹرؔ اور ہیوگوؔ کے خیال کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ابتدائے آفرینش یعنی ہبوطِ آدم سے پہلے

۱۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۴۸۹

انسان کو تین طرح کی آنکھیں تفویض کی گئی تھیں: (۱) Eye of flash (۲) Eye of reason (۳) Eye of contemplation۔ اور یہاں نرگس سے مراد تیسری آنکھ کو بتایا ہے۔

چوتھے شعر میں اسلوب صاحب نے اس فاصلے اور فرق کو واضح کیا ہے جو عبد و معبود، خالق و مخلوق کے درمیان ہے۔ فراق کی اس کیفیت کو اسلوب صاحب نے بالِ جبریل کے اس شعر سے واضح کیا ہے:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اسلوب صاحب پانچویں شعر کی جانب توجہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ 'ہنگامہ بست' اشارہ ہے عملِ تخلیق کے پسِ پشت اہتمام و انصرام کی طرف اور 'ہنگامہ رنگ و بو' تکوینِ کائنات کے مشاہدے کی طرف۔ نظارہ اور ''پئے دیدارِ خاکئے'' کو کلیدی الفاظ کہا ہے اور بتایا ہے کہ کائنات کی ساری رونق انسان ہی کے دم سے ہے اور اس کائنات میں انسان کو مرکزی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس بات کو انھوں نے اقبال کی لالۂ صحرا کے اس شعر سے واضح کیا ہے:

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

اسلوب صاحب نے چھٹے شعر کو پانچویں شعر کی توسیع کہا ہے اور نظارے کو عملِ استغراق کے مرادف کہا ہے۔ ساتویں اور آخری شعر میں 'گہرِ زندگی' کو پوری غزل کا طلسم اور کو شعور و آگہی کے مرادف کہا ہے۔ شعور و آگہی کے ضمن میں کہتے ہیں کہ انگریزی شاعر ولیم بلیک نے اپنی ایک مختصر سی نظم The Fly میں شعور کے لیے Thought کا لفظ استعمال کیا ہے، اور Thought اور زندگی کو انھوں نے ہم معنی قرار دیا ہے، اور اقبال نے اسے 'گہرِ زندگی' سے تعبیر کیا ہے۔ 'خاکدانِ ما' سے مراد اسلوب صاحب نے انسان کا پیکر بتایا ہے۔ آخری شعر کے دوسرے مصرعے میں اسلوب صاحب نے استفہامیہ رنگ کی وضاحت کی ہے۔

اس کی صراحت میں اسلوب صاحب نے حدیثِ قدسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اقبال کی اس غزل کے لہجے کو غالبؔ کے لب و لہجے کی عکاس اور اس غزل کو بالِ جبریل اور زبورِ عجم کی دوسری نادر غزلوں کی طرح چونکا دینے والی کہا ہے۔ ☆

غزل:۵

می تراشد فکر ماہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

برسرِ بام آ نقاب از چہرہ لے ما کانہ کش
نیست در کوئی تو چوں من آرزومندے دگر

یکے غیرت میبرم از دیدۂ بینای خویش
از نگہ بافم بہ رخسار تو روبندے دگر

یک نگہ یک خندہ دزدیدہ یک تابندہ اشک
بہر پیمان محبت نیست سوگندے دگر

عشق را نازم کہ از بیتابی روز فراق
جان مارا بست با درد تو پیوندے دگر

تا شوی بیباک تر درنالہ ای مرغ بہار
آتشی گیر از حریم سینہ ام چندے دگر

چنگ تیمور کی شکست آہنگ تیموری بجاست
سر برون می آر داز ساز سمرقندے دگر

رہ مدہ در کعبہ ای پیر حرم اقبال را
برزمان در آستین دارد خداوندے دگر

زیڈ۔اے عثمانی صاحب نے پیامِ مشرق کی جس فارسی غزل پر طبع آزمائی کی ہے اس کا مطلع ہے:

می تراشد فکر ماہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

مذکورہ غزل آٹھ اشعار پر مشتمل ایک طویل غزل ہے۔اس میں بھی اقبال نے اپنی شوخ و بے باک فکر کو غزل کے قالب میں پیش کیا ہے۔عثمانی صاحب نے اقبال کی اس شوخی کو حافظ کے کلام سے مختص کیا ہے اور ردیف 'دگر' کو شوخی و نشاط کی فضا پیدا کرنے والا 'آلۂ کار' کہا ہے۔تمہید میں ہی انھوں نے اقبال کی اس غزل کو 'سکر' اور 'صحو' کی کیفیات کا حسین امتزاج کہا ہے۔پہلے شعر میں اقبال کی فکر عروج پر نظر آتی ہے۔عثمانی صاحب اس کو سورۂ رحمٰن کی آیت ''کل یومٍ ھو فی شان '' سے ملاتے ہیں اور اس ضمن میں انھوں نے رومی کی فکر ''ہر نفس نو می شود دنیا و ما'' اور حافظ شیرازی کی فکر:

مرا از تست ہر دم تازہ عشقی
ترا ہر ساعتی حسن دگر باد

سے استفادہ کیا ہے۔

پہلے شعر میں اقبال نے 'تصورِ عشق' کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔اس شعر کی وضاحت میں عثمانی صاحب نے اقبال کے نظامِ فکر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔تصورِ عشق کو انھوں نے اقبال کے مختلف اشعار کے ذریعے واضح کیا ہے۔

دوسرے شعر کے متعلق عثمانی صاحب کہتے ہیں کہ اس میں شاعر کی آرزومندی شدت اختیار کر کے بے باک و نشاط انگیز ہو جاتی ہے۔اس شعر میں انھوں نے ڈرامائی کیفیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ شدتِ تاثر کے لحاظ سے عثمانی صاحب خواجہ شیراز کو اقبال سے برتر خیال کرتے ہیں اور یہاں انھوں نے دونوں کے مابین اس فرق کو ان کے اشعار کے ذریعے واضح کیا ہے۔غزل کے تیسرے شعر کو انھوں نے غالبؔ اور اصغرؔ کے اشعار سے واضح کیا ہے اور فغانیؔ کے شعر کو اقبال کے مقابلے زیادہ بہتر قرار دیا ہے:

رُخ را نتواں دید جذبہ دیدن جان
خراب جلوہ آن صورتم کہ نتوان دید
(فغانی)

یکے غیرت میبرم از دیدۂ بینائی خویش
از نگہ بافم بہ رخسار تو رو بندے دگر
(اقبال)

حجاب دیدۂ ادراک شد شعاع جمال
بیاد خرگہ خورشید را منور کن
(خواجہ شیراز)

اس کی مزید وضاحت عثمانی صاحب نے اس طرح کی ہے:

''اقبال کے شعر میں وہ تب وتاب شوق نہیں جو خرگہ خورشید کو منور کردے، وہ حیرت نہیں جو وارفتگی میں بدل جائے..... بلکہ حیرت کی بجائے غیرت ہے، غیر...از دیدۂ بینای خویش۔ ''دیدہ بنیای خویش'' میں استبعاد اور طنز خاصا تیکھا ہے۔''[1]

عثمانی صاحب چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے میں تاکیدی زور بتاتے ہیں اور پانچویں شعر میں اخلاص وایقان کا لہجہ ظاہر کرتے ہیں۔ عشق، نازم، بیتابی، فراق، جان، بست اور پیوندی دگر میں تاکیدی زور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عشق کی صراحت میں فراق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ عثمانی صاحب تصورِ فراق کو اس پوری غزل میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں اور اس کو نظم 'ذوق وشوق' کے تصورِ فراق سے ملاتے ہیں۔

چھٹے شعر میں عثمانی صاحب مرغِ بہار کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ شعر کے موسیقی الفاظ کو اونچا لہجہ یعنی (Higy key) کہا ہے۔ عثمانی صاحب نے بے باک تر، آتشی گیر، سینہ ام اور چندے دگر میں تاکیدی زور کی طرف اشارہ کیا ہے اور ساتویں شعر کو اقبال کی علامت سازی کا گواہ قرار دیا ہے۔ شعر میں مستعمل سمرقند کی تاریخی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ غزل تنقید۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۵۴۶

عثمانی صاحب نے آخری شعر کے فکری پس منظر کو مطلع کے شعر سے ملایا ہے یعنی اس میں شاعر نے اسلام پر طنز کیا ہے جو محض نام کا ہی رہ گیا ہے اور جو عشق کے فقدان کے باعث بت کدۂ تصورات بن گیا ہے۔ اس شعر میں تجزیہ نگار نے تاکیدی زور کی وضاحت کی ہے۔

عثمانی صاحب نے جس طرح اردو غزل کا تجزیہ صراحت سے کیا ہے وہی انداز فارسی غزل کے تجزیے میں بھی نمایاں ہے۔ بیشتر مقامات پر انھوں نے اقبال کی فکر اور اشعار پر غالبؔ، خواجہ شیراز اور فغانیؔ کے اشعار کو ترجیح دی ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے پوری غزل میں اقبال کے فکری سرچشموں (خودی، عشق، فراق) کی بہ حسن وخوبی وضاحت بھی کی ہے اور بالعموم تحسین بھی۔

○

حاصلِ کلام (محاکمہ)

اقبال کا شمار ان اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے جن کی شہرت کا آغاز ان کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ خود ان کی زندگی میں ان کی حیات، شخصیت اور فکر وفن سے متعلق متعدد کتابیں اور دہائیوں مضامین وجود میں آچکے تھے اور ان کے انتقال (۱۹۳۸ء) کے بعد شروع میں تو ان کی حیات و شخصیت پر مضامین و مقالات لکھے گئے اور جب جذباتیت کا دور ختم ہوگیا تو شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فکر وفن پر بھی کثرت سے لکھا جانے لگا۔ آزادی کے بعد ان کے تعلق سے جو ادب وجود میں آیا اس میں شاعری، سوانح، فکر وفلسفہ، خطبات، تراجم، تشریحات اور تجزیے وغیرہ پر مبنی تحریریں شامل ہوگئیں۔ سوانح سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں تنقیدی نقطۂ نظر نسبتاً کم نیز حقائق کی پیش کش اور وضاحت زیادہ ہے۔ عبدالمجید سالک کی تصنیف 'ذکرِ اقبال' (۱۹۵۵ء) البتہ بہت اہم کتاب ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ مصنف کو اقبال کی صحبت سے براہِ راست استفادہ کا موقع ملا تھا۔ ان کو بہت سے ایسے حقائق وکوائف کا بھی علم تھا جو بعض دوسرے معاصر مصنّفین کو نہیں تھا، اس لیے معلوماتی نقطۂ نظر سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے بعد اقبال کی سوانح عمریوں میں سب سے ممتاز اور جامع کتاب ان کے صاحب زادے 'ڈاکٹر جاوید اقبال' کی 'زندہ رود' اوّل (۱۹۷۹ء)، دوم (۱۹۸۱ء)، سوم (۱۹۸۴ء) ہے۔ اس کتاب میں اقبال کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی علمی وادبی اور سیاسی فکر کا جائزہ بھی بہت اچھے ڈھنگ سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کی مدد سے اقبال کے ذہنی وفکری ارتقا کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے اور اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال کی شخصیت میں عظمت کے کیا کیا عناصر شامل تھے، توازن و اعتدال اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی حیات و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر محققین و ناقدین نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں فقیر سید وحیدالدین کی ''روزگارِ فقیر''، خالد نظیر صوفی کی ''اقبال درونِ خانہ''، نثار احمد قریشی کی ''علامہ اقبال''۔

صوفی تبسم کی نظر میں، سید عبداللہ کی ''مطالعۂ اقبال کے چند نئے رُخ'' اور جگن ناتھ آزاد کی ''محمد اقبال۔ ایک ادبی سوانح حیات'' بہت اہم ہیں۔

سوانح کے علاوہ اقبالیاتی ادب کا بیش تر حصہ ان کے فکر و فلسفے کی تشریح و توضیح سے متعلق ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی اقبال کا رجحان فلسفے کی طرف تھا، اسی وجہ سے انھوں نے فلسفہ میں ایم.اے کیا تھا۔ یورپ جانے کے بعد اس میں وسعت و تنوع پیدا ہوا اور وہاں سے واپسی کے بعد رفتہ رفتہ وہ مفکر اور فلسفی ہی بن گئے۔ انھوں نے مغرب اور مشرق دونوں مراکز کے علوم و ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور اپنی فکر کو توازن اور اعتدال سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر اور وہاں علمی و فکری نظریات و سرمایے سے یکساں طور پر کسبِ فیض کیا تھا۔ جس کے سبب ان کے فکر و فلسفہ میں توازن و اعتدال پیدا ہوا۔ ان کے فلسفے کا بنیادی محور 'خودی' ہے، ان کے تمام نظریات و تصورات کی عمارت اسی پر تعمیر ہوئی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر عشق، مردِ کامل، جہد و عمل، فقر و استغنا، وقت اور تقدیر وغیرہ کے تصورات، اسی کے گرد گھومتے ہیں اور ان سبھی تصورات کو 'خودی' کی مرکزیت کے حوالے سے ایک ارتقائی شکل میں بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دانش وروں اور ناقدوں نے مختلف طریقے سے اقبال کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں صلاح الدین احمد کی تصوراتِ اقبال، ممتاز حسین کی ادب اور شعور، عبدالحق کی فکر اقبال کی سرگذشت، سید ابوالحسن علی ندوی کی نقوشِ اقبال، نورالحسن نقوی کی اقبال شاعر و مفکر، خلیفہ عبدالحکیم کی فکر اقبال اور اسی طرح کی دوسری اہم کتابیں شامل ہیں۔

اقبال نے اپنے خیالات اور مذکورہ افکار و نظریات کو یوں ہی سادگی کے ساتھ نہیں پیش کر دیا بلکہ انھوں نے ہمہ جہت فنی تدابیر اختیار کیں۔ اس میں شعری وسائل کا بہت خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا۔ اقبال کے کلام میں شعری ہنرمندیاں جگہ جگہ اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل، منظر نگاری، پیکر تراشی اور ڈرامائی انداز کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ یہی نہیں بلکہ خطابت میں بھی انھوں نے اعلیٰ درجے کا شعری حسن پیدا کر دیا ہے۔ ان کے کلام میں استعمال شدہ شعری وسائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو فن پر زبردست قدرت حاصل تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال کی شاعری کی عظمت، ان کی فکر سے زیادہ ان کے کلام میں استعمال شدہ شعری وسائل یعنی فنی ہنرمندیوں کے سبب ہے۔

درج ذیل کتابیں اقبال کے فن سے متعلق بہت اہم ہیں جن کی مدد سے اقبال کی فن کاری کا سنجیدہ مطالعہ کیا گیا ہے مثلاً شعر اقبال (سید عابد علی عابد)، اقبال کا فن (مرتبہ گوپی چند نارنگ)، اقبال کا نظامِ فن (عبدالمغنی)، دانش ور اقبال (آل احمد سرور)، اقبال شاعر اور فلسفی (سید وقار عظیم)، اقبال بہ حیثیت شاعر (مرتبہ رفیع الدین ہاشمی) اور اقبال کا فن (مرتبہ امین اندرابی) وغیرہ۔

ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں نے اقبال کی ترقی پسندانہ شاعری کو مطالعہ کا موضوع بنایا تو اس میں ان کے مماثل نظریات کے ساتھ ساتھ فن اور متن پر بھی گفتگو کی۔ ان کی فکر سے قطعِ نظر کر کے یا اس کے ساتھ ہی ساتھ اقبال کی شاعری کے فنی مطالعہ اور جائزے پر کام کا آغاز ہوا۔ تقریباً اسی زمانے میں ان کے کلام کی بہتر تفہیم کے لیے شرح نگاری کا عمل وجود میں آیا۔ یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اردو شعرا پر لکھی گئی شرحوں میں تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ شرحیں غالبؔ اور اقبالؔ کی لکھی گئیں۔ ان کے علاوہ اردو کے بعض دیگر شعرا کے کلام کی بھی شرحیں لکھی گئی ہیں، مثلاً خواجہ محمد شفیع دہلوی نے خواجہ میر دردؔ، ضیاء احمد بدایونی نے کلامِ مومنؔ، یوسف سلیم چشتی نے غالبؔ اور اقبالؔ، مولانا غلام رسول مہر نے اقبال، ظہیر احمد صدیقی اور افتخار بیگم نے فانیؔ بدایونی کی شروح لکھی۔

عہدِ حاضر میں شمس الرحمٰن فاروقی نے غالبؔ اور میرؔ کے کلام کی شروح ''تفہیم غالب'' اور ''شعر شور انگیز'' لکھ کر شرح نویسی کا بہت وقیع اور قابلِ قدر معیار قائم کیا ہے۔ یوں تو اردو میں شرح نویسی کا سلسلہ مرزا غالب کے ہاتھوں خود اپنے کلام کی شرح سے شروع ہو گیا تھا نیز فارسی دواوین اور دیگر متون کی شروح سے روشنی حاصل کر کے اردو میں شرح نگاری پر خاص توجہ ہوئی اور مذکورہ بالا شروح وجود میں آئیں۔

اقبال کا کلام ابتدا سے ہی شرح و تفہیم اور ترجمہ کا موضوع بن گیا تھا، چنانچہ پروفیسر نکلسن کے انگریزی ترجمہ ''اسرارِ خودی'' مطبوعہ ۱۹۲۰ء سے اس سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کلامِ اقبال کے بنیادی شارحین پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا غلام رسول مہر اور دورِ جدید میں خواجہ حمید یزدانی شرحیاتِ اقبال میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

چشتی صاحب کلامِ اقبال کی شرح نگاری میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ فکری بلندی، علمی استعداد اور دانش ورانہ ذوق و شوق کے حامل، اقبال جیسے عظیم شاعر کی شرح نگاری کے پوری طرح اہل تھے۔

وہ کلامِ اقبال کے گہرے مطالعے اور اقبال سے ذاتی طور پر قرب و فیضان کے نتیجہ میں ان کے علم کی گہرائی و گیرائی، فکری بلندی، پیغام کی عظمت و آفاقیت اور فن کے رموز و نکات سے بے حد متاثر تھے۔ چشتی صاحب نے مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں کلامِ اقبال کی شرحوں، مضامین اور مقالات کی صورت میں گراں قدر اور بیش بہا خزانہ یادگار چھوڑا ہے۔ انھوں نے اقبال کے فکر و فن کا مختلف جہتوں سے مطالعہ کر کے اقبالیات کے بہت سے نئے گوشوں کو اُجاگر کیا اور اقبال کے فن کو ان کی فکر کے حوالے سے سمجھنے اور ان کا معیار متعین کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ موصوف نے اقبال سے متعلق اپنے وسیع مطالعہ، علمی بصیرت اور اقبال فہمی سے کام لیتے ہوئے اقبال کے اردو اور فارسی کے شعری مجموعوں کی مفصل اور جامع شرحیں لکھی ہیں۔ کلامِ اقبال کی یہ شرحیں ان کا بہت غیر معمولی کارنامہ ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر بھی فکری ہم آہنگی اور تفہیم اقبال کے اعتبار سے بہت بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شرح اسناد و اعتبار کے نقطۂ نظر سے اقبال کے تشریحی نظام میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مہر صاحب ایک نامور ادیب، بلند پایہ صحافی، محقق، مترجم اور شارح غالبؔ و اقبالؔ کی حیثیت سے اپنا خصوصی امتیاز رکھتے ہیں۔ موصوف ان خوش نصیب ہستیوں میں شامل ہیں جن کی صلاحیتوں کو صیقل کرنے میں علامہ اقبال نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ مہر صاحب کو اقبال کا ذاتی معاون ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، وہ ان کے سفر و حضر میں رفیق خاص رہتے تھے۔ موصوف کلامِ اقبال کے گرویدہ تھے، ان کا خیال تھا کہ ''ان کے کلام کی شرح کا حق وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اصل پیغام کی روح اور تعلیم کے مختلف گوشوں سے آگاہ ہو۔''[1] چنانچہ اپنی شرح میں مہر صاحب نے بہت احتیاط کے ساتھ تفہیمِ اقبال کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شرح نگاری کا مقصد اقبال کے فلسفیانہ افکار کی توضیح و تشریح اور مکمل کلام کا جائزہ لینا نہیں تھا بلکہ کلامِ اقبال کے مشکل و دقیق رموز کی عقدہ کشائی تھا۔ اسی لیے موصوف نے ان شروح میں دانش ورانہ شان اور ناقدانہ رنگ اختیار کرنے کے بجائے روحِ اقبال کی پیش کش اور تفہیم کی کوشش کو ہی مرکوز رکھا ہے۔

'ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی' نے بھی جامع انداز سادہ و صاف ستھرے طریقے پر کلامِ اقبال کی شرحیں لکھیں، اس میں شک نہیں کہ یہ اقبالیاتی ادب میں ایک اہم کام ہے۔ یزدانی صاحب کی خصوصیت یہ

۱۔ مطالب بانگِ درا۔ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع ششم، ۱۹۹۱ء، ص:۴

ہے کہ وہ پہلے اقبال کے اصل متن کو پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد اس کا مطلب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ محاسنِ کلام کی بھی نشان دہی کر دیتے ہیں، اس کے علاوہ بھی متعدد شارحین ہیں جنھوں نے اقبال کے پورے کلام کی تو نہیں، صرف ایک یا دو مجموعوں کی ہی شرحیں لکھی ہیں۔ مزید یہ کہ کلامِ اقبال کے فنی مطالعے کے تحت عابد علی عابد کی تلمیحاتِ اقبال اور اکبر حسین قریشی کی مطالعۂ تلمیحات و اشاراتِ اقبال اور نسیم امروہوی کی فرہنگِ اقبال بھی تفہیم اقبال کے سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

کلامِ اقبال سے متعلق متعدد شروح کے سامنے آجانے اور متعدد موضوعات پر اقبال سے متعلق دہائیوں کتابیں وجود پذیر ہو جانے کے بعد ۱۹۷۰ء کے آس پاس اقبال تنقید اور اقبال فہمی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور وہ ہے اقبال کی نظموں کا تجزیہ یا تجزیاتی مطالعہ۔ اس کا سب سے بڑا محرک تو نصاب کی نئی ضرورتیں تھیں جس کا سبب یہ تھا کہ ہند و پاک کی تمام دانش گاہوں اور ان کے ماتحت تعلیمی اداروں میں اقبال کی مشہور نظمیں تجزیہ کا موضوع بنائی گئیں۔ ان نظموں پر شروع میں تو مکتبی قسم کے تجزیے لکھے گئے، اس کے بعد مختلف اساتذۂ فن اور ناقدین نے اس سلسلے میں مزید غور و خوض کیا تو اچھے اور معیاری تجزیے وجود میں آنے لگے اور جلد ہی عالمانہ اور دانش ورانہ سطح پر کلامِ اقبال کے مختلف پہلوؤں کے مطالعے اور ان کی نظموں اور غزلوں کے تجزیوں پر مشتمل مقالات، مضامین کے مجموعے اور کچھ کتابیں شائع ہونے لگیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہ کہنے میں مبالغہ نہیں ہوگا کہ اردو میں فنی تجزیوں کا سلسلۂ کلامِ اقبال سے شروع ہو کر ہی دوسرے شعرا تک پہنچا اور پھیلا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اقبالیاتی تجزیے ہی اردو کے دوسرے شعرا اور تخلیق کاروں کی تخلیقات کے تجزیوں کی بنیاد بنے۔ کلامِ اقبال کے ان تجزیوں کے پیش نظر تجزیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینا اور تجزیہ نگاروں کے تنقیدی رویوں کی وضاحت کرنا، مطالعاتِ اقبال کا ایک اہم موضوع بن گیا۔ چنانچہ زیرِ نظر جائزے میں یہی کوشش کی گئی کہ اردو کے جن اہم اور ممتاز ناقدین اور اقبال شناسوں نے اقبال کی نظموں اور غزلوں کے تجزیے کیے ہیں ان کا مطالعہ کر کے تفہیم اقبال میں توسیع کے امکانات تلاش کیے جا سکتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جن معتبر نقادوں کے تجزیے، زیرِ نظر مقالے میں شامل کیے گئے ہیں انھوں نے اقبال شناسی کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ اب اقبال محض شاعر مشرق یا شاعر اسلام نہیں رہ گئے بلکہ ان تجزیہ نگاروں نے ثابت کر دیا ہے کہ اقبال کی عظمت کا راز ان کی فکر کے ساتھ ان کے

فنی کمالات کے اظہار میں زیادہ ہے اور یوں وہ فکروفن اور زبان و اسلوب میں ملٹن کے قریب تک جا پہنچے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ تجزیہ نگاری کے دور سے قبل اور اس دوران بھی جن اہم تصانیف نے تجزیہ نگاری میں خشت وسنگ کا کام کیا اور اس موضوع پر جو کتابیں وجود میں آئیں ان میں زیادہ اہم اور مشہور گیان چند جین کی ''اقبال کے اردو کلام کا عروضی مطالعہ''، سید معراج نیر کی ''اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ''، عبدالمغنی کی ''اقبال کا نظامِ فن''، ساحل احمد کی ''اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ''، گیان چند جین کی ''تجزیے'' ہیں۔ بعض تجزیہ نگاروں نے باقاعدہ طور پر کلامِ اقبال کے تجزیے کیے ہیں ان میں اسلوب احمد انصاری، رفیع الدین ہاشمی، آل احمد سرور، عبدالمغنی، سید ابوالحسن علی ندوی، نورالحسن نقوی، مسعود حسین خاں، سید محمد ہاشم وغیرہ کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔

تجزیہ، اس کے حدود اور دوسری تعبیری اصناف سے اس کے امتیازاتی جائزے میں سب سے پہلے فن تجزیہ کی ماہیت، اس کے اصول اور طریقِ کار واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر باقاعدہ اور مربوط طور پر غالباً پہلی بار اتنی تفصیلی اور مدلل گفتگو کی گئی ہے اور جو جو اصول ترتیب دیے ہیں وہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے اور امید ہے اس سے آئندہ تجزیہ کرنے والوں کو کچھ روشنی مل سکے گی۔

دوسرے باب میں ان نقادوں کے سوانحی حالات وکوائف، علمی وادبی کاوشوں اور اقبالیات کے ذیل میں ان کی خدمات اور تنقیدی رویوں سے بحث کی گئی ہے۔

مقالے کا کلیدی حصہ اس کا تیسرا اور چوتھا باب ہے، جس میں اقبال کی منتخب نظموں اور غزلوں کو تجزیہ نگاروں کی تنقیدی آرا کے حوالے سے تجزیاتی عمل سے گزارا ہے۔ ان نظموں میں مسجدِ قرطبہ، ذوق وشوق، خضرِ راہ، ساقی نامہ، شعاعِ امید اور جبریل وابلیس شامل ہیں۔ اسلوب احمد انصاری، رفیع الدین ہاشمی، آل احمد سرور، عبدالمغنی، نورالحسن نقوی، سید محمد ہاشم اور دیگر ناقدین نے یہ تجزیے بہت دقّتِ نظر سے کیے ہیں۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی ایک کتاب ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آئی، بعد میں اس کی توسیعی شکل ۱۹۹۴ء میں ''اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں'' کے نام سے

شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تسخیر فطرت، تنہائی، شمع و شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ، لا الٰہ الا اللہ، ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام، شعاعِ امید، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ جیسی طویل نظمیں اور دس غزلوں کے تجزیے بھی شامل ہیں۔ اس میں اسلوب صاحب نے تجزیوں کے سلسلے میں تفصیلی تنقید کا طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ زیرِ مطالعہ مقالے میں اسلوب صاحب کے تجزیاتی مطالعے کے تحت نظم ذوق و شوق، مسجدِ قرطبہ، خضرِ راہ، ساقی نامہ اور شعاعِ امید شامل ہیں۔ غزلوں میں پیامِ مشرق سے دو غزلیں، ایک بانگِ درا سے، دو زبورِ عجم سے، تین بالِ جبریل اور ایک غزل ضربِ کلیم سے شامل ہے۔

اسلوب صاحب نے اقبال کے تجزیوں میں سائنٹفک طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کی بہت سی نظموں اور غزلوں کے تجزیے کیے اور ان کے فکری و فنی امتیازات روشن کیے اور تاثراتی یا تصوراتی گفتگو کرنے کے بجائے متن کی مثالوں سے اقبال کی نظموں اور غزلوں کے امتیازات منکشف کیے۔ اقبال سے جذباتی تعلق کے باوجود، ان کے محاکے اور تعین قدر میں اسلوب صاحب کا رویہ تجزیاتی اور استدلالی ہوتا ہے۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ''اقبال کی طویل نظمیں'' تجزیاتی مطالعے کے اعتبار سے بہت اہم ہے، اس میں انھوں نے شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعری، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، ذوق و شوق، مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ اور ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کو تجزیاتی عمل سے گزارا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان کے تجزیے ذوق و شوق، خضرِ راہ، مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ شامل ہیں۔ یہ تجزیے اصولی ہیں یعنی انھوں نے ایک مرتب خاکے کی بنیاد پر ان نظموں کو تجزیے کے اصولوں کی روشنی میں پرکھا ہے۔ ان میں انھوں نے متعدد عنوانات قائم کیے ہیں مثلاً تعارف، پس منظر، شانِ نزول، فکری جائزہ، فنی تجزیہ، سوز و گداز، ایجاز و بلاغت، صنعت گری وغیرہ۔ ہاشمی صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اقبالیات اور اسلامیات دونوں سے گہرا تعلق ہے اس لیے انھوں نے اقبال کی نظموں کو اسلامی تناظر میں بھی پیش کیا اور فکر اقبال کے عملی پہلو کو اہمیت دی۔ موصوف نے اقبال کی ہر نظم کے تاریخی پس منظر کا جائزہ دقتِ نظر سے لیا ہے۔ موصوف نے اقبال کے کلام اور فکر کے دقیق نکات کو بڑے سہل اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے اندازِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اتنا عام فہم ہے کہ اوسط درجے کا قاری بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی نے اقبال شاعر و مفکر (۲۰۰۰ء) میں اقبال کی طویل نظموں کے چودہ اور مختصر نظموں کے آٹھ تجزیے شامل ہیں۔ ان میں اہم نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں: خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، سید کی لوحِ تربت، والدہ مرحومہ کی یاد میں، شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع و شاعر، جبریل و ابلیس، لینن خدا کی حضور میں، مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، ذوق و شوق، شعاعِ امید، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ وغیرہ۔ یہاں نقوی صاحب کے تجزیے ذوق و شوق، خضرِ راہ، جبریل و ابلیس، مسجدِ قرطبہ، شعاعِ امید اور ساقی نامہ زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان تجزیوں میں نقوی صاحب نے اقبال کے فن کی باریکیوں اور نزاکتوں کی تشریح و توضیح کی ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی نے اقبال کی نظموں کے تجزیاتی مطالعے میں فلسفیانہ مسائل میں الجھے بغیر اقبال کے افکار و خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ نظموں کے مطالعے کے دوران انھوں نے مختلف عنوانات کے تحت تجزیے کیے ہیں مثلاً پس منظر، تکنیک، شعری وسائل، فنی محاسن، اسلوب اور فنی آداب وغیرہ۔

کلیم الدین احمد کی سخت گیری اور شدت پسندی اور اپنے والد محترم کے علاوہ باقی سبھی شعرا کے بارے میں منفی رویہ زبان زد عام و خاص ہے۔ اقبال بھی ان کی نکتہ چینیوں کی زد میں خوب خوب آئے ان کی کتاب ''اقبال-ایک مطالعہ'' اسی اندازِ فکر و نظر کا کرشمہ ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کا اقبال سے تعلق جذباتیت سے لبریز ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' (۱۹۸۲ء) میں مغربی شعرا اور اقبال کے کلام کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب انھوں نے کلیم الدین احمد کی کتاب ''اقبال: ایک مطالعہ'' کے جواب میں تصنیف کی۔ عبدالمغنی صاحب نے اقبال پر کلیم الدین کے اعتراضات کا جواب بہت واضح اور مدلل انداز میں دیا ہے۔ انھوں نے اقبال کی شاعری میں ان کی فکر کے ساتھ فن کو بھی خاصی اہمیت دی ہے، لیکن جذباتیت کی رو میں معروضی انداز کے بجائے حمایت اور محاسن کا پہلو غالب ہے۔ اسی لیے ان کے تنقیدی تجزیوں کا انداز خالص فنی تجزیے کے مقابلے میں فکری جائزے کا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

اس میں انھوں نے ذوق و شوق، خضرِ راہ، مسجدِ قرطبہ، شعاعِ امید، ساقی نامہ جیسی نظموں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ عبدالمغنی کے تجزیے پڑھنے کے بعد یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اقبال سے ان کی حد سے

بڑھی ہوئی عقیدت کے سبب بالکل اسی طرح جس طرح کلیم الدین احمد کو صرف نقائص نظر آتے ہیں، عبدالمغنی صاحب کو اقبال کے کلام میں محاسن اور عظمت کے علاوہ کوئی اور چیز نظر ہی نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں تجزیاتی انداز سے زیادہ جذباتی انداز ملتا ہے اور یوں ان کے تجزیوں کا عمومی انداز فنی تجزیے کا نہیں بلکہ فکری جائزے کا ہو جاتا ہے۔

پروفیسر سید محمد ہاشم کی کتاب ''اقبال: فکر و فن'' میں جن نظموں کے تجزیے کیے گئے ہیں ان کے نام اس طرح ہیں:

سید کی لوحِ تربت، شکوہ و جوابِ شکوہ، مسجدِ قرطبہ، لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت، فرمانِ خدا فرشتوں سے، ذوق و شوق، جبریل و ابلیس، شعاعِ امید۔

زیرِ تحقیق مقالے میں ان کے تجزیے مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق، شعاعِ امید اور جبریل و ابلیس شامل ہیں۔ ان کے یہ تجزیے تنقیدی طریقِ کار کی دلیل ہیں۔ انھوں نے نظموں کی شانِ نزول اور تاریخی پس منظر کی وضاحت کے ساتھ اپنے تجزیوں کے ذریعے اقبال کے فکر و فن کے مخفی گوشوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر عابد علی عابد، غلام رسول ملک، عمیق حنفی، رحمٰن راہی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، حامدی کاشمیری، رفیع رؤف، سردار احمد، منظر اعجاز، شکیل الرحمٰن، ابوالکلام قاسمی، زیڈ۔ اے۔ عثمانی، سید وقار حسین، قاضی افضال حسین اور انور صدیقی وغیرہ نے بھی متفرق نظموں اور غزلوں کے تجزیے پیش کیے ہیں مگر چوں کہ ان حضرات نے تجزیوں پر مبنی اپنی کوئی کتاب شائع نہیں کی اس لیے ان حضرات کو محض جزوی طور پر علامہ اقبال کے تجزیہ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

آل احمد سرور نے اقبال کی اہم نظموں بالخصوص شعاعِ امید، خضرِ راہ اور جبریل و ابلیس کے عمدہ تجزیے پیش کیے۔ انھوں نے اقبالیاتی جائزوں میں فکری پہلو کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اگرچہ یہ تجزیے مختصراً اور سرسری انداز میں کیے گئے ہیں۔ سرور صاحب اقبال کے مطالعے و مشاہدے کی وسعت، ان کے انسان کی عظمت پر اصرار، خود آگہی اور خود اظہاری کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔

سید ابوالحسن علی ندوی اور بدیع الزماں نے اپنی تصانیف میں کلامِ اقبال کو قرآنی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ علی میاں ندوی نے اپنے تجزیوں ذوق وشوق، ساقی نامہ، طارق کی دعا اور مسجدِ قرطبہ میں اس عہد اور اس کے پس منظر کی وضاحت کی ہے جب کہ بدیع الزماں صاحب نے قرآن پاک اور احادیث نبویؐ کے حوالوں سے کلامِ اقبال کی تشریح، توضیح اور تفسیر پیش کی ہے۔ مسعود حسین خاں نے خضرِ راہ، مسجدِ قرطبہ، شعاعِ امید۔ عابد علی عابد نے شکوہ و جواب شکوہ اور ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ غلام رسول ملک نے ذوق وشوق، محاورہ مابین خدا اور انسان، بندگی نامہ۔ حامدی کاشمیری نے شعاعِ آفتاب، دعا اور عمیق حنفی نے مسجدِ قرطبہ کا طویل، فنی اور فکری تجزیہ کیا ہے اور اس موضوع پر بہت گہرا نقش چھوڑا ہے۔ رفیع رؤف نے لالۂ صحرا کا، قدوس جاوید نے ساقی نامہ اور حاتم رام پوری نے مسجدِ قرطبہ اور سید سراج الدین نے بھی مسجدِ قرطبہ کی تجزیاتی تحسین کی ہے۔ اس کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی نے ذوق وشوق، ڈاکٹر صدیق جاوید نے مسجدِ قرطبہ، ذوق وشوق، ملک حسن اختر نے خضرِ راہ، ساقی نامہ، وارث علوی نے جبریل و ابلیس، محمد افروز عالم نے شعاعِ امید اور محمد منصور عالم نے ساقی نامہ کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

ان تمام تجزیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہم اور ممتاز تجزیے وہی ہیں جو اقبال کے افکار و نظریات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان کی زبان و بیان، صنائع و بدائع، استعارات و علامات اور فنی تدابیر وغیرہ کی نشان دہی پر مبنی ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں اقبال کی نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں کے تجزیوں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے یعنی اقبال کی نظموں کی طرح ان کی غزلوں کے بھی تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی غزلوں کے تجزیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی زیرِ ادارت وزیرِ انتظام علی گڑھ سے نکلنے والا رسالہ ''نقد و نظر'' جو عرصہ ہوا بند ہو چکا ہے، وہ باقاعدہ اقبال کی غزلیات ہی کے جائزے پر مبنی مضامین اور تجزیے، ترجیحی طور پر شائع کرتا رہا۔ پروفیسر انصاری نے نہ صرف اقبال کے تجزیوں کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کی بلکہ خود بھی سب سے پہلے ''اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں'' کے نام سے اقبال کی نظموں اور غزلوں کے تجزیوں کو شامل کیا ہے۔ اس کے بعد اسلوب احمد انصاری نے ایک اور کتاب ''غزل تنقید'' دو جلدوں میں مرتب کر کے شائع کی جس کی دوسری جلد میں انھوں نے اپنے وہی تجزیے شامل کیے، جن کا ذکر

اُوپر آچکا ہے۔اس میں اسلوب صاحب کے علاوہ زیڈ۔اے۔عثمانی،سید وقار حسین، قاضی افضال حسین، اقبال احمد انصاری اور انور صدیقی کے تجزیے بھی شامل ہیں۔زیڈ۔اے۔عثمانی نے اردو غزلوں کے ساتھ فارسی غزلوں کو بھی تجزیاتی مطالعہ کے لیے منتخب کیا ہے۔اس کے علاوہ حامدی کاشمیری نے بھی اپنی کتاب ''حرفِ زار-اقبال ایک مطالعہ'' میں اقبال کی ایک غزل کا تجزیہ کیا ہے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ نظموں کی بہ نسبت اقبال کی غزلوں کے زیادہ تجزیے نہیں ہوئے ہیں اس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اقبال کو فطری طور پر غزل کے مقابلے میں نظم کا عظیم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔غرض یہ کہ اقبال کی نظموں اور غزلوں کے یہ تجزیے تفہیمِ اقبال میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

OOO

کتابیات

☆ اقبال کے شعری متون

☆ مآخذ اور مراجع

☆ رسائل و جرائد

☆ لغات (اردو، عربی، فارسی، انگریزی)

کتابیات

مصنف/مرتب	کتاب کا نام	مطبع/ناشر	سن اشاعت
علامہ اقبال	بانگِ درا	مشورہ بک ڈپو، دہلی	۱۹۶۰ء
علامہ اقبال	بانگِ درا	علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ	۱۹۷۵ء
علامہ اقبال	بالِ جبریل	علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ	۱۹۷۵ء
ڈاکٹر محمد اقبال	ضربِ کلیم مشمولہ کلیاتِ اقبال	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۶ء
علامہ اقبال	ارمغانِ حجاز (اردو) مشمولہ کلیاتِ اقبال	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۶ء
علامہ اقبال	پیامِ مشرق	کتب خانہ نذیریہ، دہلی	۱۹۷۱ء
علامہ اقبال	زبورِ عجم	کتب خاہ نذیریہ، دہلی	۱۹۷۱ء
علامہ اقبال	علم الاقتصاد	اقبال اکادمی، لاہور	۱۹۷۷ء
خواجہ عبدالحمید یزدانی	کلیاتِ اقبال مع فرہنگ	کتابی دنیا، دہلی	۲۰۰۱ء
آل احمد سرور	تنقید کیا ہے؟	مکتبۂ جامعہ، علی گڑھ	۱۹۵۹ء
آل احمد سرور	تنقیدی اشارے	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	۱۹۴۲ء
آل احمد سرور	خواب باقی ہیں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۱ء
آل احمد سرور	دانش ور اقبال	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۴ء
آل احمد سرور	نئے اور پرانے چراغ	ادارۂ فروغِ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۵ء
احمد ہمدانی	اقبال فکر و فن کے آئینے میں	اقبال اکادمی پاکستان، لاہور	۱۹۹۵ء

اسلوب احمد انصاری	ادب اور تنقید	سنگم پبلشرز، الٰہ آباد	۱۹۲۸ء
اسلوب احمد انصاری	اقبال: جدید تنقیدی تناظرات	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۵ء
اسلوب احمد انصاری	اقبال حرف و معنی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۸ء
اسلوب احمد انصاری	اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں	غالب اکیڈمی، نئی دہلی	۱۹۹۴ء
اسلوب احمد انصاری	اندازے	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۸ء
اسلوب احمد انصاری	آئینہ خانے میں	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۴ء
اسلوب احمد انصاری	تنقیدی تبصرے	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۴ء
اسلوب احمد انصاری	غزل تنقید	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ	نومبر ۲۰۰۲ء
اسلوب احمد انصاری	مطالعۂ اقبال کے چند پہلو	کاروانِ ادب، ملتان صدر	۱۹۸۶ء
اسلوب احمد انصاری	نقشِ اقبال	مکتبۂ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹ء
اصغر عباس (مرتب)	ارمغانِ سرور	انجمن ترقی اردو، نئی دہلی	۲۰۰۱ء
اکبر حسین قریشی	مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال	اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان	۱۹۸۶ء
الطاف حسین حالی	مقدمہ شعر و شاعری	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۸ء
امتیاز احمد	آل احمد سرور۔ شخصیت اور فن	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۷ء
بشیر احمد ڈار (مرتب)	انوار اقبال	اقبال اکادمی، کراچی	۱۹۶۷ء
جاوید اقبال	زندہ رود (حصہ اوّل)	شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۲ء
جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی مفکرین	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۷۵ء
جمیل جالبی (مرتب)	ایلیٹ کے مضامین	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۰ء
جمیل جالبی	ارسطو سے ایلیٹ تک	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۷ء
حامدی کاشمیری	اردو نظم کی دریافت	کمپیوٹرسٹی، سری نگر، کشمیر	اپریل ۲۰۰۴ء
حامدی کاشمیری	تعبیر و تنقید	نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۸۵ء
حامدی کاشمیری	حرفِ زار۔ اقبال ایک مطالعہ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	نومبر ۱۹۸۳ء

حسن رضوی	اقبال کے فکری آئینے	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۰ء
خلیفہ عبدالحکیم	فکر اقبال	بزمِ اقبال، لاہور طبع پنجم	۱۹۶۸ء
خواجہ حمید یزدانی	شرح بالِ جبریل	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۵ء
خواجہ حمید یزدانی	شرح پیامِ مشرق	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
خواجہ حمید یزدانی	شرح زبورِ عجم	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
خواجہ حمید یزدانی	شرح ضربِ کلیم	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
ڈاکٹر جمیل جالبی	میراجی۔ایک مطالعہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۱ء
ڈاکٹر خالد ندیم (مرتب)	ارمغانِ رفیع الدین ہاشمی	الفتح پبلی کیشنز، راول پنڈی	اوّل فروری ۲۰۱۳ء
ڈاکٹر عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقا	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۲ء
رفیع الدین ہاشمی (مرتب)	اقبال شناسی اور جنرل ریسرچ	بزمِ اقبال، لاہور	۱۹۸۹ء
رفیع الدین ہاشمی	اقبال کی طویل نظمیں (دوسرا ایڈیشن)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
رفیع الدین ہاشمی	اقبالیات تفہیم و تجزیہ	اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور	۲۰۰۴ء
رفیع الدین ہاشمی	تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ	اقبال اکادمی، پاکستان	۱۹۸۳ء
رفیع الدین ہاشمی	مکاتیب مشفق خواجہ۔ بنام رفیع الدین ہاشمی	ادارہ مطبوعاتِ سلیمانی اردو بازار، لاہور	فروری ۲۰۰۸ء
رفیع الدین ہاشمی	مولانا علی میاں بطور ترجمانِ اقبال	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	جنوری ۲۰۰۳ء
ساحل احمد	اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ	اردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد	۱۹۸۲ء
سفیر اختر (مرتب)	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ حیات و افکار کے چند پہلو	ادارۂ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد	۲۰۰۲ء
سنجیدہ خاتون	بیسویں صدی کے اردو مصنّفین	بھارت آفسیٹ، دہلی	۲۰۰۴ء
سید احمد قادری (مرتب)	پروفیسر عبدالمغنی، حیات و خدمات	مکتبہ غوثیہ، گیا، بہار	۲۰۰۵ء
سید عابد علی عابد	شعر اقبال	بزمِ اقبال، لاہور	۱۹۵۹ء

سید عبداللہ	ولی سے اقبال تک	ساقی بک ڈپو، دہلی	۲۰۰۳ء
سید عبداللہ	نقدِ میر	آئینۂ ادب، چوک مینار، لاہور	۱۹۵۸ء
سید محمد ہاشم (مرتب)	تحقیق وتدوین (جلد اوّل)	رعنا لیتھو پریس، لال مسجد روڈ، مراد آباد	۱۹۷۸ء
سید محمد ہاشم	اقبال فکر وفن	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۹ء
سید وقار عظیم	اقبال شاعر اور فلسفی	علی گڑھ بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ	۱۹۷۵ء
شارب ردولوی	جدید اردو تنقید۔ اصول ونظریات	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۲ء
شاہد ماہلی (مرتب)	پروفیسر اسلوب احمد انصاری: نقاد اور دانش ور	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	۲۰۰۸ء
شبلی نعمانی	شعر العجم (جلد چہارم)	دار المصنّفین شبلی اکادمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۷ء
شمس الرحمٰن فاروقی	اثبات ونفی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۶ء
شمس الرحمٰن فاروقی	تعبیر کی شرح	مکتبۂ جامعہ لمٹیڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ	۲۰۰۴ء
شمس الرحمٰن فاروقی	تفہیم غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	۱۹۸۹ء
شمس الرحمٰن فاروقی	درسِ اقبال	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۹۰ء
شمس الرحمٰن فاروقی	شعر، غیر شعر اور نثر	شب خون، کتاب گھر، الٰہ آباد	دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء
شمس الرحمٰن فاروقی	عروض، آہنگ اور بیان	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	جولائی ۲۰۰۴ء
شمس تبریز خاں	(مترجم) نقوشِ اقبال	مجلسِ نشریاتِ اسلام، لکھنؤ طبع دوم	۱۹۷۰ء
صدیق جاوید	بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ	یونیورسل بکس، لاہور	۱۹۸۷ء
طالب حسین سیال	دانش ور اقبال کے چند پہلو	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	۲۰۰۶ء
عابد علی عابد	اسلوب	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۶ء
عابد علی عابد	تلمیحاتِ اقبال	مطبوعات بزمِ اقبال، لاہور	۱۹۵۹ء
عابد علی عابد	نفائسِ اقبال	اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان	۱۹۹۰ء

عبدالسلام ندوی	اقبال کامل	معارف، اعظم گڑھ	طبع چہارم	۱۹۷۸ء
عبدالمجید سالک	ذکر اقبال	چمن بک ڈپو، دہلی		۱۹۵۵ء
عبدالمغنی	اقبال کا نظامِ فن	اقبال اکیڈمی، لاہور		۱۹۸۵ء
عبدالمغنی	اقبال کا نظریۂ خودی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی		۱۹۹۰ء
عبدالشکور احسن	اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ	اقبال اکادمی، پاکستان		۱۹۷۷ء
عبدالعزیز ساحر	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: سوانح اور کتابیات	پنجابی ادبی سنگت، اٹک		۲۰۰۵ء
عبدالقادر سروری	اقبال حیات اور شاعر	ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد، دکن		ستمبر ۱۹۴۴ء
عبدالمغنی	اسلوب تنقید	عاکف بک ڈپو		۱۹۸۹ء
عبدالمغنی	اقبال اور عالمی ادب	کریسٹ پبلی کیشنز، گیا، بہار		۱۹۸۲ء
عبدالمغنی	اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی		۱۹۹۱ء
عبدالمغنی	اقبال کا نظریۂ خودی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی		۱۹۹۰ء
عبدالمغنی	تشکیلِ جدید	شعبۂ انگریزی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ		۱۹۷۶ء
عبدالمغنی	تصورات	ادارہ فکر جدید، دہلی		۱۹۹۴ء
عبدالمغنی	نقطۂ نظر (تنقیدی مقالات کا مجموعہ)	کتاب منزل، پٹنہ		۱۹۶۵ء
فخر الاسلام اعظمی	اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ	شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ، یوپی		اگست ۲۰۰۶ء
فرمان فتح پوری	اقبال سب کے لیے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی		۲۰۰۰ء
فقیر سید وحید الدین	روزگارِ فقیر	فقیر سپننگ ملز لمٹیڈ، کراچی		۱۹۶۴ء
قاضی افضال حسین	(مدیر) تنقید (نمبر) ذوق وشوق	شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ		۲۰۰۸ء
قاضی افضال حسین	تحریر اساس تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ		۲۰۰۹ء
قاضی افضال حسین	(مرتب) نظموں کے تجزیے (مجموعۂ مقالات)	شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ		۲۰۰۹ء
قاضی جمال حسین	تنقید وتعبیر	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ		۱۹۷۷ء
کلیم الدین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر	ایوان اردو، پٹنہ-۴	بار سوم	۱۹۶۶ء

کلیم الدین احمد	اقبال ایک مطالعہ	کریسنٹ کوآپریٹو پبلشنگ سوسائٹی، گیا	۱۹۷۹ء
گوپی چند نارنگ	اقبال کا فن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۶۳ء
محمد سعود عالم قاسمی، ڈاکٹر (مرتب) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ افکار و آثار		الہدایۃ اسلامک ریسرچ سینٹر، جے پور	۲۰۰۰ء
محمد طاہر فاروقی	سیرت اقبال	قومی کتب خانہ، لاہور (طبع دوم)	ستمبر ۱۹۴۹ء
محمد منصور عالم	فروغِ اقبال	ممتاز احمد، پرنٹ آرٹس، بودھ گیا، بہار	جنوری ۲۰۰۸ء
محمد بدیع الزماں	اقبال کا پیغام نوجوانانِ اسلام کے نام	دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، یوپی	۱۹۹۶ء
محمد بدیع الزماں	رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی	دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، یوپی	۲۰۰۳ء
محمد بدیع الزماں	مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ	دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، یوپی	۲۰۰۲ء
محی الدین قادری زور	روحِ تنقید	مکتبہ متین الادب، لاہور	۱۹۵۵ء
مسعود حسین خاں	اقبال کی نظری و عملی شعریات	اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر	۱۹۸۷ء
مسعود حسین خاں	مقدمۂ تاریخ زبان اردو	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۷ء
مسعود حسین خاں	(مرتب) انتخاب کلامِ اقبال	سرسید بک ڈپو، جامعہ اردو، علی گڑھ	۱۹۹۵ء
ملک حسن اختر	اطرافِ اقبال	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۶ء
مہر الٰہی ندیم (مرتب)	خطباتِ رشید احمد صدیقی	لطیف الزماں خاں، مکتبۂ دانیال، کراچی	۱۹۹۱ء
نصیر احمد ناصر (ایم اے)	تاریخ جمالیات (جلد دوم)	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۳ء
نعیم احمد (مرتب)	علمِ شرح، تعبیر اور تدریس متن	شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۹۵ء
نورالحسن نقوی	اقبال شاعر و مفکر	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۰ء
نورالحسن نقوی	فلسفۂ جمال اور اردو شاعری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	س۔ن
نورالحسن نقوی	فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۱ء
وارث علوی	بورژوا ژی۔ بورژوا ژی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۹۹ء
وہاب اشرفی	تاریخ ادب اردو (حصہ دوم)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۰۷ء

یوسف حسین خاں	روحِ اقبال	غالب اکیڈمی، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
یوسف سلیم چشتی	ارمغانِ حجاز مع شرح	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۹۲ء
یوسف سلیم چشتی	بالِ جبریل مع شرح	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۹۸ء
یوسف سلیم چشتی	بانگِ درا مع شرح	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۹۱ء
یوسف سلیم چشتی	ضربِ کلیم مع شرح	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۹۲ء

○○○

رسائل و جرائد

اردو بک ریویو شمارہ:۱۳۱۔۱۳۲		ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۶ء
اردو بک ریویو		اپریل، مئی، جون ۲۰۰۹ء
اردو بک ریویو		اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء
اردو بک ریویو		جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۹ء
اردو بک ریویو		مارچ، اپریل، مئی ۲۰۰۶ء
اردو بک ریویو		مارچ۔اپریل ۲۰۰۶ء
اردو دنیا جلد:۸، شمارہ:۱۱	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نومبر ۲۰۰۶ء
اردو دنیا		مارچ ۲۰۱۰ء
اقبال ریویو جلد:۳	کراچی	اپریل۔جولائی ۱۹۶۲ء
اقبال ریویو	اقبال اکیڈمی، حیدرآباد	اپریل ۲۰۱۰ء
اقبال ریویو	اقبال اکیڈمی، حیدرآباد	اپریل ۲۰۱۰ء
اقبال ریویو		جولائی ۱۹۶۸ء
اقبالیات شمارہ:۲، جلد:۲۶	لاہور	جولائی۔ستمبر ۱۹۸۵ء
اقبالیات شمارہ:۴	سری نگر	اپریل ۱۹۸۸ء
اقبالیات شمارہ:۱۰	سری نگر	مارچ ۱۹۹۸ء
اقبالیات شمارہ:۴، جلد:۲۸	لاہور	جنوری۔مارچ ۱۹۸۸ء
اقبالیات	اقبال اکادمی، پاکستان	جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء
برگِ گل (بہارِ اقبال)	کراچی	۱۹۷۷ء

جامعہ		اکتوبر۔دسمبر	۲۰۰۵ء
شاعر ماہ نامہ	بمبئی	جنوری	۱۹۵۶ء
شاعر	بمبئی	نومبر	۲۰۰۶ء
غالب اقبال نمبر، جلد:۳، شمارہ:۱۰۔۱۱	کراچی		
فکر ونظر سرور نمبر		نومبر	۲۰۰۳ء
فکر ونظر		مارچ	۲۰۱۰ء
قومی زبان جلد:۷۶، شمارہ:۴		اپریل	۲۰۰۴ء
کتاب نما		مارچ	۲۰۱۰ء
معارف ضیاءالدین اصلاحی	دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	اکتوبر	۲۰۰۶ء
نقد ونظر جلد:۱۱، نمبر:۲	علی گڑھ		۱۹۸۹ء
نقد ونظر جلد:۴، نمبر:۲	علی گڑھ		۱۹۸۲ء
نقد ونظر جلد:۱۸، نمبر:۲	علی گڑھ		۱۹۸۶ء
نوائے وقت	لاہور	۲۲/جنوری	۱۹۹۹ء
نئی کتاب	شاہد علی خاں		
ہماری زبان ہفت روزہ، شمارہ:۱۴۔۱۵، جلد:۶۶	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	۸تا۲۱/اپریل	۲۰۰۷ء

○○○

لغات

۱۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اردو)

۲۔ اردو لغت

۳۔ المنجد (عربی)

۴۔ جامع اللغات

۵۔ شمس اللغات (فارسی)

۶۔ فرہنگ اقبال از نسیم امروہوی

۷۔ فرہنگ آصفیہ (اردو)

۸۔ فرہنگ آنندراج (فارسی)

۹۔ فرہنگ جامع فارسی

۱۰۔ لغات کشوری (فارسی)

۱۱۔ مصباح اللغات (عربی)

۱۲۔ نور اللغات (اردو)

English:

1. The Oxford English Dictionary (Second Edition) A-Bazouki
2. A Hand to Literature, 5th Edition by C.Hugh Halman & William Harmon New York, Macmillion Publishing Co. 1986.
3. Wikipedia, The Free Encyclopedia.

OOO